محترمہ سے مرحومہ تک

....اور زنجیر ٹوٹ گئی

بنتِ فخرِ ایشیاء بے نظیر بھٹو شہید کا ولولہ انگیز سفرِ حیات

ناقابلِ تردید حقائق • ہوشربا انکشافات • چشم کشا معلومات

محمد نواز کھرل

27 دسمبر 2009 محترمہ کے یوم شہادت پر، کتاب گھر کی ایک خصوصی کاوش

محترمہ سے مرحومہ تک

.....اور زنجیر ٹوٹ گئی

(ناقابل تردید حقائق ۔ ہوشربا انکشافات ۔ چشم کشا معلومات)

محمد نواز کھرل

علم و عرفان پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔ اُردو بازار لاہور

فون 7223584 موبائل 0300-4125230

نوٹ:

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق مصنف (محمد نواز کھرل) اور پبلشرز (علم و عرفان) محفوظ ہیں۔ ادارہ سیونتھ سکائی پبلی کیشنز نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
01	تقدیم	06
02	قاتل کون.....قاتل لیگ	08
03	محترمہ بے نظیر شہید کا خاندانی پس منظر	11
04	سارے ''بھٹوز'' کم عمری میں غیر فطری موت کا شکار کیوں ہوتے رہے	17
05	بے نظیر واقعی بے نظیر تھی (مختصر حالات زندگی)	29
06	بابا کی ''پنکی'' سے شہید بی بی تک	33
07	میری زندگی (محترمہ بے نظیر بھٹو کی کتاب ''دختر مشرق'' سے دلچسپ اقتباسات)	38
08	رمزی یوسف کو بھی مجھے قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا	55
09	بے نظیر بھٹو کامیاب ہونے کے بعد کیسا پاکستان چاہتی تھیں؟	68
10	بے نظیر کی شہید ذوالفقار علی بھٹو سے آخری ملاقات	73
11	شہید بے نظیر بھٹو بنام پاکستانی عوام	78
12	بے نظیر شہادت کے تابندہ نقوش	81
13	الوداع بینظیر	89
14	کچھ سوکھے ہوئے آنسو	92
15	یہ رستہ کسی پر بند نہیں	94
16	وہ وقت تو نہیں آیا	96
17	شہید بے نظیر بھٹو	97
18	بھٹو کی بیٹی بھی گئی!	100
19	الوداع گلاب پوش بی بی۔الوداع	103

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
20	شہید کو گلاب پسند ہیں، آؤ باغ کی حفاظت کریں!	105
21	بی بی ہم شرمندہ ہیں	107
22	الوداع	110
23	مٹھی بھر مٹی اور مٹھی بھر غم!!	113
24	بے نظیر حقیقی معنوں میں چاروں صوبوں کی زنجیر تھی	116
25	بینظیر کی سیاسی فہم و فراست......ایک زمانہ ان کا قائل تھا	119
26	کیا محترمہ بینظیر بھٹو کسی ناول کا موضوع بن سکتی ہیں؟	126
27	یہ کس کا لہو ہے؟ کون مرا؟ اے رہبر ملک و قوم بتا؟	129
28	مشرق کی بیٹی کی شہادت......ایک تجزیاتی جائزہ!	135
29	نیلے اور سبز رنگ کی دلدادہ شہزادی جنت سدھار گئی	138
30	بدل جاتی ہے، بدلتی نہیں تقدیر کبھی!	143
31	چار قبریں، ایک کہانی	145
32	قاتلوں کا انجام قریب ہے	148
33	ایک اور بھٹو	151
34	بھٹوز اور ”ہمارا ملک“	153
35	پنڈی کے رنگ نرالے ہیں کہ وہ ہر بار جمہوریت کا قتل کرتا آیا ہے	160
36	کہانی ختم	162
37	شہادت کا سرخ دوشالہ	164
38	آمریت کو للکارنے والی بینظیر آواز خاموش ہوگئی!	167

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
39	بھٹو خاندان، جہد مسلسل..... یہ گھرانا بار بار نشانہ کیوں بنتا ہے؟	171
40	روح کی آواز	176
41	دختر مشرق کا آخری سفر	179
42	بے نظیر بھٹو کی شہادت..... قاتلوں کا سراغ کیسے ملے گا؟	183
43	شواہد کہتے ہیں کہ کچھ چھپانے کی کوشش ہو رہی ہے	187
44	شہادت کی تحقیقات، مزید پیچیدگیاں	189
45	بے نظیر بھٹو کو کس نے اور کیوں قتل کیا؟	191
46	پاکستان سمیت مشرق وسطیٰ کی سرحدوں کو تبدیل کرنے کا نیا فارمولا	196
47	بینظیر کا قتل: پاکستان کے سیاسی مستقبل پر گہرے منفی اثرات مرتب ہوں گے	202
48	مستقبل کا دھندلا سا خاکہ	204
49	بے نظیر کی شہادت اور امریکہ کا خطرناک منصوبہ	207
50	امریکہ کی ریشہ دوانیاں	210
51	پاکستان کے جوہری اثاثوں پر بیرونی خطرات کے سائے	212
52	اب بچاؤ کا کوئی راستہ موجود نہیں!	215
53	تاریخ کی آخری وارننگ	218
54	بے نظیر کی شہادت اور ملکی سلامتی	221
55	بلاول بھٹو زرداری: مشاغل، تعلیم، اہداف	222
56	''جمہوریت بہترین انتقام ہے'' (بلاول بھٹو زرداری)	228
57	بلاول بھٹو زرداری کی ضرورت کیوں پڑی؟	231

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
58	جانشین	236
59	یہ چراغ کس نے بجھا دیا	238
60	ابہام	239
61	شہید عشق	240
62	ترے لہو کو سلام میرا	241
63	بے نظیر بھٹو شہید کے لیے	242
64	زندہ ہے	242
65	نذرِ بے نظیر	243
66	مرثیہ	244
67	ایسے بہنوں کو تو رخصت نہیں کرتے بھائی	245
68	بھٹو شہیدوں کی طرف سے نئے سال کا پیغام	246
69	مکالمہ	247
70	فاطمہ بھٹو کی خدمت میں	248
71	پیپلز پارٹی کے سرکردہ راہنماؤں کی خدمت میں	250

♥.....♥.....♥

تقدیم

صدر پرویز مشرف صاحب سنئے!

یہ بازی خون کی بازی ہے
یہ بازی تم ہی ہارو گے
ہر گھر سے بھٹو نکلے گا
تم کتنے بھٹو مارو گے

آج بھی بھٹو زندہ ہے
کل بھی بھٹو زندہ تھا

اسانوں کس مناؤنا ہے

اسیں نقطے ہاں حرف دے — اساڈا ہون لازم ہے
اساڈی مرگ دا ماتم — سے نے رون لازم ہے
اسیں پھلاں چ وسناں گے — اسیں خشبو دا گہنا ہے
اسیں تارے آں انبر دے — اسیں جگدے ای رہنا ہے
اسیں راتاں دا چانن ہاں — اسیں سورج سویرے دے
اسیں نے دان کرنا اے — اسیں دیوے ہتھرے دے
اسیں اکھر محبت دے — اسانوں کس مناؤنا ہے
اسیں نے آؤندیاں نسلاں چ — واپس پرت آونا ہے
اسانوں کس مناؤنا ہے؟ — اسانوں کس مناؤنا ہے؟

(مہینا وار ناگ مئی جنوری 2008ء)

صدر صاحب! یہ بات یاد رکھیے جب کوئی شخص (تاریخ کا نہیں) ادب کا موضوع بن جاتا ہے تو وہ کردار کبھی بھی پردہ فنا میں نہیں جاتا۔ حضرت امام حسین المناک شہادت کی وجہ سے زندہ ہیں۔ ان کی شہادت ادب میں مرثیہ کے رنگ میں آئی۔ پھر شہادت فلسفہ کا موضوع بنی۔ اعزہ

داری کی مجالس قائم کی جانے لگیں۔ آج امام عالی مقام لوگوں کے دلوں میں رس بس گئے ہیں۔ آج کوئی زیدی صفت شخص اس محبت کو دلوں سے کھرچنا چاہے۔ وہ تو خائب و خاسر رہے گا۔ حضرت امام ایک مقصد یعنی دین کی سربلندی کے لیے اپنی اور اپنے خاندان کی جانی قربانی دے کر ہمیشہ کی زندگی پا گئے ہیں اسی شہادت کا نام عبدیت ہے جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا۔ حضرت امام حسین اپنی شہادت سے مسلمانوں کو یہ پیغام دے گئے ہیں کہ حق کی خاطر جان دینا ہی ایک مسلمان کا شیوا ہے۔ بھٹو نے اسی پیغام پر چل کر جابر آمروں کو للکارا خواہ وہ کسی سپر طاقت کا صدر ہو یا پاکستان کی منتخب حکومت پر رات کے پردہ میں ماورائے آئین غاصبانہ قبضہ کرنے والا ہو۔ مردانہ وار للکارتے ہوئے درجہ شہادت کو پہنچ گئے۔ پھر بھٹو نے اس شہادت کا جس دلیری سے سامنا کیا۔ تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ بھٹو کی یہ شہادت عسکری آمریت کو دفن کرنے اور جمہوریت قائم کرنے کے لیے تھی۔ اب بھٹو کی شہادت محض تاریخ کا حصہ ہی نہیں بنے گی بلکہ مرثیہ نوحہ اور افسانے کا بھی موضوع بن کر ہمیشہ کے لیے جاوداں زندگی کا روپ اختیار کر جائے گی اب محترمہ بے نظیر کے یوم شہادت پر گھر گھر ماتمی مجالس قائم ہوں گی۔ بے نظیر ایک افسانوی کردار بنے گی۔ میں بھٹو کی شہادت کی روشنی میں عسکری آمریت کی دیواریں گرتی ہوئی دیکھ رہا ہوں۔ پاکستان میں حقیقی جمہوریت کی سحر طلوع ہوگی۔ پاکستان خوش حالی کی راہ پر گامزن ہوگا اور بھٹو خاندان ہی چاروں صوبوں کی زنجیر بنے گا۔ اے پاکستان کے رہنے والو! قائد جمہوریت بے نظیر بھٹو اپنے لہو کی سرخی سے تمہارے ہاتھوں جمہوریت کا علم دے کر اس دنیا سے سدھار گئی ہے۔ اس علم کو گرنے نہ دینا اور کبھی بھی عسکری آمریت کے سامنے سجدہ ریز نہ ہونا۔ آمریت کے سامنے سجدہ ریز ہونا انسانیت کی توہین ہے یہی بھٹو کی شہادت کا فلسفہ ہے اس میں پاکستان کی زندگی ہے۔

♥ ..... ♥ ..... ♥

قاتل کون؟

قابیل لیگ

قابیل لیگ حضرت قائداعظم محمد علی جناح کے دور میں ہی وجود میں آ گئی تھی جس کے اجزائے ترکیبی بیرونی سپر طاقت، مفاد پرست سیاسی ٹولہ اور جرنیل تھے۔ اس لیگ کی طاقت آغاز میں ہی اتنی بڑھ چکی تھی کہ قائداعظم کی میت جب زیارت سے کراچی پہنچی تو ایک ایمبولینس اتنی ناقص بھیجی کہ قائداعظم کی لاش ایمبولینس کی خرابی کی وجہ سے کئی گھنٹے دھوپ میں سڑک پر پڑی رہی۔ اس طرز عمل سے پاکستانیوں کو یہ سبق دینا تھا کہ یہ ہے وہ تمہارا قائد جس کی میت دھوپ میں سڑک پر پڑی ہوئی ہے اور یہ اپنی طاقت کا اظہار تھا۔ اب ان کے سامنے قائد ملت لیاقت علی خان تھے جو ان کے رستہ میں سد سکندری تھے۔ وہ امریکہ کی ڈیکٹیشن لینے کو تیار نہیں تھے اور جاگیرداری کا خاتمہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ قابیل لیگ نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کو 1951ء میں لیاقت باغ راولپنڈی میں ہمیشہ کے لیے سلا دیا۔ تفتیشی افسر نے خفیہ ہاتھوں کی نشان دہی کی تو ریکارڈ سمیت جہاز کے ساتھ اڑا دیا گیا۔ اب لیگ کا سربراہ غلام محمد اپنی اندرونی طاقت اور بیرونی مدد سے ملک پر قابض ہو گیا۔ اس نے کیا کیا گل کھلائے۔ وہ اب تاریخ پاکستان کا حصہ ہیں کس طرح اسمبلی کو تحلیل کیا اور کس طرح وزراء اعظم کو بدلا اور کس طرح اپنی ماورائے آئینی طاقت استعمال کرنے لگا اور یہی وہ دور ہے جب مشرقی پاکستان میں محرومی جنم لینے لگی۔ جب جسمانی اور ذہنی طور پر مفلوج ہو گیا تو مفلوج زدہ لاش ایوان صدر سے نکالی تو دوسرا قابیلی لیگ کا طاقت ور راہنما سکندر مرزا ایوان صدر میں داخل ہو گیا اس نے بھی وہی راستہ اختیار کیا۔ جس مقصد کے لیے بیرونی طاقت نے اس کو ایوان صدر میں داخل کیا۔ وہی اکھاڑ پچھاڑ، اس اکھاڑ پچھاڑ میں کئی غیر سیاسی مہرے سامنے آئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایوب خان فوج کا کمانڈر انچیف بھی ہے۔ وزارت دفاع کا عہدہ بھی سنبھالے ہوئے ہے اب قابیل لیگ کی طاقت کے سامنے سارے محب وطن خس و خاشاک کی طرح اڑ گئے۔ اگر مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ الیکشن جیتتا ہے تو اکثریتی پارٹی کو اقتدار منتقل نہیں کیا جاتا۔ آخر سکندر مرزا نے 1958ء میں جنرل الیکشن کا اعلان کیا تمام پارٹیاں انتخابات میں حصہ لینے کے لیے متحرک ہو گئیں۔ ایجنسیوں نے خفیہ اطلاعات دیں مشرقی پاکستان کی سیاسی پارٹیاں خصوصاً سہروردی کی پارٹی الیکشن میں اکثریتی پارٹی کے طور پر ابھرے گی۔ مشرقی پاکستان کے تمام سیاست دان متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مغربی پاکستان کے جاگیردار سیاست دان ان متوسط طبقے کے سیاست دانوں کے حوالے اقتدار دینے کو تیار نہ تھے۔ امریکی مشورہ سے جنرل ایوب خان نے مارشل لاء لگا دیا۔ انتخابات کا عمل منسوخ کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد سکندر مرزا کو چلتا کیا۔ اس مارشل لاء نے پاکستان کی سیاست کو قتل کر دیا۔ لہٰذا کے ذریعے تمام قومی راہنماؤں کو دس سال کے لیے سیاست میں حصہ لینے سے روک دیا گیا۔ گویا ایوب خان نے پاکستان کی سالمیت کی جڑ پر تیر رکھ دیا اور 1956ء کا آئین قتل کر دیا۔

محمد ایوب خان کے دور حکومت میں کشمیر لینے کا ایک سنہری موقع ملا وہ موقع 1962ء میں ملا تھا جب نیفا کے محاذ پر بھارت کی تمام فوج چینی فوج کے مقابل پر تھی اور کشمیر بالکل بھارتی فوجی دستوں سے خالی تھا۔ گویا چین نے پلیٹ میں رکھ کر کشمیر پاکستان کے حوالے کیا تھا لیکن امریکہ کے صدر کی دھمکی سے صدر محمد ایوب خان مرعوب ہو کر کشمیر پر قبضہ نہ کیا۔ یہ تھا کشمیر اور کشمیریوں کا سیاسی قتل پھر امریکی حکم سے پاکستان کے تین دریا بھارت کے ہاتھوں بیچ دیے تاکہ پاکستان جو ایک زرعی ملک ہے بنجر بن جائے یہ تھا پاکستان کا اقتصادی قتل۔ پھر 1965ء میں میدان میں جیتی ہوئی جنگ میز پر ہار دی۔ اور مسئلہ کشمیر سے دست برداری اختیار کر لی۔ محترمہ فاطمہ جناح کا قتل بھی قائد لیگ کا ایک خفیہ منصوبہ تھا جو اقتدار پر مضبوط گرفت رکھنے کے لیے پایہ تکمیل تک پہنچا۔ اسی دور میں مشرقی پاکستان میں علیحدگی کا تصور پھلنے پھولنے لگا اور مجیب الرحمان کے چھ نکات منصۂ شہود پر آئے اس تاریک دور میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ذوالفقار علی بھٹو کی شکل میں ایک نابغہ روزگار راہنما دیا۔ اس نے محمد ایوب خان کی عسکری آمریت کو للکارا۔ جب اس للکار کے سامنے بے بس ہو گیا تو اپنے ہی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بجائے قومی اسمبلی کے سپیکر کو حکومت حوالے کرنے کے جنرل یحییٰ خان کے سپرد کر دی۔ ساتھ اپنے ہی آئین کو منسوخ کر دیا گویا ایوب خان دو آئینوں کا قاتل ٹھہرا۔ اب پاکستان کی بھاگ ڈور دوسرے جنرل یحییٰ خان کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ اور امریکی منصوبہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تکمیل ہوتی ہے۔ 1971ء میں انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا جاتا ہے اور اپنے ہی ایل ایف او کے خلاف شیخ مجیب الرحمان کو چھ نکات پر الیکشن لڑنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ وہ چھ نکات کیا تھے پانچوں صوبوں کو خود مختار ریاستوں میں تبدیل کرنا پاکستان کے پانچ صوبے۔ صوبہ پنجاب، صوبہ سرحد، صوبہ بلوچستان، صوبہ سندھ اور صوبہ مشرقی پاکستان الگ الگ ریاستیں وجود میں آ جاتی ہیں۔ خفیہ رپورٹوں سے جائزہ لیا جانے لگا کہ کوئی پارٹی اتنی اکثریت حاصل نہیں کرے گی کہ وہ حکومت بنا سکے۔ لہٰذا سب پارٹیاں صدر کی محتاج ہوں گی۔ اپنی مرضی کی حکومت تشکیل دے لی جائے گی۔ اس سب کھیل کے پیچھے امریکہ کا ہاتھ تھا جو مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنا چاہتا تھا۔ انتخابات کا نتیجہ شیخ مجیب الرحمان کے حق میں نکلا۔ اس جرنیل نے مذاکرات کی بجائے بندوق کی نالی سے فیصلہ کرنے کی کوشش کی۔ آخر کار یہ جرنیل مشرقی پاکستان کو الگ کر کے چلا گیا۔ گویا آدھا پاکستان قتل کر دیا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا قتل ہو سکتا ہے۔ صرف مشرقی پاکستان الگ ہی نہیں ہوا تھا بلکہ 90 ہزار فوجی اور سویلین بھارت کی قید میں چلے گئے ابھی بھی قائد لیگ کا پیٹ نہیں بھرا۔ طوعاً و کرہاً باقی ماندہ پاکستان کی حکومت ذوالفقار علی بھٹو کے سپرد کی گئی۔ اس نابغہ نے منتشر اجزائے پاکستان کو یکجا کیا ایٹمی پروگرام دیا۔ 90 ہزار قیدی بھارت کی قید سے چھڑائے۔ پاکستان کا مفتوحہ علاقہ واپس لیا اقتصادی، انتظامی اصلاحات کیں۔ سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد کی اور پاکستان کا زخم خوردہ وقار دوبارہ بحال ہوا۔ اب قائد لیگ امریکی شہ پر متحرک ہوئی۔ جنرل ضیاء الحق نے رات کے اندھیرے میں منتخب وزیر اعظم کو گرفتار کیا اور جھوٹے مقدمہ میں 1979ء میں پھانسی پر چڑھا دیا اور قائد لیگ نے بھٹو کے خون سے پیاس بجھائی اور ضیاء الحق مارشل لاء کی چھتری کے نیچے دس گیارہ سال عوام کے سر پر سوار رہا جو بھٹو کا نام لیتا تھا۔ اس کو پندرہ کوڑے اور تین سال کی سزا دی جاتی تھی۔ بے نظیر اور نصرت بھٹو نے نظر بندی کی سزا کاٹی۔ جلاوطنی کی زندگی بسر کی بے نظیر کو سبق سکھانے کے لیے اس کے بھائی شاہنواز کو فرانس میں زہر دے کر ابدی نیند سلا دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی ان تمام خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے عسکری آمریت کو للکارتی رہی اور اپنے باپ کے مشن کو آگے بڑھاتی رہی۔ آخر کار ضیاء الحق اپنے ہی ظلم کی آگ

میں چل مرا۔ 1988ء میں انتخابات ہوئے۔ بے نظیر کو ایک منصوبے کے تحت اتنی ہی وفاقی نشستوں کا حقدار ٹھہرایا کہ وہ ایک طاقت ور راہنما کے طور پر ابھر نہ سکے۔ اس کے ساتھ ایک خاص منصوبے کے تحت بڑا صوبہ اس کے مخالف کو دے دیا تا کہ بے نظیر کی حکومت کو غیر مستحکم کرنا آسان ہو، بہر حال ان تاریک حالات میں بھی بے نظیر حکومت لینے کے لیے تیار ہو گئی۔ دراصل ان کا اقتدار محض دکھاوے کے لیے تھا۔ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے تھے۔ بہر حال بے نظیر صاحبہ نے اپنی ذہانت بروئے کار لا کر حکومت کرنا شروع کی۔ پنجاب کی حکومت کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھایا لیکن اس ہاتھ کو جھٹک دیا گیا۔ ابھی حکومت کے معاملات کو سمجھ ہی سکی تھیں کہ غلام اسحٰق نے اپنے پہلے ہی طے شدہ منصوبہ کے تحت بے نظیر کی حکومت کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد نواز شریف کی حکومت آئی۔ غلام اسحٰق نے اس کی حکومت کو 58/2/B کی تلوار سے قتل کر دیا۔ غلام اسحٰق قابیل لیگ کا دماغ تھا۔ پھر بے نظیر کی حکومت آئی۔ ایجنسیوں نے بڑی ہوشیاری اور چابک دستی سے فاروق لغاری کو صدر منتخب کرایا۔ آخر کار قابیل لیگ کے اشارہ پر اس نے بھی بے نظیر کی اسمبلی قتل کر دی۔ ساتھ کردار کشی کے لیے کرپشن کے مقدمات بنا دیے۔ نواز شریف دوبارہ وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر متمکن ہوئے۔ آخر کار پرویز مشرف نے رات کی تاریکی میں ایوان اقتدار پر قبضہ کر کے چلتا کیا۔ مختلف مواقع پر آئین میں ترامیم کر کے آئین کا حلیہ بگاڑا۔ بلوچستان کے مقبول راہنما اکبر بگٹی کو بم باری کا نشانہ بنا کر ابدی نیند سلا دیا۔ ایمرجنسی لگا کر ججز کو رخصت کیا۔ یہاں تک کہ ان کو گھروں میں بند رکھا ہوا ہے۔ فاٹا، سوات اور بلوچستان پر فوجی چڑھائی کی ہوئی۔ ابھی ان کا دور حکومت جاری ہے دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ اب رہا بے نظیر بھٹو کے قتل کا معاملہ۔ ہر بچہ جانتا ہے بے نظیر خود بھی نشان دہی کر گئی ہیں۔ قاتل ایوان اقتدار میں ہیں یونہی تفتیش کا ڈھونگ رچایا ہوا ہے۔ محترمہ بے نظیر چاروں صوبوں کی زنجیر تھی امریکی منصوبہ کے تحت وفاق کو کمزور کرنا مقصود تھا۔ اس وجہ سے اس زنجیر کا توڑنا ضروری تھا۔ سو وہ زنجیر ایک منصوبہ کے تحت توڑ دی گئی ہے یہ بھی خیال تھا کہ اس شہادت کے بعد سندھ میں علیحدگی کی تحریک چلے گی۔ حکومتی عہدے داروں خصوصاً پرویز الٰہی نے جلتی پر تیل بھی چھڑکا ہے لیکن تمام مزعومات اور خیالات کے برعکس بھٹو وفاق کی حفاظت کا بوجھ اپنے کندھوں پر لے کر میدان سیاست میں آ گئے ہیں اور قاتلوں کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا ہے اب میں بانگ دہل کہہ سکتا ہوں۔ بھٹو ہی وفاق کی علامت ہیں اور قابیل لیگ کے سامنے اپنا سینہ تان کر کھڑے ہو گئے ہیں اور وفاق کی خاطر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے اعلان کر رہے ہیں۔ اے پاکستان کے رہنے والو! بھٹو کے ہاتھ تھامو تا کہ دشمن پاکستان کی سالمیت کو نقصان نہ پہنچا سکے۔

♥.....♥.....♥

محترمہ بے نظیر شہید کا خاندانی پس منظر

محترمہ بے نظیر بھٹو کی جائے پیدائش لاڑکانہ ہے جو سندھ کے تقریباً وسط میں واقع ہے اور یہ شہر اپنی مٹی کی زرخیزی کی وجہ سے مقامی طور پر نخلستان بھی کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ اس وجہ سے بھی انفرادیت کا حامل ہے کہ یہاں پانچ ہزار سال پرانے وادی سندھ کی تہذیب کے دارالحکومت موہنجوڈارو کے آثار واقع ہیں۔ اس خطے میں 1920ء کی دہائی میں ''سرجان مارشل'' کی نگرانی میں آثار قدیمہ کی کھدائی کی گئی اور انھوں نے بلاشک و شبہ تعین کیا کہ یہ تہذیب تین ہزار سال قبل مسیح اور اگر زیادہ پرانی نہیں تو میسوپوٹیمیا، فارس اور مصر کے دور کی تھی۔ وادی سندھ کے لوگ فن زراعت سے آشنا تھے (جو کہ ان کا عام ذریعہ معاش تھا) اس کے علاوہ یہاں فنکار اور اعلیٰ درجے کے ماہر فنکار پائے جاتے تھے جن کی مصنوعات کی قدیم دنیا میں مانگ تھی۔ میسوپوٹیمیا اور دیگر دور دراز واقع خطوں میں اپنے ہم عصروں کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ انھوں نے تصویری الفاظ کی مدد سے انتہائی جدید فن تحریر ایجاد کیا۔ دراصل وہ پورے برصغیر میں شہر کا واحد منبع تھا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ جب میں بچی تھی تو میں سمجھتی تھی کہ شہر کا نام ''منجوڈیرو'' تھا جس کے معنی سندھی زبان میں میری جگہ کے ہیں میرے بھائیوں، بہن اور مجھے اس بات پر فخر تھا کہ ہم موہنجوڈارو کے سائے تلے پلے بڑھے اور دریائے سندھ کے کنارے پر زندگی گزاری جو کہ از منہ قدیم سے دھرتی کا روح رواں رہا ہے۔

سندھی عورتیں ابتداء ہی سے اپنی خوبصورتی اور دلکشی کی بناء پر نمایاں رہی ہیں۔ سکندر اعظم اور چنگیز خان دونوں ہی نے سندھی خواتین کی عظمت اور دلکشی کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس خطے کی اکثر لوک کہانیاں مضبوط نسوانی کرداروں پر بنائی گئی ہیں اور یہ کہانیاں سندھ کے مشہور صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے نغموں کی صورت میں کہی تھیں۔ ان کی ہیروئین اعلیٰ اقدار یعنی انصاف، تحمل، قربانی، پیار، عزت، عظمت، حب الوطنی اور جرأت کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ سسی پنوں کی لوک کہانی میں سسی کو صحراؤں اور بنجر پہاڑوں میں اپنے محبوب خاوند پنوں کی تلاش میں سرگرداں دکھایا گیا ہے جسے اس کے مغرور بھائیوں نے اغواء کرلیا تھا۔ اس نے انتہائی مساعد حالات اور خطرات کا مقابلہ کیا لیکن اس جدوجہد میں کبھی ہار نہیں مانی۔ اسی طرح لوک کہانی عمر ماروی کی ہیروئن ماروی جو ایک ایسی لڑکی تھی جس کا انتہائی شریف گھرانے سے تعلق تھا وہ طاقتور بادشاہ عمر کے حبس بے جا میں رہتے اس کے اکسانے اور دھمکانے کے باوجود اپنی قوت ارادی اور یقین کے بل پر اپنی اقدار پر قائم رہی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے مادر وطن کی تقریباً تمام لوک کہانیوں میں عورت کو اعلیٰ معاشرتی اقدار برقرار رکھنے کے لیے اکثر انتہائی نامساعد حالات اور ظلم کا سامنا کرنا پڑا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کے آباؤ اجداد راجپوت تھے۔ ایک ایسا جنگجو قبیلہ جو پورے برصغیر میں پھیلا ہوا تھا۔ قبول اسلام کے بعد انھوں نے اپنی وفادار خدمات اسلام کے لیے وقف کردیں اور مسلم فوج کا حصہ بن گئے۔ سترھویں صدی میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے بھٹو قبیلہ کے سردار کو

''خان'' کے اعزاز سے نوازا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اسی بھٹو قبیلے کے سردار کے گھرانے کی براہ راست وارث ہیں۔ صوبہ سندھ کی بہت سی زمین، ان کے گھرانے کی ملکیت تھی اور انھیں خطے میں کھیت مزدوروں کا سب سے بڑا آجر سمجھا جاتا تھا۔ سندھ کے دیگر بڑے جاگیرداروں کی طرح ان کی زمین بھی ایکڑوں کی بجائے میلوں پر محیط تھی۔ وہ بہت سی فصلیں اگاتے تھے جس میں کپاس، گندم، گنا، دالیں اور انواع واقسام کے پھل اور سبزیاں شامل تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھٹو خاندان نے امتیازی کردار کے ساتھ ایک منفرد طرز زندگی اپنایا۔ یہ امن پسند لوگ تھے مگر اپنی ملکیت اور غیرت کے خلاف ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ سندھ میں ''کلہوڑا'' حکمرانی کے دور 1740ء تا 1786ء میں حکمران خاندان کے ایک قبیلے نے بھٹو قبیلے کی زرخیز زرعی زمینوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ بھٹو قبیلے نے یہ کارروائی برداشت نہیں کی اور چھن جانے والا علاقہ واپس لینے تک بھرپور جنگ لڑی اور علاقے میں اپنی طاقت اور اختیار دوبارہ قائم کیا۔ عزت، غیرت اور جائیداد پر کسی بھی حملے کو برداشت نہ کرنا بھٹو قبیلے کا آئندہ نسلوں میں بھی طرہ امتیاز رہا۔ بھٹو خاندان کے اس مخصوص تشخص کی ایک اور نمایاں مثال انیسویں صدی میں ملتی ہے۔ سندھ کی برطانوی راج میں شمولیت کے بعد 1843ء میں ایک برطانوی خاتون اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے پردادا میر غلام مرتضیٰ بھٹو ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ ایک سفید فام عورت کا کسی مقامی کے ساتھ میل جول علاقے کے برطانوی حاکم ''کلکٹر مے ہیو'' کے لیے ناقابل برداشت تھا اس نے بھٹو کو بلایا اور تنبیہ کی۔

بات چیت گرما گرم بحث میں بدل گئی اور جوش میں آ کر کلکٹر نے بھٹو کو چھڑی مارنے کی کوشش کی۔ بھٹو نے چھڑی چھین کر الٹا کلکٹر کو ضرب لگا دی۔ کلکٹر مے ہیو اس بے عزتی کو برداشت نہ کر سکا اور میر غلام مرتضیٰ بھٹو کو متعدد جعلی مقدمات میں ناجائز طور پر ملوث کر دیا۔ بھٹو کے دوستوں اور عزیزوں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ انتظامیہ کے انتقام سے بچنے کے لیے لاڑکانہ چھوڑ دیں۔ لہٰذا وہ بہاولپور کی خودمختار ریاست میں چلے گئے جہاں وہ آگے سلطنت افغانستان چلے گئے اور وہاں ایران کا شاہی مہمان کی حیثیت سے استقبال کیا گیا۔

ان کی غیر موجودگی میں گورے کلکٹر نے مرتضیٰ کے بوڑھے والدین سردار خدا بخش بھٹو کو نشانہ بنایا۔ ایک شام جب سردار خدا بخش بھٹو نزدیکی ضلع جیکب آباد میں اپنی زرعی اراضی کے معائنے کے بعد گھر واپس آ رہے تھے کہ پولیس کے بھیجے ہوئے جرائم پیشہ افراد نے ان پر حملہ کر دیا۔ بوڑھا سردار زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وقوعہ کے کچھ دیر بعد وفات پا گیا۔ اس المناک واقعہ کے چند ہفتے بعد گورے کلکٹر نے بھٹو خاندان کے بیش قیمت جواہرات وخاندانی نوادرات سونے سے مرصع زینیں اور قیمتی بندوقیں اور دیگر انمول اثاثوں کو ضبط کرنے کا حکم جاری کر دیا۔

اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے اپنے مخالف کی رہائش گاہیں و مہمان خانے اور گوداموں کو نذر آتش کرنے کا حکم دے دیا تھا کہ ان میں موجود ہر چیز بشمول انمول خاندانی فرنیچر، ایرانی غالیچے اور اجناس تک جل جائیں۔ مرتضیٰ کے آٹھ سالہ بیٹے شاہنواز بھٹو نے بعد ازاں اپنی غیر مطبوعہ یادداشتوں میں اس دردناک واقعہ کا ذکر کیا۔ رات کو ہم نے آگ کے شعلے اٹھتے دیکھے اور صبح ہر طرف راکھ ہی راکھ تھی۔ پولیس نے اس نوعمر بچے اس کی بوڑھی دادی اس کی والدہ اور اس کے بھائی کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے پرآسائش گھر سے صرف تین کپڑوں میں نکل جائیں۔ اس گھرانے کو

اپنے زیر سایہ کام کرنے والے محنت کشوں کے ہاں پناہ لینا پڑی۔

جب اس اندھے انتقام اور سرکاری انتظامیہ کو استعمال کرتے ہوئے ذاتی معاملات طے کرنے کی رپورٹ کراچی میں برطانوی اعلیٰ حکام تک پہنچی تو انھوں نے اس کا سختی سے نوٹس لیا۔ سندھ میں اس وقت اعلیٰ ترین برطانوی افسر کمشنر سر جیمز ایون تھے جو خود مختار حیثیت کے مالک تھے۔ انھوں نے ایک غیر جانبدار انکوائری کا حکم صادر کیا تا کہ حقائق کا تعین کیا جا سکے جب تحقیقات سے ثابت ہو گیا کہ کلکٹر انتہائی سنگین غلطی کا مرتکب ہوا ہے تو کمشنر نے بھٹو خاندان کی ضبط شدہ جائیداد واپس کرنے کا حکم جاری کیا اور اپنی انتظامیہ کی جانب سے بھٹو خاندان سے معافی مانگی۔

میر مرتضیٰ بھٹو جب اپنے گھر واپس لوٹے تو ان کا استقبال والہانہ انداز میں کیا گیا پُر جوش بھٹو نے اپنے حامیوں سے خطاب کرتے ہوئے کھلے بندوں اعلان کیا کہ وہ ان کے خلاف جھوٹی گواہی دینے والوں سمیت کسی سے بھی کوئی مخاصمت نہیں رکھتے۔ انھوں نے کہا کہ اپنی جائے پیدائش پر لوٹنے، اپنے بچوں میں رہنے اور اپنے دوستوں اور لوگوں کے ساتھ رہنے سے بڑھ کر دنیا میں کوئی خوشی نہیں تاہم وہ اس کے بعد اپنے بچوں اور دوستوں میں محض ایک ماہ تک زندہ رہ سکے اور علاقے کے چند ایسے بااثر جاگیرداروں کے کارندوں نے انھیں زہر دے کر مار ڈالا جنھوں نے کلکٹر کو خوش کرنے کے لیے مرتضیٰ بھٹو کے خلاف گواہی دی تھی اور بھٹو کے ممکنہ انتقام سے خائف تھے۔ اس سانحے کے وقت محترمہ بے نظیر بھٹو کے دادا سر شاہنواز بھٹو محض دس سال کے تھے۔ وہ تین مارچ 1885ء کو ضلع لاڑکانہ کے قصبے گڑھی خدا بخش میں پیدا ہوئے۔ سب سے بڑا بیٹا ہونے کے ناطے روایات کے مطابق انھیں اپنے والد کی وفات کے بعد خاندان کا سربراہ نامزد کیا گیا۔ اپنے مرحوم والد کا مرتبہ اور جائیداد کے ساتھ انھیں اپنے والد کی دشمنیاں بھی وراثت میں ملیں۔ علاقہ کے کچھ بااثر زمیندار جن کے تعلقات ان کے والد سے کچھ بہتر نہ رہے تھے وہ بھی سر شاہنواز بھٹو اور ان کے خاندان کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے تاہم نئے کلکٹر مسٹر میول نے اس نو عمر لڑکے اور اس کے خاندان کی بہبود اور دیکھ بھال کا خود ذمہ لے لیا۔

جب انھوں نے لاڑکانہ کے مقامی سکول سے ابتدائی تعلیم مکمل کر لی تو مزید تعلیم کے لیے کراچی میں کسی اچھے تعلیمی ادارے کی تلاش شروع ہوئی اور آخر کار 12 نومبر 1906ء کو انھیں سندھ مدرستہ الاسلام میں داخل کرایا گیا۔ نو عمر شاہنواز کی قابلیت اور اطوار نے گورے پرنسپل تھامس ہنری وائن کو اس درجہ متاثر کیا کہ اس نے انھیں اپنی سرکاری رہائش گاہ میں ساتھ رہنے کی پیش کش کر دی جہاں پر زیریں منزل میں انھیں دو کشادہ کمرے مہیا کیے گئے۔ سر شاہنواز بھٹو مسٹر وائن اور ان کی زوجہ کا شمار ان مہربان لوگوں میں کرتے ہیں جن کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ رہیں۔ سندھ مدرستہ الاسلام میں انھوں نے ہاکی کھیلنا شروع کی۔ سکول کی زندگی نے ان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ کئی عشروں کے بعد سر شاہنواز بھٹو ایک جگہ تحریر کرتے ہیں۔ میں اب بھی اس شاندار درسگاہ میں گزارے انتہائی خوشگوار لمحات کو یاد کر کے خوش ہوتا ہوں۔

قبل اس کہ شاہنواز بھٹو اپنی تعلیم مکمل کرتے قسمت نے ایک اور چال چلی دسمبر 1908ء میں جب وہ گھر پر چھٹیاں منا رہے تھے تو انھیں اپنے چچا اور سرپرست الٰہی بخش بھٹو کی ناگہانی رحلت کی اطلاع ملی۔ لہٰذا اب انھیں نہ صرف اپنے گھرانے کے سربراہ کی ذمہ داری سنبھالنا تھی بلکہ اپنے مرحوم چچا کے گھرانے کی سرپرستی بھی کرنا تھی۔ چند ماہ بعد مارچ 1909ء میں جب وہ اکیس سال کے ہوئے تو ان کے والد کی جاگیر کا انتظام ان کے سپرد کر دیا گیا جو قبل ازیں ان کے بچپن میں کورٹ آف وارڈز کے حوالے کی گئی تھی۔

یہ وہ وقت تھا جب انھوں نے متحرک عوامی زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا اور سیاست میں بھٹو خاندان کے رہنما کی حیثیت سے ابھرے۔ انھوں نے سیاست میں اپنے لیے چند بنیادی اور اہم اصول وضع کیے جن کی انھوں نے تمام عمر مذہبی انداز میں پابندی کی بلکہ آئندہ نسل کے لیے یہ رہنما اصول سیاسی میراث کی شکل میں چھوڑے۔ میری خدمات صبح سے رات گئے تک عام آدمی کے لیے وقف تھیں۔ سرشاہنواز بھٹو نے اپنی غیر مطبوعہ یادداشتوں میں تحریر کیا میں نے بلا کسی غرض وغایت گڑھی خدا بخش بھٹو میں ایک ڈیرہ چلایا اور جو لوگ بھی میرے پاس آئے میں نے ان کی مدد کرنے کی کوشش کی میں نے کوشش کی کہ انھیں اچھے مشورے دوں۔ میں عام آدمیوں سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا اور شاید ہی کبھی میں نے غصے کا اظہار کیا ہو۔ میں نے عوام میں گھل مل جانے اور ان سے بے تکلف ہونے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ دراصل خطے میں سرشاہنواز بھٹو وہ پہلے سیاسی رہنما تھے جنھوں نے سیاست میں عوامی سوچ اپنائی۔ ان سے پیشتر جاگیردار طبقہ اشرافیہ میں ڈرائنگ روم سیاست مستعمل تھی۔

اکتوبر 1913ء میں سندھ کی مسلم آبادی کے قائدین اور سندھی وڈیروں نے سندھی مسلمانوں کے مفاد میں پہلی مرتبہ اجتماعی سیاسی قدم اٹھایا۔ انھوں نے حیدرآباد میں ایک اجلاس بلایا جس میں صوبے بھر سے مسلم آبد کے معزز قائدین شریک ہوئے۔ شاہنواز بھٹو کا ان کی ذہانت ان کے سماجی مقام اور ہندو بنیئے کے ہاتھوں مسلم آبادی کے استحصال کے خلاف ان کے واضح موقف کی وجہ انتہائی احترام کیا جاتا تھا۔ انہی اجلاس کے دوران وہ سندھی مسلمانوں کے متفقہ قائد کی حیثیت سے ابھرے یہی وجہ ہے کہ 1919ء میں محض اکتیس سال کی عمر میں جب انھوں نے دلی کی امپیریل لیجسلیٹو میں سندھی زمینداروں اور جاگیرداروں کے لیے مختص واحد نشست کا انتخاب لڑا اور آسانی سے جیت لیا۔ یہ انتہائی اہم کامیابی تھی کیونکہ برطانوی ہند میں یہ کونسل اعلیٰ قانون ساز ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ دہلی آنے کے بعد انھوں نے اپنی توجہ اور توانائیاں سندھ کو بمبئی صوبے سے علیحدہ کرنے اور کراچی کی ترقی پر مرکوز کر دیں۔

وہ دلی پہنچنے کے بعد اپنے ابتدائی تاثرات اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''دلی آتے ہوئے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں کونسل کو کسی طور مجبور کروں کہ وہ کراچی کی ترقی کیلیے زیادہ توجہ دے۔ مجھے یقین تھا کہ کراچی کی ترقی کے ثمرات اندرون سندھ تک ضرور پہنچیں گے۔ لہٰذا میں نے کراچی پر توجہ دینے کا فیصلہ کیا۔ میں جب بھی دوسری جگہوں پر گیا اور خاص طور پر بمبئی، تو میں کراچی کو بہتر بنانے کیلیے معلومات لیں۔ بمبئی بہت بڑا شہر تھا مگر میں اسے کراچی کے ایک رقیب کی حیثیت میں دیکھتا تھا۔''

1920ء کا سال سرشاہنواز بھٹو اور پورے ہندوستان کے لیے انتہائی برس ثابت ہوا۔ برطانوی سرکار نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء کی صورت میں مشہور زمانہ Montague-Chelmsfort Reforms متعارف کروائے جن کے تحت برطانوی ہند کی مقننہ میں ہندوستانی نمائندوں کی تعداد بڑھا دی گئی۔ اس طرح دیگر تیرہ مسلمان نمائندوں اور سندھ سے تین غیر مسلم نمائندوں سمیت، سرشاہنواز بھٹو بمبئی کی مقننہ کے ممبر منتخب ہوئے بمبئی پہنچنے پر انھیں کونسل میں مسلمانوں کا قائد منتخب کیا گیا اور یہ مقام 1936ء میں سندھ سے بمبئی کی علیحدگی تک برقرار رہا۔

اسی سال اپنے آبائی ضلع لاڑکانہ میں انھیں مقامی بورڈ کا صدر چن لیا گیا اور یہ عہدہ 1934ء تک ان کے پاس رہا۔ انھوں نے بورڈ کے معاملات انتہائی مستعدی سے چلائے۔ تین مرتبہ سندھ کے وزیراعلیٰ رہنے والے محمد ایوب کھوڑو، جو بعد ازاں سرشاہنواز بھٹو کے سیاسی حریف بھی

رہے، نے سرشاہنواز بھٹو کے لوکل بورڈ میں گزارے وقت کے بارے میں یہ تاثرات بیان کیے۔

''یہ بہت کامیاب منتظم تھے اور یہی وجہ ہے کہ ضلعی لوکل بورڈ لاڑکانہ یا مقامی ضلعی بورڈ لاڑکانہ کا انتظام ان کے دور میں بہترین طریقے سے چلایا گیا۔ انھوں نے انتہائی تکریم پائی حتیٰ کہ برطانوی امپیریل سروس کے ضلعی افسران بھی اکثر سرشاہنواز بھٹو سے ملاقات کے لیے آتے حالانکہ قبل ازیں سندھ کے مقامی ضلعی بورڈ کے کسی صدر سے انھوں نے کبھی ایسی ملاقاتیں نہیں کی تھیں۔''

سرشاہنواز بھٹو کو 1925ء میں سندھ نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کا سربراہ منتخب کیا گیا۔ یہ سندھی مسلمانوں کی پہلی سیاسی اور سماجی تنظیم تھی۔ سیاسی رہنماؤں کی اگلی پیڑھی کے لیے سرشاہنواز بھٹو سوچ کا ایک عظیم ذریعہ تھے اور وہ رہنمائی اور ہدایات کے لیے ان کی جانب رجوع کرتے تھے۔ وہ تمام نوجوان سیاستدان جوان سنہرے دنوں میں ان کے رابطے میں آئے اور جنھوں نے بعدازاں اپنے صوبے کے معاملات میں اہم کردار ادا کیا، انھوں نے عوامی زندگی میں اپنا پہلا سبق سرشاہنواز بھٹو سے حاصل کیا، جنھیں ان کا سیاسی ان داتا تسلیم کیا جاتا تھا۔ میں ان نوجوانوں میں سے ایک تھا جنھیں اس واحد سندھی رہنما نے اپنے زیرسایہ تربیت دی، میراں محمد شاہ نے تحریر کیا ہے جو برصغیر کی حالیہ تاریخ میں ابتدائی دس برسوں کے دوران 1938ء سے 1948ء تک سندھ کی قانون ساز اسمبلی کے سپیکر رہے۔ انھوں نے ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے جس میں بقول ان کے انھوں نے اپنے مربی سرشاہنواز بھٹو سے خودداری کا سبق حاصل کیا۔

برطانوی راج کے ان ابتدائی ایام میں جیکب آباد میں میلہ مویشیاں واسپاں منعقد ہوا جس میں محکمہ پولیس کے سربراہ کی ہدایت کے مطابق ترتیب کردہ نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک ڈی آئی جی پولیس ادمانی نے سرشاہنواز بھٹو سمیت بمبئی کی مقننہ کے اراکین کی کرسیاں ضلعی افسران کی نشستوں کی قطار کے پیچھے رکھوادیں۔ شاہ نواز بھٹو اور ان کے ساتھی جب وہاں پہنچے تو اس کوتاہ نظری کا نوٹس لیا۔ ان کی عزت نفس اور خودداری کے احساس نے انھیں مجبور کردیا کہ اس تضحیک کا جواب دیں لہٰذا انھوں نے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ میلے کا بائیکاٹ کردیا۔ انھوں نے بمبئی کے گورنر کو ایک سخت مراسلہ بھی بھیجا جس میں مقامی برطانوی افسران کی طرف سے سندھ کے عوامی نمائندوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔ یہ اقدام سندھی عوام کے لیے ایک مثبت اچنبھا تھا جنھیں اس سے قبل یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کسی برطانوی افسر کے رویے کے خلاف احتجاج بھی کرسکتے ہیں۔ اس احتجاج کا نتیجہ یہ نکلا کہ ادمانی کو عوامی نمائندوں سے معذرت کرنا پڑی اور جلد ہی سندھ سے اس کا تبادلہ کردیا گیا۔

سرشاہنواز بھٹو پہلی مرتبہ قائداعظم محمد علی جناح سے لاڑکانہ میں 1928ء میں ملے۔ بے نظیر بھٹو کے والد ذوالفقار علی بھٹو جوان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے، اسی سال پیدا ہوئے۔ محمد علی جناح انگلینڈ میں وکالت کرتے تھے، سرشاہنواز کے ساتھ کئی معاملات میں مماثلت رکھتے تھے۔ دونوں پیدائشی طور پر سندھی تھے۔ دونوں نے کراچی میں سندھ مدرستہ الاسلام سے تعلیم پائی اور دونوں ہی مسلمانوں کے مفادات کو دل سے عزیز رکھتے تھے۔ سندھ محمڈن ایسوسی ایشن نے محمد علی جناح کو ملاقات کی دعوت دی جس کی صدارت سرشاہنواز بھٹو کے پاس تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح خاندان کے مرکزی گھر المرتضیٰ لاڑکانہ سرشاہنواز بھٹو کے ساتھ رہے۔ یہ ملاقات دونوں رہنماؤں کے درمیان طویل اور پُرجوش تعلقات کا آغاز

ثابت ہوئی۔

1930ء کی دہائی کی شروعات ایسے واقعات سے ہوئی جن کے سر شاہنواز بھٹو اور ہندوستان کی مسلم آبادی پر دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ برطانوی سرکار نے ہندوستان کی سیاسی صورتحال کے مدنظر بنیادی مسائل حل کرنے کی کوشش میں 1930ء سے 1933ء کے عرصہ میں لندن میں گول میز کانفرنسیں منعقد کروائیں۔ ایجنڈے کے بہت سے موضوعات میں سے ایک بمبئی سے سندھ کی علیحدگی تھا۔

تاریخی اعتبار سے 1843ء میں سر جنرل چارلس نیپئر کے ہاتھوں برطانوی راج میں شمولیت سے پیشتر سندھ مغلوں کے زیرِ سایہ ایک خود مختار ریاست رہا۔ بعدازاں تقریباً چار سال تک یہ برطانوی ہند کا ایک خود مختار صوبہ رہا تاہم 1847ء میں اسے بمبئی راجدھانی میں شامل کرلیا گیا حالانکہ اس کی بمبئی سے کوئی گہری مماثلت نہ تھی۔ اس کے نتیجے میں سندھ افسر شاہی کی جنت بن گیا کیونکہ وہ عوامی نمائندوں کی موثر نگرانی سے آزاد اس وسیع صوبے پر حکومت کرتے تھے۔

سر شاہنواز بھٹو کو لندن میں منعقد گول میز کانفرنس میں سندھی مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے مدعو کیا گیا۔ 12 نومبر 1930ء کو پہلی گول میز کانفرنس کا افتتاح شاہ جارج پنجم نے کیا جس میں اٹھاون کے قریب اینگلو انڈین قائدین افسران وشہزادے سیاستدان اور مختلف طبقہ ہائے فکر کے دانشور مل بیٹھے تاکہ ہندوستان کو درپیش آئینی اور سیاسی مسائل کا حل تلاش کیا جاسکے۔ مسلمانوں کی طرف سے سولہ نمائندے شریک ہوئے جن میں قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ہزہائینس آغا خان اور مسلم ہندوستان کے دیگر اہم رہنما شریک ہوئے۔ سر شاہنواز بھٹو نے اپنی قوم کا مقدمہ بڑے موثر انداز میں پیش کیا۔

اپنے اپنے مخصوص مفادات رکھنے والے کئی فریقین کی شدید مخالفت کے باوجود اپنی دھن کے پکے اس دھرتی کے بیٹے نے سندھ کی علیحدگی کے مسئلہ پر فتح حاصل کی۔ یہ ان کی انتہائی غیر معمولی اور شاندار سیاسی کامیابی تھی۔ اس سے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک بنیادی پلیٹ فارم میسر آیا جہاں سے ایک آزاد مسلم ریاست کے لیے بعدازاں تحریک آزادی کا آغاز ہوا۔ آنے والے عشرے نے ثابت کیا کہ سندھ ہی وہ خود مختار صوبہ تھا جس نے تخلیق پاکستان میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ یہی پس منظر تھا کہ جس پر سٹینلے والپرٹ نے لکھا۔

"سر شاہنواز بھٹو کی زندگی میں نمایاں سیاسی کامیابی یہی تھی کہ انھوں نے لندن کی گول میز کانفرنس میں تاج برطانیہ کے حکمرانوں کو قائل کرلیا کہ سندھ کو علیحدہ صوبائی تشخص ملنا چاہیے۔ اس طرح انھوں نے اپنے وطن کو بمبئی سے آزاد کرالیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے نافذ ہوتے ہی راتوں رات کراچی کا مقام بلند ہوا اور اس کی حیثیت بھی دیگر صوبائی دارالحکومتوں یعنی بمبئی، کلکتہ اور مدراس کے مساوی ہوگئی۔ مسلم لیگ کے قیام کے عہد سے یہ واحد اہم سیاسی و معاشی انقلاب تھا جو ایک ہندوستانی مسلمان لایا۔ اس سے بڑا کارنامہ تقریباً ایک عشرے بعد صرف قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ انجام دے سکے کہ جب انھوں نے علیحدہ قومیت کی بنا پر پاکستان کا مقدمہ جیتا۔"

(روزنامہ مساوات، لاہور 28 دسمبر 2007ء)

♥......♥......♥

بھٹو خاندان کے مختصر حالات

سارے ''بھٹوز'' کم عمری میں غیر فطری موت کا شکار کیوں ہوتے رہے

محترمہ بے نظیر بھٹو شہید جس سج دھج سے مقتل میں گئیں اس کا بانکپن اور تمکنت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کو ایک ایسی دیومالائی حیثیت دے رہا ہے، کہ جس کی صرف داستانوں ہی میں مثال ملتی ہے۔ وہ بھٹو خاندان کی چار سو سالہ تاریخ میں پہلی خاتون ہیں جو نہ صرف سیاست میں آئیں بلکہ دو مرتبہ وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ وہ پاکستان کی واحد خاتون سیاسی رہنما ہیں، جنھیں دہشت گردی کا نشانہ بنا کر زندگی سے محروم کر دیا گیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے دادا سر شاہنواز بھٹو کے بعد بھٹو خاندان کی دوسری ایسی شخصیت ہیں، جس نے زیادہ عمر پائی۔ ان کے دادا کی عمر 69 سال تھی۔ باقی خاندان کا کوئی فرد پچاس سال سے اوپر نہ جا سکا۔ صرف ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو اکیاون سال زندہ رہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دادا غلام مرتضیٰ بھٹو تو صرف 31 سال کی عمر میں وفات پا گئے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دشمنوں نے انھیں زہر دے دیا تھا۔ بھٹو خاندان کی تاریخ پڑھیں تو اس میں ایک خاص طرح کی انفرادیت اور بے کلی نظر آتی ہے۔ پچھلے ساٹھ برسوں میں اگرچہ بھٹو خاندان کا تذکرہ بہت ہوا ہے، تاہم اس کا محور صرف ذوالفقار علی بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی شخصیات ہی ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے بھائیوں شاہنواز بھٹو اور غلام مرتضیٰ بھٹو کی ناگہانی اموات بھی اس تذکرے کا حصہ رہی ہیں، تاہم اس خاندان کی تاریخ سیاسی جدوجہد اور مشکلات کے مدوجزر سے بھری پڑی ہے۔ یہاں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب محترمہ بے نظیر بھٹو پیدا ہوئیں، تو ان کے والد نے ان کا نام اپنی دس سالہ مرحومہ بہن کے نام پر بے نظیر رکھا۔ اس طرح بھٹو مرحوم کی اپنے بہن بھائیوں سے محبت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے اپنے بھائیوں سکندر بھٹو اور امداد بھٹو کے پورٹریٹ خصوصی طور پر بنوا کر المرتضیٰ لاڑکانہ میں آویزاں کرائے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بھٹو خاندان کے بچوں کے نام ذوالفقار علی بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو خود رکھتے تھے لیکن بے نظیر بھٹو کا نام ذوالفقار علی بھٹو نے خود رکھا۔ اس طرح بھٹو خاندان کے ذرائع اس بات کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ جب محترمہ بے نظیر بھٹو کے والد ذوالفقار علی بھٹو 1928ء میں پیدا ہوئے، تو ان کی پیدائش کا بھرپور جشن منایا گیا۔ وہ شاہنواز بھٹو کی دوسری اہلیہ خورشید بیگم کے بطن سے پیدا ہونے والی پہلی اولاد تھے۔ ایسے بھی سندھیوں میں بیٹے کی پیدائش پر جشن منایا جاتا ہے، لیکن حیران کن بات ہے کہ جب محترمہ بے نظیر بھٹو 1953ء میں پیدا ہوئیں، تو ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو نے اتنی ہی خوشی کا اہتمام کیا، جتنی کہ بیٹے کی پیدائش پر کی جاتی ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بھٹو بیٹی اور بیٹے دونوں کو ایک ہی طرح کی اہمیت دیتے تھے بلکہ آگے چل کر یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ ذوالفقار علی بھٹو اپنے سیاسی جانشین کے طور پر محترمہ بے نظیر بھٹو کا انتخاب کر چکے تھے یہ ان کی بیٹی پر نظر کرم تھی یا اس کی صلاحیتوں کے باعث نظر انتخاب،

بہر حال ان کے اس فیصلے نے بھٹو خاندان کی روایات ہی تبدیل نہیں کیں، اس کی شان و شوکت میں بھی اضافہ کر دیا جو لوگ آج یہ اعتراض کر رہے ہیں کہ بھٹو کا اصل وارث تو غلام مرتضیٰ بھٹو کا صاحبزادہ ذوالفقار علی بھٹو جونیئر ہے، وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ بھٹو خاندان کی روایات سے ہٹ کر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی سیاسی وراثت کا بوجھ محترمہ بے نظیر بھٹو کے کاندھوں پر ڈال دیا تھا۔ غیر روایتی اقدام بھٹو نے اٹھایا تھا، اس کے منطقی نتیجے میں تو بلاول بھٹو زرداری ہی بھٹو خاندان کی سیاسی پگ کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھٹو خاندان کی چار سو سالہ تاریخ کو بام عروج پر پہنچا دیا ہے ان کی شہادت ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس نے ان کے والد کی المناک موت کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے کس طرح ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ وہ پلک جھپکنے میں آنکھیں بند کر کے دنیا سے رخصت ہوئیں۔ لیاقت باغ کے سانحے نے ان کی شہادت کا جو گہرا نقش ثبت کیا ہے، وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا رنگ جما رہا ہے کہ جس کے اثرات دائمی ہوئے ہیں۔ بھٹو خاندان کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے محترمہ درثمین نقوی اپنی کتاب ''دختر پاکستان بے نظیر بھٹو'' میں لکھتی ہیں۔

''بھٹو قبیلہ ان راجپوت مہاجروں سے پھوٹا تھا جو تقریباً چار سو سال پہلے جیسلمیر میں آباد تھے۔ جیسلمیر اب بھارت کی سرحدی ریاست راجستھان میں شامل ہے۔ اس خاندان کا پہلا شخص سہو خان بھٹو سولہویں صدی کے وسط میں آیا اور یہاں پہنچ کر اس نے ایک گاؤں آباد کیا جس کا نام بھٹور کھا گیا۔ اس گاؤں کے آثار بالائی سندھ میں آج بھی ملتے ہیں تاہم قسمت کی دیوی انیسویں صدی کے آغاز میں ڈوڈا خان بھٹو کو ملی جس نے اردگرد آباد خاندانوں کے خلاف سخت جنگ لڑی تاکہ اپنے خاندان کے لیے زمین کے کچھ قطعے حاصل کر سکے، ڈوڈا خان کا بیٹا اللہ بخش بھٹو جیکب آباد کے قبیلہ بروہی اور گڑی کھادر کے قبیلہ جمالی کے خلاف کامیاب مہم چلا کر اپنی مالکی کو وسیع کر لینے میں کامیاب ہو گیا۔

ڈوڈا خان شہید بھٹو کے پڑ دادا تھے اور اس علاقہ میں فی الواقعی نواب سمجھے جاتے تھے۔ وہ پالکی میں سفر کرتے تھے جس کے ساتھ اسے اٹھانے والے چاکروں کا ایک قافلہ بھی چلا کرتا تھا۔ یہ سواری ان دنوں صرف حکمران تالپور خاندان اور پیر پگارا اول کے لیے مخصوص تھی۔ ڈوڈا خان کی کوششوں نے بھٹو خاندان کو سندھ کے معزز خاندانوں میں شامل کر دیا اور معززین کا یہ درجہ اس خاندان کے پاس آج تک ہے۔

اس خاندان میں ایسے الزامات کا ذائقہ پہلے ہی چکھا جا چکا تھا جو ذوالفقار علی بھٹو پر لگائے گئے، بھٹو شہید کے دادا غلام مرتضیٰ پر بھی قتل کا الزام لگایا گیا تھا۔ قائد عوام اور اس سے قریبی ساتھی اس کے بارے میں بھی یہی کہتے تھے کہ وہ الزام بھی ان کے دادا پر ان کے سیاسی دشمنوں نے لگایا تھا۔ اس خاندان کی روایت کے مطابق ان پر بھی ایک ایسے سیاسی منصوبہ کی بنیاد پر مقدمہ بنایا گیا جو مقامی برطانوی حکام نے تیار کروایا تھا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ غلام مرتضیٰ بھٹو نے مرحوم مسلمان درویش کے اعزاز میں منعقد کی گئی تقریب میں ایسے زیور پہن لیے تھے جن پر نقش و نگار تھے۔ اس لیے ان کو مقدمہ قتل میں الجھنا پڑا سندھ کے سادہ لوح عوام نے اس تقریب میں زیور پہننے کے عمل کو اس درویش کی توہین سمجھ لیا اور یقین کر لیا کہ غلام مرتضیٰ بھٹو کی بدنصیبیوں کا سبب یہی غلطی بنی۔ لہٰذا مقدمہ قتل کو ان کی اس غلطی کی سزا قرار دے دیا گیا۔

غلام مرتضیٰ بھٹو کے خلاف جس مقدمہ کو شہ دی گئی۔ وہ ضلعی شکار پور کے انگریز کلکٹر کی طرف سے دائر کیا گیا تھا اور اپنے دور کا ایک بڑا سیاسی سکینڈل بن کر سامنے آیا تھا۔ انھوں نے اپنے دفاع کے لیے پنجاب کے ایک اعلیٰ حیثیت رکھنے والے بیرسٹر کی خدمات حاصل کیں اور اسے

ایک ہزار دو سو پچاس روپے روزانہ فیس دی جو ان دنوں بہت بڑی رقم تھی۔ اس مقدمہ میں وہ بری ہو گئے لیکن ان کے دشمنوں نے اس قصے کو ختم نہ ہونے دیا اور ان کے خلاف یکے بعد دیگرے کئی مقدمات قائم کروائے اس صورتحال میں یہ جان کر کہ گرفتاری دینے کا مطلب بہرحال پھانسی پر لٹکنا ہی ہوگا۔ غلام مرتضیٰ بھٹو علاقے سے غائب ہو گئے ان کے خلاف مقدمہ ان کی غیر حاضری میں چلایا گیا، انھیں مجرم قرار دے دیا گیا اور ان کی زمینوں اور دیگر جائیداد پر قبضہ کر لیا گیا غلام مرتضیٰ بھٹو نے جلاوطن کی حیثیت سے پنجاب میں پناہ لی۔ بعد ازاں بھیس بدل کر کابل چلے گئے بتایا گیا ہے کہ وہاں سے وہ افغانستان کے مہمان بن گئے یہ جلاوطنی غلام مرتضیٰ بھٹو نے کئی برس تک جاری رکھی لیکن آخر اپنے دو بچوں کی خاطر بے چین ہو کر انھوں نے واپس سندھ آ جانے کا فیصلہ کر لیا اور اندرون سندھ کا سفر کرتے ہوئے تاکہ برطانوی انصاف کے سامنے ہتھیار ڈال دیں۔ اس کے بعد وہ اپنے مقدمہ کی از سر نو سماعت کروانے میں بھی کامیاب ہو گئے اور اس سے بری ہو گئے۔ ان کی جائیداد اور زمینیں بحال کر دی گئیں۔ لیکن ان سے ان کو تھوڑا سا فائدہ ہی پہنچا کیونکہ وہ صرف 31 برس زندہ رہے کہا جاتا ہے کہ ان کو زہر دے دیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ بھٹو خاندان کے اکثر قائدین چھوٹی عمروں میں ہی انتقال کر جاتے تھے اور جناب بھٹو ہمیشہ اس حقیقت کو یاد رکھتے تھے انھیں ہمیشہ یہ تلخ حادثے یاد رہتے کہ ان کے دو بھائیوں سکندر، امداد اور دو چچا الٰہی بخش اور واحد بخش پچاس سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اس لیے ذوالفقار علی بھٹو عموماً یہ کہا کرتے تھے کہ وہ پچاس سال کی عمر سے زیادہ نہیں جئیں گے اور جو کارنامے کرنا چاہتے ہیں انھیں اس عمر تک پہنچنے سے پہلے پہلے سرانجام دیں گے۔ ان کی یہ پیش بینی واقعی درست ثابت ہوئی کیونکہ وہ 49 سال کے تھے کہ فوج نے زبردستی اقتدار پر قبضہ کر لیا اور 51 سال کے تھے کہ 14 اپریل 1979ء کو انھیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

ذوالفقار علی بھٹو کے والد شاہ نواز بھٹو ضلع لاڑکانہ میں اپنے گاؤں گڑھی خدا بخش میں تین مارچ 1888ء کو پیدا ہوئے پنجاب اور دیگر علاقوں میں اپنے والد کی جلاوطنی کے دوران شاہ نواز اور ان کے بھائی علی گوہر کی پرورش ان کے چچا رسول بخش خان بھٹو کی نگہداشت میں ہوئی۔ شاہ نواز بھٹو کو مدرسۃ السلام لاڑکانہ اور اس کے بعد سینٹ پیٹرک ہائی سکول کراچی میں تعلیم دلائی گئی غلام مرتضیٰ کی قبل از وقت موت کی وجہ سے شاہ نواز بھٹو کو کراچی سے صرف چھ سال کی تعلیم کے بعد واپس آنا پڑا تاکہ اپنی زمینوں کا کاروبار سنبھال سکیں اس کے بعد وہ کبھی باقاعدہ تعلیم نہ حاصل کر سکے لیکن انگریزی زبان پر انھوں نے کافی عبور حاصل کر لیا جسے انھوں نے روانی سے بولنا سیکھ لیا تھا۔

اپنی زمینیں سنبھالنے کے بعد شاہ نواز نوجوانی میں ہی سیاسی اکھاڑے میں اتر آئے اور مستقل مزاجی سے چلتے چلتے اہم حیثیت تک پہنچ گئے۔ 1919ء میں جب وائسرائے کی امپیریل کونسل کا سندھ سے تعلق رکھنے والا نمائندہ فوت ہو گیا تو وہ اس کی جگہ بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ 1920ء میں مقامی ڈسٹرکٹ بورڈوں کو جمہوری شکل دی گئی اور لاڑکانہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے انتخابات ہوئے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کا یہ عہدہ ضلع کا سب سے طاقتور عہدہ تھا۔ شاہ نواز بھٹو نے اس کا انتخاب لڑا اور ایک بار پھر بلا مقابلہ منتخب ہو گئے ان اہم پوزیشنوں پر شاہ نواز بھٹو کی کامیابی دوسروں کے مقابلہ میں بھٹو خاندان کی زیادہ حیثیت اور قوت کی نشاندہی کرتی ہے کیونکہ لاڑکانہ ضلع میں خصوصی طور پر نمایاں حیثیت رکھنے والے خاندان آباد تھے۔ جن میں چانڈیہ، مکسی قمبر کے اسران، ڈوکری کے بھکیہ، میڑھ کے جتوئی، سہوت کے لکھیاری اور طیب کے دیوان شامل تھے۔

شاہ نواز بھٹو کوئی ریڈیکل نظریات نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ عزت دار سیاست دانوں میں سے ایک تھے وہ برطانوی سامراج کے خلاف انتہا پسندی کرنے والوں کا ساتھ دینے کے بجائے انگریز کے ساتھ تعاون کر کے حقوق حاصل کرنے کی پالیسی پر چلتے تھے۔ وہ یقیناً ایک قوم پرست مسلمان رہنما تھے لہٰذا وہ کانگریس کے مخالف تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی بہت سی کمیٹیوں اور گروپوں کو متحرک کیا اور مسلمانوں کے مقاصد کے لیے حوصلے کے ساتھ لڑتے رہے۔ وہ قائداعظم اور خصوصاً ماہر تعلیم محمد علی جوہر کے قریبی دوست تھے۔ محمد علی جوہر نے تو نزع کے عالم میں بھی اپنے دوستوں میں سے صرف شاہ نواز بھٹو کو ہی پاس بٹھایا تھا۔

وہ سیاستدان جو برطانوی راج کی بلندی تک پہنچ رکھتے تھے چند ایک مراعات یافتوں تک محدود تھے جن ڈسٹرکٹ بورڈوں، کمیٹیوں اور کونسلوں میں شاہ نواز بھٹو نے کام کیا۔ ان میں بار بار سامنے والے نام ان سندھی معززین کے تھے جن میں عبداللہ ہارون، غلام حسین ہدایت اللہ، امیر علی لاہوری، جی ایم سید اور ایم اے کھوڑو شامل تھے۔ یہ سب لوگ امیروں وزیروں کی بدلتی ترجیحوں کے، مت مار دینے والے سلسلے میں شامل ہونے کے لیے کبھی ایک دوجے کی مخالفتوں میں الجھے نظر آتے تھے تو کبھی سازشیں کرنے میں مصروف ہوتے تھے لگتا ہے سیاست اس وقت بس اس اشرافیہ کا کھیل تھی جس کی حقیقی قوت برطانیہ والوں کے ہاتھوں میں تھی سیاست میں شامل ہونے والے لوگ ایک دوسرے کے خلاف تمام تر منصوبوں اور ریشہ دوانیوں میں الجھے ہوئے یوں محسوس ہوتے تھے گویا ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے شادی بیاہ، مرگ، رسموں اور خوشیوں، غموں میں شریک ہوتے ہیں اور وسیع تر مفاد کے لیے ایک دوجے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔

شاہ نواز بھٹو کو جس بات نے برصغیر کی تاریخ میں ہمیشہ قائم رہنے والی حیثیت دلائی وہ بمبئی کی پریذیڈنسی سے سندھ کو نکلوانے کے لیے ان کی ثابت قدمی اور بہادری سے لڑی ہوئی جنگ ہے۔ انھوں نے اپنے اس مطالبے کی بنیاد اس امر پر رکھی تھی کہ سندھ تاریخی طور پر ایک علیحدہ اکائی ہے جس کی اپنی الگ ثقافت، الگ زبان اور الگ لسانی گروپ ہے ان کا کہنا تھا کہ سندھ کو بمبئی کی پریذیڈنسی میں شامل کرنا ایک حادثاتی واقعہ ہے جو انتظامیہ کو ایک خاص انداز میں چلانے کے لیے رونما ہوا۔ مزید یہ کہ سندھ میں زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہونے کی وجہ سے بمبئی کی عملداری میں موجود سندھ ان صوبوں کے مقابلے میں کسی گنتی میں نہیں رہتا تھا۔ جن میں ہندو آبادی کی اکثریت تھی جبکہ اس عملداری میں موجود دیگر ریاستیں سنور جاتی تھیں۔ اس بات سے قائل ہو کر سندھ کے مسلمانوں کے حقوق کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا، شاہ نواز بھٹو نے سندھ کی علیحدگی کے لیے دس سال تک جہاد جاری رکھا۔ 1932ء یا 1931ء میں انھوں نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی جہاں انھوں نے وزیراعظم رمزے میکڈونلڈ کے سامنے اس بات پر براہ راست احتجاج کیا کہ سندھ کو مٹایا جا رہا ہے۔ ان کے اس احتجاج کے نتیجہ میں ہی ایک علیحدہ کمیٹی بنائی گئی، جس کا چیئرمین لارڈ رسل کو بنایا گیا کمیٹی کا کام سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کے سوال کا جائزہ لینا تھا۔ اس کے نتیجے میں یوں ہوا کہ گول میز کانفرنس سے شاہ نواز بھٹو کی لاڑکانہ واپسی کا عمل ایک فاتح کی واپسی کا عمل گردانا گیا۔ سندھ کی علیحدگی کے اس زبردست ترجمان کی آمد کا جشن منانے کے لیے ان کے گاؤں میں عظیم الشان جلوس نکالا گیا بھٹو اس وقت اگرچہ بچے تھے، لیکن یہ منظر انھیں پوری طرح یاد تھا۔ انھیں یہ جلوس دکھانے کے لیے چھت پر لے جایا گیا تھا اور اس جوش و جذبے کو وہ آج بھی ذہن میں لا سکتے تھے۔ 24 دسمبر 1933ء کو برطانوی حکومت نے شاہ نواز بھٹو کی کبھی نہ تھکنے والی مہم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور یوں دو

سال بعد سندھ علیحدہ صوبہ بن گیا۔ شاہ نواز بھٹو کے اس اقدام کی گونج نے وہ ہلچل پیدا کی کہ خود ان کے ساتھ ساتھ دوسرا کوئی لیڈر ان وقتوں میں اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت مسلم اکثریت کے صوبے کی حیثیت سے سندھ کا سٹیٹس پاکستان کا تصور دینے میں فیصلہ کن عنصر ثابت ہوا۔ جبکہ شاہ نواز بھٹو کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ ان کا اقدام پاکستان بنانے کے لیے بھی مددگار ثابت ہوگا نیز علیحدہ حیثیت دینے سے سندھ آگے چل کر پاکستان کا نہ صرف حصہ بنے گا بلکہ ایک ایسا عامل ثابت ہوگا جو اس پورے مسئلے پر بھی اثر ڈالے گا کہ نئی مملکت چل سکنے کے قابل بھی ہوگی یا نہیں پھر 1937ء میں جب تک سندھ کی نئی قانون ساز اسمبلی وجود میں نہ آ گئی سندھ کی حکمرانی کے خالی رہنے کا جو درمیانہ عرصہ آیا۔ اس میں شاہ نواز بھٹو کو ہی گورنر سندھ کا مشیر رکھا گیا۔

ستم ظریفی یہ ہوئی کہ شاہ نواز بھٹو کی اس عظیم فتح نے ہی ان کی شکست کے راستے بھی کھول دیے۔ سندھ کی علیحدگی کے بعد اگرچہ انھیں ہی گورنر سندھ کا مشیر بنایا گیا تھا لیکن 1937ء کے اوائل میں فیصلہ کیا گیا کہ سندھ کی پہلی قانون ساز مجلس کا انتخاب بھی کیا جائے گا۔ پس سندھ کے جاگیرداروں کی انتخابی مہم چل پڑی۔ شاہ نواز بھٹو کے علاوہ سندھ کے دوسرے بڑے سیاستدان غلام حسین ہدایت اللہ تھے۔ جو اندرونی سندھ کے ایک زیرک وکیل تھے اور ایگزیکٹو کونسل کے رکن بھی۔ دونوں سیاستدانوں کے پیچھے لوگوں کی قابل ستائش حد تک لمبی قطار موجود تھی جو دو امتیازی سیاسی گروپوں کی صورت میں ٹھوس اور حتمی شکل اختیار کر گئی۔ ان دونوں سیاسی جماعتوں میں نظریات کا کوئی اہم اختلاف موجود نہیں تھا بلکہ دونوں رقابت اور جاگیردارانہ اطاعت کی بنیاد پر قائم کی گئی تھیں۔ شاہ نواز بھٹو کے گروپ میں حاجی عبداللہ ہارون اور جی ایم سید جیسے اہم افراد تھے جبکہ حاجی ہدایت اللہ کے گروپ میں ایوب کھوڑو، قاضی فضل اللہ اور امیر لاہوری اہم شخصیتیں تھیں۔

چونکہ دونوں گروپوں کے درمیان کوئی مصدقہ سیاسی اختلافات موجود ہی نہیں تھے اس لیے یہ بات بھی حیران کن نہیں تھی کہ مختلف دھڑے کبھی ایک طرف تو کبھی دوسرے طرف ہوتے رہتے تھے ان دھڑوں کے ادھر ادھر آنے جانے سے یہ انتخابی مہم چالبازیوں اور قانونی حیلہ سازیوں کا امتزاج بن گئی۔ جس میں ایک پارٹی سے ٹوٹ کر آنے والا دھڑا کبھی دوبارہ پہلی پارٹی کی طرف لوٹ جاتا تھا تو کبھی دوسری پارٹی کی طرف آ جاتا تھا۔ اپنی خاندانی قوت کا تحفظ کرنے کے ساتھ ساتھ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرنے کی مہم میں جو نیک نامی شاہ نواز بھٹو نے حاصل کر لی اس کی بنیاد پر انھیں یقین تھا کہ وہ انتخابات میں فتح حاصل کر لیں گے پہلی بار جب شاہ نواز بھٹو کو پتہ چلا کہ انتخابات میں ان کا مقابلہ عبدالمجید سندھی سے ہوگا تو انھوں نے لاپرواہی کے ساتھ کہا ''ایک گیدڑ شیر کی کچھار میں داخل ہونے لگا ہے۔'' شاہ نواز بھٹو اتنے خود اعتمادی کا مظہر تھے کہ انتخابات کے دن سے چند روز پہلے تک وہ لاڑکانہ کی طرف پلٹے ہی نہیں پھر جب یہاں پہنچے تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کی انتخابی مہم تو مکمل طور پر بے ترتیبی اور ابتری کا شکار ہو چکی ہے۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ بھٹو خاندان کے بعض اپنے ارکان بھی انتخابات میں مخالف دھڑے میں شریک ہو گئے اور شاہ نواز کی پوزیشن بہت کمزور ہو گئی پس اپنے اردگرد کراہت آمیز بے وفائیوں سے تنگ آ کر شاہ نواز بھٹو نے ہار مان لی اور عین اس روز کراچی چلے گئے جب پولنگ اسٹیشن پر ووٹ ڈالے جا رہے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود شکست کھا گئے لیکن ان کی سندھ یونائیٹڈ پارٹی نے اسمبلی میں ایسی اچھی اکثریت حاصل کر لی جس سے ان کا سیاسی گزارہ بخوبی چل سکتا تھا لیکن انتخابی سیاست کی ریشہ دوانیوں نے انھیں اتنا پریشان کر دیا تھا کہ وہ اپنی پارٹی کو بھی دشمنوں کے ہجوم میں چھوڑ

گئے اور ان کے مخالفین نے کسی نہ کسی طرح یہ بندوبست بھی کر لیا کہ سندھ کا وزیر اعلیٰ ہدایت اللہ کو بنا دیا جائے۔

شاہ نواز 49 سال کے ہوئے تو انھوں نے سیاست چھوڑ کر بمبئی میں پبلک سروس کمیشن میں شمولیت حاصل کر لی۔ یہ وہی عمر ہے کہ جس میں انکے صاحبزادے ذوالفقار علی بھٹو سے حکومت چھین کر مارشل لاء لگایا گیا۔ سیاست سے کنارہ کش ہوتے وقت شاہ نواز نے جو بیان جاری کیا وہ اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ انتخاب میں سیاسی جوڑ توڑ سے پریشان ہونے کی وجہ سے وہ کس قدر مجروح ہوئے تھے اس بیان میں انھوں نے کہا تھا۔

''مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ سندھ کے لوگوں کو الوداع کہنا پڑا ہے اپنی ساتھی رعیت کے لیے میں نے وہ سب کچھ کیا جو میرے بس میں تھا اور اس سارے عمل میں سب سے زیادہ نقصان اپنے آپ کو پہنچایا میں سیاسی غیرت اور رقابت کی وجہ سے سیاست کو خدا حافظ کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے دوستوں سے گزارش کرتا ہوں کہ میں ان سب کو آج اپنی آنکھ کے تارے سمجھتا ہوں اور ساتھ ہی دشمنوں سے کہتا ہوں کہ ان کے لیے بھی میرے دل میں کوئی عداوت نہیں ہے۔''

انتخاب میں شکست سے پیدا ہونے والی صورت حال اور لوگوں کی ناشکری کئی برس تک شاہ نواز بھٹو کے ذہن پر چھائی رہی اس وقت ذوالفقار علی بھٹو 9 برس کے تھے بھٹو شہید نے ایک بار کہا تھا۔

''میرے والد چونکہ گورنر سندھ کے مشیر تھے۔ اس لیے انتخابی مہم کے دوران ہم اس رہائش گاہ میں رہتے تھے جو وزیر اعلیٰ کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ یہ گھر اکثر مہمانوں سے بھرا رہتا تھا کیونکہ لوگ ہر وقت یہاں آتے جاتے تھے مجھے یاد ہے کہ اس روز جب میں گھر پہنچا تو گھر کی ہر چیز اجڑی اجڑی سی پڑی تھی اور میں نے اپنے ملازم سے پوچھا کہ بات کیا ہے کیا ہو گیا تو اس نے کہا تھا۔ جناب سر صاحب کو الیکشن میں شکست ہو گئی ہے۔''

1947ء میں شاہ نواز بھٹو جونا گڑھ چلے گئے جو گجرات کے ساحلی علاقہ پر واقعہ شہزادوں کی ریاست تھی۔ وہاں سے آٹھ نومبر 1947ء کو وہ اپنے خاندان سمیت پاکستان آ گئے اور دس برس بعد 19 نومبر 1957ء کو جب ان کے صاحبزادے ذوالفقار علی بھٹو اقوام متحدہ کی نمائندگی کر رہے تھے جناب شاہ نواز بھٹو کا انتقال ہو گیا۔

شاہ نواز بھٹو اشتعال کا سامنا کرتے ہوئے گہرے صبر کا مظاہرہ کیا کرتے تھے وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ جارحانہ الفاظ میں گفتگو کرنے سے اجتناب کرتے اور اس وقت بھی کسی سے انتقام لینے کی بات نہ کرتے جب انھیں پتہ چل جاتا کہ ان کے فلاں فلاں دشمنوں نے انھیں نقصان پہنچایا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو پانچ جنوری 1928ء کو تین بجے صبح بھٹو خاندان کی لاڑکانہ والی رہائش گاہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے وقت ان کا ستارہ برج جدی میں تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پیدائش کا جشن اس دھوم دھام سے منایا گیا۔ جو عمومی طور پر بڑے بڑے سندھی خاندان کے گھر میں بیٹے کی پیدائش کے لیے مخصوص ہوتی ہے کئی روز تک المرتضیٰ کے دروازے ان کے رشتے داروں، دوستوں اور خیر خواہوں کے لیے کھلے رہے جو نہ صرف

نوڈیرو اور گڑھی خدا بخش سے آئے بلکہ میر پور، گوٹھ، سکھر، ٹھٹھہ اور جیکب آباد جیسے دور دراز شہروں سے آتے رہے۔ روایت کے مطابق اس بچے کا نام ایک مقامی بزرگ کی سرپرستی میں لاڑکانہ کی مسجد میں جا کر رکھا گیا جہاں تلاوت کلام پاک کے بعد شاہ نواز بھٹو نے حاضرین کے مجمع سے مخاطب ہو کر اعلان کیا کہ بچے کو ذوالفقار علی کے نام سے پکارا جائے گا۔ ذوالفقار علی وہ نام تھا جو حضرت علیؓ نے اپنی تلوار کو دیا تھا تاریخی طور پر حضرت علی کی تلوار کا احترام جبر کے خلاف جدوجہد کی علامت کے طور پر کیا جاتا تھا اور وہ ان لوگوں کے لیے خصوصی اہمیت رکھتی تھی جو اس قسم کی روایات کو آنے والے حالات کا پیشہ خیمہ سمجھتے تھے۔

شاہ نواز بھٹو کے لیے ذوالفقار علی بھٹو کی پیدائش خصوصی اہمیت رکھتی تھی کیونکہ وہ ان کی دوسری بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والے پہلے بیٹے تھے خورشید بیگم مستقبل کے عظیم عوامی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کی والدہ تھیں بھٹو مرحوم کی والدہ ایک محبت کرنے والی پرکشش شخصیت تھیں اور ان کے گھر کا ماحول بھی انتہائی پرکشش تھا۔

شاہ نواز بھٹو نے اپنے اس بیٹے پر دل کھول کر توجہ دی ایوب کھوڑو اپنی پرانی باتیں یاد کر کے بتاتے ہیں شاہ نواز جب کسی بھی گاؤں آتے تو اپنے اس چھوٹے بیٹے کو ساتھ رکھتے اور اس کے تعلیمی کارناموں پر فخر کیا کرتے۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی شاندار کامیابیوں پر خوشیاں مناتے یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے بیٹے کو برکلے یونیورسٹی کیلیفورنیا اور آکسفورڈ یونیورسٹی انگلینڈ میں وہ تعلیم دلائی جو معززین کے لیے مخصوص تھی یوں لگتا ہے کہ بھٹو شہید کی کامیابیوں نے بوڑھے باپ کی ان مایوسیوں کا کفارہ ادا کر دیا تھا جو صرف ان کے دو بڑے بیٹوں سکندر اور امداد کی موت کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔ یہ دونوں جوانی کی عمر میں ہی انتقال کر گئے تھے۔

بہت سے شوقین باپوں کی طرح شاہ نواز بھی بیٹے سے وابستہ اونچی توقعات کو پالتے رہے اور پاکستان پہنچنے کے فوراً بعد ذوالفقار علی بھٹو کو سیاسی زندگی کے لیے بنانے سنوارنے لگے انھوں نے بیٹے کو اس بات کا قائل کیا کہ سیاسی طور پر زیادہ طاقت رکھنے والے لوگوں کے ساتھ اتحاد قائم کریں بہترین رئیسانہ روایات کے مطابق ذوالفقار کو دوسرے سنیوں سے ملوایا اور 1955ء کے قومی اسمبلی کے بالواسطہ انتخابات میں خصوصی طور پر اس مقصد کے لیے بھیجا کہ وہ ایوب کھوڑو کی مدد کریں کیونکہ کھوڑو نے شاہ نواز بھٹو کو اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ ایک طاقتور مقامی جاگیردار سلطان احمد چانڈیو اور ذوالفقار علی بھٹو کے سسر سردار احمد خان بھٹو کی حمایت اس کو دلا دیں یہ ذمہ داری ذوالفقار علی بھٹو کو اس لیے سونپی گئی کہ وہ اپنے والد کے سیاسی وارث تھے اور یہ بات واضح تھی کہ وہ اپنے خاندان کو سیاسی وقار اور اعزاز سے بہرہ ور کریں گے۔

خاندانی ورثے اور تاریخ کے تانے بانے سب کے سب شاہ نواز بھٹو کے لیے خصوصی اہمیت رکھتے تھے اور یہ سب انھوں نے اپنے بیٹے کو منتقل کر دیے تھے پھر ذوالفقار علی کے بیٹے کا نام رکھنے کا فیصلہ بھی شاہ نواز نے خود کیا اور اپنے والد کے نام پر مرتضیٰ بھٹو رکھا۔ بھٹو مرحوم کا دوسرا بیٹا شاہ نواز جسے 1985ء میں پیرس میں قتل کر دیا گیا تھا اپنے دادا کی موت کے بعد پیدا ہوا تھا اور اس کا نام ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے والد کے نام پر رکھا ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی بیٹی کا نام اپنی بہن بے نظیر کے نام پر رکھا جو دس سال کی عمر میں فوت ہو گئی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دادا غلام مرتضیٰ والد شاہ نواز اور بھائی سکندر اور امداد کے پورٹریٹ بھی بنوائے جو لاڑکانہ میں ان کی رہائش گاہ المرتضیٰ میں لٹکے ہوئے ہیں۔

بھٹو خاندان کا مسکن اور پاکستان کے چار صوبوں میں سے ایک صوبہ سندھ ایک سخت جان اور دوستوں دشمنوں کو ہمیشہ یاد رکھنے والا ہے، اس کی آب و ہوا کا جور و ستم بھی اس کے ساتھ اسی طرح ملا ہوا ہے جس طرح کہ جاگیرداریاں اس میں پیوست ہیں۔ شور دریائے سندھ جو اس کے جھلستے میدانوں میں سے ہوا کی طرح بہتا جاتا ہے۔ اس صوبے کو زندگی بھی دیتا ہے، کچھ سکھ بھی دے جاتا ہے، لیکن آئے سال بربادیاں پھیلانے والے سیلابوں کے ہاتھوں اپنی ہی دی ہوئی زندگی اور سکھ چین کا ظالمانہ انتقام بھی لے لیتا ہے۔ آبادکاریوں اور پٹوں کی نذر ہونے والی اس صوبے کی زمین پر اس کے الغوزوں کے سروں اس کے مچھروں کی بھنبھناہٹوں اور منڈیوں کی جانب رینگتی بیل گاڑیوں کے پہیوں کی چرچراہٹوں کی صداؤں کے مقابلے میں دریا کی سنسناہٹ کہیں زیادہ چبھتی ہے۔"

بھٹو خاندان کے اس تاریخی ورثے میں اہم ترین اضافہ ذوالفقار علی بھٹو ثابت ہوئے۔ جنھوں نے نوڈیرو کے چھوٹے سے گاؤں سے اٹھ کر عالمگیر شہرت حاصل کی۔ وہ ایک باکمال شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے آباؤ اجداد سے بڑھ کر سیاسی مقام و مرتبہ حاصل کیا۔ وہ بھٹو خاندان کے پہلے فرد تھے، جنھیں وفاقی وزارت ملی۔ تاہم انھوں نے اس پر بس نہیں کیا۔ ان کی سحر انگیز شخصیت نے عوام کو بہت متاثر کیا۔ وہ اپنے سیاسی نظریات کے حوالے سے عوام کے نجات دہندہ بن کر ابھرے۔ انھوں نے پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی تو گویا عوام اس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ نوزائیدہ جماعت مغربی پاکستان کی سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد مغربی پاکستان میں فوجی جرنیلوں نے بالآخر بھٹو کو اقتدار سونپ دیا۔ بھٹو نے 1973ء کا آئین دیا اور پہلی بار اسلامی کانفرنس بھی منعقد کرائی۔ یہ بے نظیر بھٹو کی نوجوانی کا دور تھا۔ وہ یہ سب کچھ قریب سے دیکھ رہی تھیں ان کی سیاسی تربیت میں اس عرصے نے بہت اہم کردار ادا کیا، کیونکہ ذوالفقار علی بھٹو انھیں اکثر اپنے غیر ملکی دوروں میں ساتھ رکھتے تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے عظیم والد کے خطابات کی فلمیں بہت غور سے دیکھتی تھیں۔ ان کے لب و لہجے، باڈی لینگویج اور تقریر کے مندرجات پر خصوصی توجہ دیتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت پر بھٹو کے اثرات بڑے گہرے نظر آتے ہیں۔ راولپنڈی میں ان کا آخری جلسہ ہو بہو بھٹو کے خطاب کی تصویر تھا۔ جس طرح ذوالفقار علی بھٹو مجمع پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتے تھے، اس طرح محترمہ بے نظیر بھٹو بھی ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کے جلسے کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ اپنے عظیم والد کی پھانسی کا سانحہ تھا تاہم اس واقعے نے ان کے اندر بے خوفی اور جرأت مندی کے اوصاف کو پختہ کیا۔ ماہر نفسیات پروفیسر خالد سعید کا کہنا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو ان لوگوں میں سے تھیں جو ہر واقعہ کا روشن پہلو دیکھتے ہیں۔ اپنے عظیم باپ کی المناک موت پر ان کا ایک فطری ردعمل تو یہ ہو سکتا تھا کہ وہ حالات سے دلبرداشتہ ہو کر خوف کی زندگی گزارتیں لیکن دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بھٹو خاندان کی ساکھ اور پیپلز پارٹی کو بچانے نکلتیں۔ یہ بہت مشکل راستہ تھا مگر انھوں نے اس کا انتخاب کیا۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے اندر جرأت اور بہادری پہلے دن سے موجود تھی اور مشکل ترین حالات بھی انھیں بزدلی کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بھٹو خاندان میں خواتین کو عملی زندگی میں آگے لانے کی روایت موجود نہیں تھی۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو ہی تھے، جنھوں نے اس روایت کو توڑا اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنے دونوں بیٹوں پر فوقیت دیتے ہوئے سیاسی زندگی کے اسرار و رموز سے اوائل عمری ہی میں

آ گاہ کرنا شروع کیا، جو لوگ آج یہ کہہ رہے ہیں کہ بھٹو خاندان کی لڑی غلام مرتضیٰ بھٹو کو ملنی چاہیے، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ خود اپنی زندگی میں ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی بیٹی کو اہمیت دی تھی اور بعد ازاں بیٹی نے بھی ثابت کیا کہ ان کے عظیم والد کی ان سے وابستہ توقعات غلط نہیں تھیں۔ ایک جاگیردارانہ معاشرے کے جاگیردار گھرانے کی سوچ میں یہ تبدیلی بڑی اہمیت کی حامل تھی اس تبدیلی کے اثرات بعد ازاں ملک کی پوری سیاست و معاشرت پر مرتب ہوئے۔ آج اگر بلاول بھٹو زرداری بھٹو خاندان کی علامت جماعت پیپلز پارٹی کے چیئرمین بنائے گئے ہیں، تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ یہ وہی عمل ہے، جس کی بنیاد در حقیقت خود ذوالفقار علی بھٹو نے رکھی تھی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے اس نکتے پر ضرور غور کیا جانا چاہیے کہ آخر ذوالفقار علی بھٹو نے ان میں کون سی ایسی صلاحیتیں محسوس کی تھیں، جن کی وجہ سے انھیں اپنے دونوں بیٹوں پر بے نظیر بھٹو کو ترجیح دینے کا خیال آیا تھا۔ لامحالہ یہ بے نظیر بھٹو کی ذہانت، سیاسی سوجھ بوجھ اور اپنے پاپا کو آئیڈیل سمجھنے کی انفرادیت ہوگی، جس نے بھٹو صاحب کو یہ راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ کیا بھٹو صاحب یہ نہیں جانتے تھے کہ پاکستانی معاشرے میں سیاست جیسا سنگلاخ میدان کسی بھی طرح خواتین کے لیے سازگار نہیں۔ وہ ضرور جانتے ہوں گے، مگر دوسری طرف انھیں اپنی بیٹی کی صلاحیتوں پر بھی اعتماد ہوگا، اور بالآخر اس اعتماد کا اظہار انھوں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنا سیاسی جانشین بنا کر کیا۔

بھٹو خاندان کی تاریخ میں دو مماثلتیں ایسی ملتی ہیں، جو اس میں جنم لینے والی دو بڑی شخصیات کے نکتۂ ظہور کے اسباب کو ظاہر کرتی ہیں۔ سر شاہ نواز بھٹو نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے ذوالفقار علی بھٹو کو سیاسی طور پر متعارف کرانا شروع کر دیا تھا وہ اسے اپنے سیاسی جانشین کے طور پر آگے لا رہے تھے۔ انھیں یہ احساس تھا کہ سندھ کو پاکستان میں شامل کرانے کے لیے بھٹو خاندان کی خدمات ناقابل تردید ہیں، اس لیے بھٹو کو سندھ کی بنیاد پر پاکستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کرنا چاہیے۔ سر شاہ نواز کی توقعات پوری ہوئیں اور بھٹو پر ایک وقت ایسا آیا کہ پاکستان کی سیاست کا سب سے بڑا نام بن گئے۔ دوسری طرف ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے باپ کی پیروی تو کی، لیکن ایک دوسرے انداز سے انھوں نے اپنی بیٹی بے نظیر بھٹو کو اوائل عمری ہی میں سیاست کے داؤ پیچ سکھانا شروع کر دیے۔ وہ نہ صرف ملکی سیاست کے اہم مراحل میں اپنے والد کے ساتھ رہیں، بلکہ غیر ملکی دوروں میں بھی بھٹو اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ مگر دوسری طرف انھوں نے بیٹی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے وہی ادارے منتخب کیے جو ان کے والد نے ان کے لیے منتخب کیے تھے۔ اس طرح محترمہ بے نظیر بھٹو کے ذہن و دل کو بھٹو خاندان کی سیاسی وارث کے طور پر تیار کیا گیا۔ یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے دونوں بیٹوں میں سے کسی کو اس مقصد کے لیے منتخب نہیں کیا۔ ان کی سیاسی تربیت کے ساتھ ساتھ غیر ملکی اعلیٰ تعلیم کے معاملہ میں بھی ذوالفقار علی بھٹو کی دلچسپی کم ہی نظر آتی ہے۔ یہ اس امر کا واضح اظہار ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو میں ان کے باپ کو ایسی قائدانہ صلاحیتیں نظر آتی تھیں، جو ان کے بیٹوں میں موجود نہیں تھیں۔ دوسری طرف محترمہ بے نظیر بھٹو کی اپنی فطری خوبیاں بھی انھیں دوسروں سے ممتاز کر رہی تھیں۔ سر شاہ نواز بھٹو نے اپنے بیٹے کو علاقے کے وڈیروں اور بڑے سیاسی خاندانوں کے ساتھ سیاست کے داؤ پیچ لڑانے کا گر سکھایا تھا، تو محترمہ بے نظیر بھٹو کو ان کے والدین نے بین الاقوامی سیاست کے گر سکھائے تھے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت پر جس طرح عالمی سطح پر ردعمل دیکھنے میں آیا، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو عالمی سطح کی لیڈر تھیں، اور یہ مقام انھوں نے اپنی کامیاب خارجہ پالیسی کی وجہ سے حاصل کیا تھا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے جس بے خوفی اور جرأت کا اظہار پاکستانی سیاست میں کیا، اسی طرح کا اظہار وہ عالمی سطح پر بھی کر چکی تھیں۔ وہ جب ملک کی وزیراعظم تھیں تو انھوں نے ترکی کی وزیراعظم مادام تانسو چیلر کے ہمراہ اس وقت بوسنیا جانے کا فیصلہ کیا، جب وہاں انتہائی بدامنی تھی اور سربوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر خواتین وزراء اعظم نے سراجیوو کا دورہ کیا، تو ان کے جہاز کو راکٹوں سے اڑا دیا جائے گا۔ دوسری طرف مغربی ممالک بھی نہیں چاہتے تھے مگر ان خطرات کے باوجود محترمہ بے نظیر بھٹو مادام تانسو چیلر کے ہمراہ وہاں گئیں اور پانچ گھنٹے گولیوں کی سنسناہٹ میں دورہ کرتی رہیں اس دورے کی وجہ سے بوسنیا کے حقیقی حالات دنیا کے سامنے آئے اور اقوام متحدہ کی طرف سے بڑے پیمانے پر مسلمانوں کو قتل عام سے بچانے کے لیے کوششیں کی جانے لگیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی اپنی تصنیف 'دختر مشرق' اس بات کی گواہ ہے کہ ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو اپنی نجی اور سیاسی مصروفیات واقدامات کو ان کے ساتھ شیئر کرتے تھے۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ وگرنہ عام طور پر لڑکیوں کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ ان کے ساتھ خاندانی معاملات پر بھی گفتگو کی جائے۔ بھٹو کی زرعی اصلاحات پاکستان کی سیاسی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس حوالے سے پہلی خبر بھی بھٹو نے اپنی بیٹی بے نظیر کو ہی دی تھی۔ وہ اپنی کتاب ''دختر مشرق'' میں بتاتی ہیں ''میں مزید زرعی اصلاحات کا اعلان کرنے والا ہوں'' میرے والد نے رازداری سے کہا۔ وہ ان کی سالگرہ کا دن تھا۔ سہ پہر کے وقت ہم دونوں المرتضیٰ کے باغیچے میں چہل قدمی کر رہے تھے۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بے نظیر بھٹو نہ صرف اپنے عظیم والد کی بیٹی تھیں، بلکہ ان کی رازدار بھی تھیں۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو ایک مذہبی رجحان رکھنے والی خاتون تھیں۔ ان کی پرورش ایک ہمہ جہت ماحول میں ہوئی تھی۔ ایک طرف مغرب کی اعلیٰ تعلیم کے مواقع، مقتدر سوسائٹی کی لبرل زندگی اور دوسری طرف مذہبی اقدار و روایات کا پاس، محترمہ کی زندگی میں یہ دونوں انتہائیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ یکجا نظر آتی ہیں محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی عام مسلمان گھرانوں کی بچیوں کی طرح مدرسے سے آنے والی مولوی صاحب سے قرآن مجید پڑھا۔ ان کی والدہ نصرت بھٹو نے ان کی دینی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو ایک جگہ لکھتی ہیں ''جب میں 9 سال کی ہوئی تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ شامل کرنا شروع کر دیا، وہ چپکے سے میری خواب گاہ میں داخل ہوتیں اور مجھے نماز فجر کے لیے لے چلتیں، ہم دونوں ایک ساتھ وضو کرتے۔'' بچپن میں ان کی تربیت میں جو مذہبی رجحان پیدا ہوا تھا، وہ مغرب میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود برقرار رہا۔ یہ اس تربیت کا اثر تھا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو بطور وزیراعظم اور بعد ازاں اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے بھی ہاتھوں میں تسبیح رکھتیں۔ جس کا مخالفین نے تمسخر بھی اڑایا اور اسے نمائشی عمل قرار دیا حالانکہ یہ ان کی زندگی کا حقیقی رجحان تھا۔ مذہبی حوالے سے محترمہ کس قدر اپنے عقیدے پر پختہ تھیں، اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے 18 اکتوبر 2007ء کو دبئی سے روانہ ہوتے وقت قرآن کے سائے میں رخصت ہونا ضروری سمجھا۔ پھر جب وہ پاکستان آ گئیں تو انھوں نے امام ضامن باندھنا شروع کر دیا۔ 27 دسمبر 2007ء کو جب وہ دہشت گردی کا نشانہ بنیں تو اس وقت بھی انھوں نے امام ضامن باندھ رکھا تھا، محترمہ بے نظیر بھٹو عالمی سطح کی روشن خیال لیڈر ہونے کے باوجود ہر وقت چادر اور دوپٹے میں لپٹی رہتی تھیں حتیٰ کہ غیر ملکی دوروں اور عالمی مسائل پر لیکچرز کے دوران بھی وہ دوپٹے کو اپنے سر سے ہٹنے نہیں دیتی تھیں۔ یہ اس بات کا کھلا اظہار تھا کہ ان کے اندر وجود مشرقی عورت اپنی پوری تہذیبی روایات کے ساتھ موجود ہے۔ غور کیا جائے تو محترمہ بے نظیر بھٹو نے اسلام کے بنیادی اصولوں کو ہر موقع پر اپنائے رکھا۔

انھوں نے مغرب کو اپنی روشن خیالی یا ماڈرن ازم کا یقین دلانے کے لیے اوچھے اور نمائشی ہتھکنڈوں کا سہارا نہیں لیا۔ انھوں نے جینز یا شرٹ پہن کر مغرب کو اپنی جدت کا احساس نہیں دلایا، بلکہ یہ ان کے خیالات اور نظریات تھے، جنھوں نے انھیں ایک سلجھی ہوئی، مہذب، انسانی قدروں پر یقین رکھنے والی اور بین الاقوامی امور کی ماہر شخصیت کا درجہ دیا۔ ان کی ان خوبیوں کا اعتراف ان کے سیاسی مخالفین بھی کرتے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے والد کے قید اور پھانسی کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ قرار دیا ہے۔ یقین واثق ہے کہ اس واقعہ نے ان کے اندر جدوجہد، صبر وضبط اور بے خوفی وجرأت کے اوصاف پیدا کیے۔ کہاں ایک منتخب وزیراعظم کے کروفر اور کہاں کال کوٹھڑی میں اس سے آخری ملاقات یہ سانحہ بڑے بڑوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے، لیکن بھٹو خاندان کے دل میں شاید ایسے سانحات کو برداشت کرنے کی سکت کچھ زیادہ ہی موجود ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی تدفین کے موقع پر نوڈیرو جانے والے بتاتے ہیں کہ اس موقع پر آصف زرداری کی آنکھوں میں تو آنسو دیکھے گئے، مگر بلاول بھٹو زرداری عزم واستقامت اور صبر وضبط کی تصویر بنے رہے ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے گویا ان کے پاس اپنی ماں کے صبر کا اثاثہ موجود تھا۔ جس طرح محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے عظیم والد کی موت پر روایتی بین نہیں ڈالے تھے، اس طرح بلاول بھٹو زرداری بھی یہ المناک سانحہ بڑی ہمت واستقامت سے برداشت کر گئے۔ یہ ضرور ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی بلاول بھٹو زرداری کو اسی طرح اپنے رازوں میں شریک کیا ہوگا، جس طرح ذوالفقار علی بھٹو اپنی بیٹی سے شیئر کیا کرتے تھے۔ محترمہ نے اپنے بیٹے کو جبر اور صبر کی وہ تمام داستانیں سنائی ہوں گی، جو ان پر گزریں۔ یہ انھیں باتوں کا اثر ہوگا کہ بلاول بھٹو زرداری صبر کی تصویر بنے اپنی عظیم ماں کو لحد میں اترتا دیکھتے رہے۔ ایک 19 سالہ بیٹا اپنی ماں سے صبر کی اتنی بڑی طاقت حاصل کر سکتا ہے، تو خود ماں کتنی صابر و شاکر ہوں گی، اس کا اندازہ کرنا کچھ اتنا دشوار بھی نہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شخصیت کا ایک اور پہلو ان کی فرماں برداری ہے۔ انھوں نے اپنی ماں نصرت بھٹو کے ہر فیصلے کو کھلے دل سے قبول کیا، حتیٰ کہ آصف زرداری سے شادی کا فیصلہ بھی نصرت بھٹو کا تھا، جس پر محترمہ بے نظیر بھٹو نے سر تسلیم خم کر دیا۔ بیگم نصرت بھٹو کو معلوم تھا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو ہر کام جلدی میں کرنے کی عادی ہیں لیکن آصف زرداری سے شادی بیگم نصرت بھٹو کی جلدی کے باعث ہوئی، جو یہ چاہتی تھیں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو عملی سیاست میں آنے سے پہلے ازدواجی زندگی کا آغاز کر دیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی زندگی کا پہلا جملہ پہلی سالگرہ والے دن بولا تھا۔ جسے سن کر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی اہلیہ نصرت بھٹو سے کہا تھا کہ ''بچی بہت بڑی مقرر ثابت ہوگی'' بھٹو صاحب کی یہ پیش گوئی آگے چل کر درست ثابت ہوئی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو جس قسم کے چیلنجوں کا سامنا تھا اور جس نوعیت کے خطرات درپیش تھے، ان کی موجودگی میں کوئی عام آدمی اپنی پُرآسائش زندگی کو امتحان میں ڈالنے کا راستہ اختیار نہیں کرتا لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو کے سامنے ایک طرف بھٹو خاندان کی روایات تھیں، تو دوسری طرف زندگی کی ہر نعمت سے بہرہ مند زندگی۔ وہ چاہتیں تو بھٹو خاندان کے سیاسی ورثے کو اگلی نسل تک کے لیے اٹھا رکھتیں اور خود عیش وآرام کی زندگی گزارتیں۔ بلاول بختاور اور آصفہ کے ساتھ ان کی خوبصورت باتوں اور قہقہوں کی موجودگی میں لمحات کو یادگار بناتیں سیاست کی سنگلاخ زندگی کے عذابوں سے محفوظ رہتیں۔ مگر یہ ان کی سرشت ہی میں نہیں تھا۔ جس ماحول میں ان کی تربیت ہوئی تھی، اور جس طرح انھوں نے اپنے عظیم باپ کو آمریت کے سامنے سینہ سپر دیکھا تھا، اس کی وجہ سے ان کے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ چیلنجوں کا سامنا کرنے سے باز آجاتیں۔ 18 اکتوبر 2007ء

کوان پر حملے کے بعد ان کے لیے پھر اس بات کا جواز پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اس خطرناک راستے سے واپس لوٹ جائیں، مگر سب اس بات کے گواہ ہیں کہ اس واقعے نے ان کے پاؤں میں لغزش پیدا کرنے کی بجائے، ان کے استقلال میں مزید استحکام پیدا کر دیا۔ وہ اس واقعہ کے اگلے ہی دن گھر کی چار دیواری کی بجائے عوام میں تھیں اور مردانہ وار حالات کا سامنا کر رہی تھیں۔ 18 اکتوبر سے دسمبر 2007ء تک ان کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے، تو ان پر ایک جنون غالب نظر آتا ہے۔ عوام کے درمیان رہنے اور ملک میں جمہوریت لانے کا جنون۔ یہ شاید اسی جنون کا اثر تھا کہ لیاقت باغ کے جلسہ سے واپس لوٹتے ہوئے وہ عوام کے پُر جوش نعروں کا جواب دینے کے لیے گاڑی کے سن روف سے باہر نکلیں اور گولی کا نشانہ بن گئیں۔ بظاہر ان کا جسم ختم ہو گیا، مگر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گئیں۔ ان کی شخصیت ہر نئے دن کے ساتھ ایک نئے روپ میں ابھرے گی، بالآخر ایک دن ایسا بھی آئے گا، جب لوگ کہیں گے کہ بے نظیر بھٹو حقیقی نہیں افسانوی کردار ہے کیونکہ کسی انسانی کردار کی اتنی پرتیں اور جہتیں نہیں ہوتیں، جتنی بے نظیر بھٹو کی ہیں۔ بھلا کوئی انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے، بھلا کسی عورت میں ایسی جرأت بھی ہو سکتی ہے، بھلا کوئی دولت مند، عوام کے لیے اس طرح جان خطرے میں ڈالتا ہے، بھلا کوئی ماں اپنے بچوں کو چھوڑ کر زندگی کھو جانے کا خطرہ مول لیتی ہے۔ یہ اور نجانے اس قسم کی کتنی باتیں جنم لیں گی اور آنے والی کئی صدیاں ان کے نام کی مالا جپتی رہیں گی۔

(ہفت روزہ زندگی، لاہور 13 تا 19 جنوری 2008ء)

بے نظیر واقعی بے نظیر تھی

(مختصر حالات زندگی)

رفعت خان بنگش

پاکستان کی ناقابل فخر سیاسی تاریخ کے اندھیروں کو پہلے ذوالفقار علی بھٹو کے خون ناحق سے جلنے والے چراغ نے روشن کیا اور اب اس کی بیٹی نے لہو دے کر اسے تاباں کر دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ہاں سباطیہ دختر مصر تاریخ کے دبیز پردوں کو چیرتے ہوئے ایک بار پھر نمودار ہوئی اور پلٹ گئی۔ خاتون مشرق قراۃ العین طاہرہ نے دختر مشرق کے روپ میں ایک جھپ دکھلائی اور لوٹ گئی۔ تاریخ کا یہ عجیب وتیرہ ہے کہ جب کہ ایک کردار سچائی کے لیے، لہو کا غسل نہ کر لے، اسے اپنی آغوش میں نہیں لیتی، جب تک ایک کردار باطل کی تلوار سے اپنا سر نہ کٹا لے اس کے نقوش کف پا کو روشنی نہیں عطا کرتی۔

اس سماج میں جہاں ہر طرف مرد ہی مرد راستہ روکے کھڑے ہوں، کسی خاتون کا نام پیدا کرنا بڑی بات ہوتی ہے۔ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو مردوں کی دست برد سے محفوظ رہا ہو، ایسے میں بے نظیر بھٹو نے نہ صرف خود کو منوایا بلکہ ایک نہیں، دو بار وزیر اعظم بنی، کتنے ہی عالمی اعزاز اس کے حصے میں آئے، دنیا کی کم عمر خاتون وزیر اعظم بن کر اس نے تاریخ میں جگہ بنائی، اسے کس نے قتل کیا، یہ الگ موضوع ہے جس کا یہ محل نہیں، ہمیں آج دیکھنا ہے کہ اس خاتون نے خواتین کو کتنا حوصلہ دیا، اس کے باعث کتنی عورتیں میدان عمل میں آگے آئیں اور انہیں راستہ دکھانے کا فریضہ بھی محترمہ بے نظیر بھٹو نے سرانجام دیا۔

بے شک اس کا باپ اور دادا بڑے آدمی تھے، لیکن کتنی خواتین ایسی جن کے آباء نام ور تھے لیکن وہ خود گوشہ گم نامی میں وقت گزار کر رخصت ہو گئیں، بے نظیر بھٹو نے نامساعد حالات کے باوجود حوصلہ نہیں ہارا، اس کا باپ ایک متنازع مقدمہ میں پھانسی پر جھلا دیا گیا، اس کی والدہ لاٹھیوں کی زد پر رہی اور اس نے اپنے میاں کی دوری کے باوجود حوصلہ نہیں ہارا، یہ خاندان ہی ایسا تھا کہ اس نے ہر عہد میں جمہوریت کے لیے لہو دینے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ والد نے جان دے کر جمہوریت اور انسانی انا کی جو شمع جلائی تھی اسے دو بیٹوں نے اپنا لہو دے کر مزید روشن کر دیا لیکن اب تو انتہا ہو گئی، بڑے بھٹو کی بڑی بیٹی نے اپنی جان دے کر ایسا الاؤ روشن کیا ہے جو رہتی دنیا تک جلتا رہے گا۔ کسی خاتون کا اتنا حوصلہ مند ہونا ایک مثال ہے۔ تاریخ میں ایسی خواتین موجود ہیں جو آزادی کے لیے باقاعدہ لڑیں اور انہوں نے اپنی جان بھی دی لیکن عالمی سطح پر جس طرح کی سازشیں ہمارے حصے میں آئیں اس کی مثال نہیں ملتی اور ایسے میں بے نظیر بھٹو کی شہادت ایسا ہی ایک معاملہ ہے جس پر تادیر لکھا جاتا رہے گا، اس سازش میں کون کتنا شریک تھا، اس پر بھی دفتروں کے دفتر سیاہ ہوں گے لیکن خاتون ہونے کے ناتے انہوں نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے وہ آج کا موضوع

ہیں۔ عالم اسلام کی پہلی کم عمر وزیر اعظم ہونے کے ناتے انہوں نے تیسری دنیا کے ایک پس ماندہ ملک کو دنیا کی تاریخ میں روشن مثال بنا دیا، اس کی تقاریر، ان کے مقالے اور ان کی کتابیں بھی تیسری دنیا کے معاملات سمجھنے کے لیے مغرب کی رہنمائی کرتی رہیں۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ان کی روز شب جدوجہد سے عبارت تھے، ان کی جلاوطنی اور وطن میں آمد سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ عالمی سطح کی خاتون تھیں اور انہوں نے پاکستانی خواتین کا سر نہ صرف بلند کیا بلکہ انہیں سرخرو بھی کیا۔

بے نظیر بھٹو ایک عظیم رہنما تھیں جنہوں نے ملک کی سیاسی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا اور ہمیشہ قومی نصب العین کا ساتھ دیتے ہوئے عالم گیر شہرت کی۔ وہ 21 جون 1953ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو کے گھر پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم لیڈی جینگز نرسری سکول سے حاصل کی۔ اس کے بعد وہ کراچی کے کانونٹ آف جیسز اینڈ میری سکول میں داخل ہوگئیں۔ انہوں نے دو سال تک یہاں سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد وہ راولپنڈی کے کانونٹ سکول میں داخل کرادی گئیں۔ 15 برس کی عمر میں انہوں نے او لیول کا امتحان پاس کرلیا۔ اس کے بعد وہ اے لیول کی تعلیم مکمل کرنے کے لیے کراچی کے گرامر سکول میں داخل کرادی گئیں۔

بعد میں اعلیٰ تعلیم کے حصول لیے امریکہ چلی گئیں۔ 1969ء سے 1973ء تک انہوں نے ریڈکلف کالج اور ہارورڈ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ سب سے بڑی بیٹی ہونے کے ناتے وہ اپنے والد کے بہت قریب تھیں۔ بھٹو مرحوم شملہ معاہدہ کے موقع پر بے نظیر بھٹو کو ساتھ لے گئے تھے۔

تعلیم کے اگلے مرحلے کے لیے وہ برطانیہ گئیں۔ جہاں آکسفورڈ یونیورسٹی سے انہوں نے ''بین الاقوامی قانون اور ڈپلومیسی'' کا کورس کیا۔ 1973ء سے 1977ء تک انہوں نے آکسفورڈ ہی کے ایک کالج ''لیڈی مارگریٹ ہال'' سے فلسفہ، سیاسیات اور معاشیات کی تعلیم حاصل کی۔ دسمبر 1976ء میں وہ آکسفورڈ یونین کی صدر بھی منتخب ہوئیں۔

5 جولائی 1977ء کو جب فوج کے سربراہ جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ تو بے نظیر بھٹو کی والدہ بیگم نصرت بھٹو نے پارٹی قیادت سنبھال لی۔ کچھ عرصے بعد ذوالفقار علی بھٹو کے بیٹے شاہ نواز بھٹو فرانس میں پراسرار طور پر ہلاک ہوگئے۔

اس دوران بے نظیر بھٹو نے تعلیم مکمل کی اور پاکستان آگئیں۔ حکومت نے انہیں گھر میں نظر بند کر دیا جس کے بعد 1984ء میں حکومت نے انہیں برطانیہ جانے کی اجازت دے دی۔ اب انہوں نے پارٹی قیادت سنبھال لی تھی۔ 1987ء میں ان کی شادی کراچی میں آصف علی زرداری سے ہوئی۔

ان کا ایک بیٹا بلاول اور دو بیٹیاں آصفہ اور بختاور ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے بعد 16 نومبر 1988ء کو پہلے جماعتی انتخابات کے نتیجے میں وہ پاکستان کی پہلی خاتون وزیر اعظم بنیں۔ اس منصب پر وہ دو بار فائز ہوئیں۔ انہوں نے پہلی بار 2 دسمبر 1988ء میں وزارت عظمیٰ کا حلف اٹھایا۔

1988ء میں انسانی حقوق کی خدمات پر (Brund Kroisky) ایوارڈ سے نوازی گئیں۔ 1989ء میں ایک بین الاقوامی ادارے ''لبرل انٹرنیشنل'' نے انہیں فریڈم پرائز دیا۔ ریڈکلف کی طرف سے انہیں (Phi Beta) ایوارڈ بھی 1989 میں دیا گیا۔ مراکش کا سب سے

بڑا ایوارڈ (Grand Cordon De Wissan Alaoui) بھی انہوں نے اسی برس حاصل کیا۔

صدر غلام اسحاق خان نے ان کی حکومت کو کرپشن کے الزامات کے تحت برطرف کر دیا۔ 1990 میں یونی فیم کی طرف سے The Noel Award Foundation حاصل کیا۔

1993ء میں وہ دوبارہ انتخابات جیت کر وزیر اعظم بنیں۔ ان کے دور حکومت میں صدارتی انتخابات کے نتیجے میں پیپلز پارٹی ہی کے ایک رہنما سردار فاروق احمد خان لغاری ملک کے صدر بن گئے۔ بے نظیر بھٹو انہیں پارٹی کا سب سے وفادار کارکن قرار دیتی تھیں۔ لاس اینجلس امریکہ کے میئر کی طرف سے 1995 میں شہر کی اعزازی چابی انہیں دی گئی۔ 1996ء میں فاروق لغاری نے مختلف الزامات عائد کرتے ہوئے ان کی حکومت برطرف کر دی۔ اس سے قبل ان کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کو کراچی میں ان کے بنگلے سے تھوڑی ہی دور ایک پولیس مقابلے میں قتل کر دیا گیا۔ بے نظیر بھٹو اس قتل کی ذمہ داری پر اسرار قوتوں پر ڈالتی تھیں۔ گنز بک آف ورلڈ ریکارڈ 1996ء میں بے نظیر کو دنیا کی پہلی پچاس اہم خواتین میں شامل کیا گیا۔ ٹوکیو کی The Gakhushuin Honorary Award انہیں 1996 میں دیا گیا۔ بوسینا کے صدر کی طرف سے Golden Medal Daragon of Bosnia Award بھی انہیں 1996ء میں دیا گیا۔ اپنی حکومت کے دوران انہوں نے خواتین کی فلاح و بہبود اور ان کی صحت کے حوالے سے اہم پالیسیاں بنائیں۔ انہوں نے عورتوں کے خلاف کئی ایک امتیازی قوانین بھی ختم کیے۔ وہ خواتین کے لیے الگ سے پولیس اسٹیشن، عدالتیں اور ترقیاتی بنک قائم کرنے کا منصوبہ رکھتی تھیں تاہم اپنے ادوار حکومت میں وہ اپنے منصوبے کے تمام پہلوؤں پر عمل درآمد نہ کر سکیں۔

انھی کے دور حکومت میں 1996ء میں ہمسایہ ملک افغانستان میں طالبان نے ملک کا کنٹرول سنبھال لیا۔ کہا جاتا ہے کہ طالبان کے قیام میں بے نظیر بھٹو کا اہم کردار تھا۔ ان کے خیال میں صرف طالبان جیسی قوت ہی برسوں کی جنگ اور خانہ جنگی کے نتیجے میں تباہ حال ملک میں امن و امان قائم کر سکتی ہے۔ اسی طرح ان کا خیال تھا کہ طالبان کے اقتدار کی صورت میں پاکستان کے وسط ایشیائی ریاستوں تک روابط مستحکم ہوں گے۔ بے نظیر بھٹو کا دعویٰ تھا کہ ان کی حکومت طالبان کی مالی اور عسکری مدد کرتی رہی۔ حتیٰ کہ پاکستانی فوج بھی افغانستان میں بھیجی گئی۔ ان کے دوسرے دور اقتدار ہی میں ان کے دوسرے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو بھی کراچی میں قتل کر دیے گئے۔

میاں نواز شریف کے دوسرے دور حکومت میں وہ قائد حزب اختلاف کا کردار ادا کرتی رہیں۔ اس دوران ان پر کرپشن سمیت کئی مقدمات قائم ہوئے۔ 1998ء میں وہ دوبئی چلی گئیں جہاں انہوں نے جلاوطنی کی زندگی گزارنا شروع کر دی۔ اس دوران وزیر اعظم نواز شریف کی حکومت برطرف کر دی گئی۔ برطرفی کے بعد نواز شریف بھی سعودی عرب میں جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس دوران بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کے درمیان پاکستان عسکری حکومت کے خلاف جدوجہد پر اتفاق ہو گیا۔ دو دو بار ملک کے وزیر اعظم رہنے والے دونوں قائدین کے درمیان "میثاق جمہوریت" کے نام سے ایک معاہدہ بھی طے پا گیا تھا۔ 2000ء میں انہوں نے امریکن اکیڈمی ایوارڈ حاصل کیا۔ اگرچہ 2002ء کے انتخابات میں بے نظیر بھٹو ملک میں آ کر اپنی پارٹی کی قیادت نہ کر سکیں تاہم ان کی غیر موجودگی میں بھی ان کی پارٹی نے 28.42 فی صد ووٹ حاصل کیے۔ 18 اکتوبر 2007ء کو بے نظیر بھٹو پاکستان واپس آ گئیں۔ قومی مفاہمت آرڈی نینس کے مطابق ان کے خلاف کرپشن سمیت دیگر تمام

مقدمات واپس ہو گئے تھے۔ جمہوریت کی بحالی کے لیے ان کے جدوجہد جاری رہی۔ 2008ء کے عام انتخابات میں وہ بھرپور انداز میں شرکت کا ارادہ رکھتی تھیں۔ ان کی جماعت نے پورے ملک میں سب سے زیادہ امیدوار کھڑے کیے۔ انہیں بھرپور یقین تھا کہ اگلی حکمران وہی ہوں گی۔ تاہم ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ''

(روزنامہ ایکسپریس لاہور 30 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

بینظیر بھٹو کا دنیا کی 50 خوبصورت خواتین میں شمار ہوتا تھا

بابا کی ''پنکی'' سے شہید بی بی تک

(دختر مشرق کا مختصر سوانحی خاکہ اور بچپن کی خوشگوار یادیں)

محمد ہارون عباس قمر

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن اور سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو 21 جون 1953ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں، انہوں نے پرائمری تعلیم لیڈی جینگز نرسری سکول اور کنوینٹ آف جیوزز اینڈ میری کراچی سے حاصل کی، راولپنڈی پریزنٹیشن میں دو سال گزارنے کے بعد وہ مری میں جیوزز اینڈ میری کنوینٹ مری چلی گئیں، انہوں نے او لیول کا امتحان پندرہ سال کی عمر میں پاس کیا جبکہ اس کے بعد انہوں نے اے لیول کراچی گرائمر سکول سے مکمل کیا۔

اعلیٰ تعلیم کے لئے وہ بیرون ملک چلی گئیں جہاں برطانیہ اور امریکہ میں انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔

18 دسمبر 1987ء کو آصف علی زرداری سے ان کی شادی ہوئی 1988ء میں پہلی اور 1993ء میں دوسری مرتبہ وزیر اعظم بنیں۔ 1998ء میں دبئی چلی گئیں 10 سال بعد 18 اکتوبر 2007ء کو وطن واپس آئیں۔ بے نظیر بھٹو اپنے باپ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کی پنکی اور سیاسی میدان کی بی بی کہلائیں۔ 1976ء میں وہ آکسفورڈ یونین کی صدر منتخب ہوئیں۔ 18 دسمبر 1987ء کو ان کی شادی آصف علی زرداری سے ہوئی، وہ پہلی مرتبہ 1988ء میں جبکہ دوسری مرتبہ 1993ء میں ملک کی وزیر اعظم بنیں۔

18 اکتوبر کو وطن واپسی پر ان کے استقبالی جلوس پر خودکش حملہ ہوا تاہم اس دوران وہ محفوظ رہیں، جبکہ 27 دسمبر 2007ء کو وہ لیاقت باغ میں ہونے والے خودکش دھماکے اور فائرنگ کے نتیجے میں جاں بحق ہو گئیں۔

انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں جبکہ ان کی زندگی پر بھی مختلف مصنفین نے کتابیں تصنیف کیں۔

بے نظیر بھٹو اسلامی دنیا کی پہلی خاتون وزیر اعظم تھیں وہ 2 مرتبہ وزیر اعظم رہیں۔

1969ء سے 1973ء تک وہ ریڈکلف کالج اور ہارورڈ یونیورسٹی میں پڑھتی رہیں جہاں انہوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کی جبکہ انہوں نے اپنی تعلیم کا اگلا مرحلہ برطانیہ میں مکمل کیا۔ 1973ء سے 77ء کے درمیان محترمہ بے نظیر بھٹو نے لیڈی مارگریٹ ہال آکسفورڈ میں سیاسیات، اقتصادیات اور فلسفے کی تعلیم حاصل کی جبکہ انہوں نے بین الاقوامی قانون اور ڈپلومیسی کے حوالے سے کورس آکسفورڈ یونیورسٹی سے مکمل کیا

جبکہ 1976ء میں وہ آکسفورڈ یونین کی صدر منتخب ہوگئیں اور وہ پہلی ایشیائی خاتون تھیں جو آکسفورڈ یونین کی سربراہ بنیں جبکہ 18 دسمبر 1987ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو کی کراچی میں آصف علی زرداری کے ساتھ شادی ہوگئی۔

بے نظیر بھٹو کے تین بچے جن میں بلاول زرداری، بختاور زرداری اور آصفہ شامل ہیں۔ بے نظیر بھٹو کے والد سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو تھے جبکہ انہیں 1975ء میں احمد رضا قصوری کے قتل کے الزام میں برطرف کردیا گیا اور بعدازاں انہیں پھانسی دی گئی۔

انہیں 4 اپریل 1979ء کو پھانسی دی گئی جبکہ اس دوران بے نظیر بھٹو اور ان کی والدہ کو حراست میں رکھا گیا۔ 1980ء میں بے نظیر بھٹو کے بھائی شاہنواز بھٹو کو قتل کردیا گیا جبکہ 1996ء میں ان کے دوسرے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو کو بھی قتل کردیا گیا۔

بے نظیر بھٹو اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان میں واپس آئیں تو انہیں گھر میں نظر بند کردیا گیا جبکہ 1984ء میں انہیں برطانیہ جانے کی اجازت دی گئی۔ 16 نومبر 1988ء کو بے نظیر بھٹو نے ملک میں ہونے والے انتخابات میں حصہ لیا اور ان کی پارٹی نے قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کی اور بے نظیر ملک کی وزیراعظم بن گئیں اور انہوں نے 2 دسمبر 1988ء کو وزیراعظم کے عہدے کا حلف اٹھایا وہ ملک اور اسلامی دنیا کی پہلی خاتون وزیراعظم بن گئیں اس وقت ان کی عمر 35 سال تھی جبکہ 1989ء میں انہیں لبرل انٹرنیشنل کی طرف سے پرائز فار فریڈم عطا کیا گیا۔

1990ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت کرپشن کے الزامات کے تحت برطرف کردی گئی جبکہ اس کے بعد نواز شریف حکومت میں آئے تاہم 1993ء میں بے نظیر بھٹو دوبارہ ملک کی وزیراعظم بن گئیں لیکن 3 سال بعد ہی ان کی حکومت کرپشن اسکینڈل کے الزامات کے تحت برطرف کردی گئی۔ جس کے بعد ایک مرتبہ پھر نواز شریف ملک کے وزیراعظم بنے اور بے نظیر بھٹو نے اپوزیشن لیڈر کے طور پر اپنا کردار ادا کیا جبکہ 1998ء میں بے نظیر بھٹو دبئی چلی گئیں۔

بے نظیر بھٹو پر اس دوران کرپشن کے الزامات بھی لگائے گئے جبکہ دس سالہ جلاوطنی کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو 18 اکتوبر 2007ء کو وطن واپس آئیں اور جناح انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اتریں لیکن جب ان کا جلوس راستے میں تھا تو کارساز کے مقام پر ان کے استقبالی جلوس پر خودکش حملہ کیا گیا جس کے نتیجے میں 140 افراد جاں بحق اور 450 سے زائد زخمی ہوگئے تھے جبکہ جاں بحق ہونے والوں میں بے نظیر بھٹو کے سیکورٹی گارڈز بھی شامل تھے تاہم بے نظیر بھٹو اس حملے میں مکمل طور پر محفوظ رہیں جبکہ اس کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو کو قتل کی دھمکیاں وغیرہ ملتی رہیں بے نظیر بھٹو کے وکیل سینیٹر فاروق ایچ نائیک کا کہنا تھا کہ انہیں خط موصول ہوا ہے جس میں بے نظیر بھٹو کو قتل کرنے کی دھمکی دی گئی جبکہ 27 دسمبر کو جمعرات کی شام محترمہ بے نظیر بھٹو جب راولپنڈی کے لیاقت باغ میں انتخابی مہم کے حوالے سے اپنا جلسہ ختم کرکے نکلنے لگیں تو اس دوران نامعلوم مسلح افراد نے ان پر فائرنگ کردی جس کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو شدید زخمی ہوگئیں جس پر انہیں جنرل ہسپتال راولپنڈی میں منتقل کیا گیا۔

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ گولی ان کی گردن اور سر میں لگی، جس سے ان کی سانس بند ہوگئی، ڈاکٹروں نے ان کی جان بچانے کی سرتوڑ کوشش کی تاہم وہ جانبر نہ ہوسکیں اور خالق حقیقی سے جاملیں جبکہ پیپلز پارٹی کے سیکرٹری خزانہ سینیٹر ڈاکٹر بابر اعوان نے بے نظیر بھٹو کے جاں بحق ہونے کی تصدیق کی اس سے پہلے ان کے شوہر آصف علی زرداری نے ایک نجی ٹی وی چینل سے گفتگو کے دوران بتایا تھا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو گولی لگنے سے

شدید زخمی ہوگئی ہیں اور ان کی حالت انتہائی تشویشناک ہے اس لئے عوام ان کی زندگی کے لئے دعا کریں۔

بے نظیر بھٹو نے مختلف کتابیں بھی لکھیں جن میں ان کی انگریزی زبان میں لکھی گئی کتاب ''دی گیدرنگ سٹار، ڈاٹر آف دی ایسٹ، ڈاٹر آف ڈیسٹنی اور ہسپانوی زبان میں لکھی گئی کتاب ''ہجادی اور بیٹے'' شامل ہیں جبکہ بے نظیر بھٹو کی زندگی پر بھی مختلف لوگوں نے کتابیں لکھیں جن میں ڈبلیو ایف ہیپر کی ''بے نظیر بھٹو''، رفیق ڈکریا کی ''دی ٹرائبل آف بے نظیر''، کیتھرین ایم ڈوھرٹی کی ''بے نظیر بھٹو''، ڈبلیو ایچ ایلن کی ''بایوگرافیہ آف بے نظیر بھٹو''، ایلزبتھ بوچلڈ کی ''بے نظیر بھٹو وزیراعظم''، اقبال اخوند ''ٹرائل اینڈ ایرر''، ''بے نظیر بھٹو حکومت پہلا دور کیا کھویا کیا پایا''، مرسڈیز اینڈرسن کی ''بے نظیر بھٹو، خاتون سیاست میں'' اور میری اسنگر کی ''پاکستانی وزیراعظم اور کارکنان'' شامل ہیں۔

پیپلز میگزین نے بے نظیر بھٹو کو دنیا کی 50 خوبصورت خواتین میں سے قرار دیا۔

بے نظیر بھٹو پر طویل جلاوطنی کے بعد تین مہینوں کے اندر دو حملے کیے گئے جبکہ ان کے باپ کو سولی پر چڑھایا گیا تھا۔ ماں بیماری کے باعث پس منظر میں چلی گئیں، ایک بھائی بہن کے دور حکومت میں سرعام قتل کر دیا گیا اور ایک بھائی نے فرانس میں پراسرار طور پر دنیا سے منہ موڑ لیا۔ شوہر کو سیاسی طور پر ایک متنازعہ شخصیت بنا دیا گیا اور خود کو دو مرتبہ وزیراعظم بننے کے باوجود 8 سال تک خود ساختہ جلاوطنی اختیار کرنی پڑی، بے نظیر بھٹو اپنے باپ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو کی پنکی اور سیاسی میدان کی بی بی کہلائیں۔ جس طرح پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں اسی طرح سیاسی پنڈتوں نے یہ جان لیا تھا کہ ایشیاء کے ایک بڑے سیاسی رہنما کی بیٹی مستقبل کی سیاستدان ہوں گی۔ پنکی اب محترمہ بے نظیر بھٹو بننے کے سفر پر نکل چکی تھیں یہ وہی زمانہ تھا جب ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو پاکستان میں صاحب اقتدار تھے مگر پھر حالات بدلے مسٹر بھٹو کی حکومت جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں ختم ہوگئی اور 1979ء میں ذوالفقار علی بھٹو پھانسی چڑھا دیئے گئے اور یوں بھٹو خاندان کا شیرازہ بکھرنے لگا سبھی ملک سے باہر چلے گئے۔

پہلے والدہ نصرت بھٹو نے پارٹی کی کمان سنبھالی لیکن بعد میں یہ کمان بے نظیر بھٹو کے ہاتھوں میں آ گئی، ملک سے باہر بیٹھ کر وہ پارٹی بھی چلاتی رہیں اور ملک میں مارشل لاء کے کارناموں کا مشاہدہ بھی کرتی رہیں۔ 1985ء میں ضیاء الحق نے بظاہر مارشل لاء ختم کر دیا تو طویل جلاوطنی کے بعد اپریل 1986ء میں بے نظیر بھٹو وطن واپس آ گئیں، عوام کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر نے ان کا استقبال کیا۔

انہوں نے ملک بھر کا دورہ کیا اور عوام ایک مرتبہ پھر سیاست کے میدان میں آ گئے اور اگست 1988ء میں ضیاء الحق کا طیارہ تباہ ہونے کے ساتھ ہی ایک غیر عوامی دور ختم ہوگیا، عام طور پر خیال تھا کہ بے نظیر بھٹو کی قیادت ولولہ انگیز قیادت ہوگی، سیاست کے فرسودہ اصولوں سے نجات اور ملک ترقی اور روشن خیالی کے نئے دور میں داخل ہو جائے مگر دسمبر 1988ء میں سادہ اکثریت حاصل ہونے والی حکومت شوہر آصف علی زرداری اور کچھ ساتھیوں کی مبینہ کرپشن کی وجہ سے 6 اگست 1990ء کو ختم ہوگئی۔ 18 جولائی 1993ء کو ایک مرتبہ پھر اقتدار کا ہما بے نظیر بھٹو کے سر بیٹھا مگر 5 نومبر 1993ء کو ملنے والے اقتدار کی بساط 5 نومبر 1996ء کو لپیٹ دی گئی، الزامات وہی پرانے تھے، یعنی کرپشن اور اقربا پروری۔

ملک کی سیاست پر اس وقت سب سے بڑا نام محترمہ بے نظیر بھٹو کا تھا تاہم 27 دسمبر کو بے نظیر بھٹو کے جاں بحق ہونے کے نتیجے میں ذوالفقار علی بھٹو کے خاندان کا ایک اور فرد سیاست کے راستے میں زندگی کی جنگ ہار گیا۔

ایک نظر بینظیر کی سیاسی زندگی پر

سابق وزیراعظم بےنظیر بھٹو جب 18 اکتوبر 2007ء کو کراچی ائیر پورٹ پر اتریں تو گزشتہ آٹھ سال میں یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے اپنی سرزمین پر قدم رکھا۔

1979ء: چار اپریل کو پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی چیئرمین اور سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ملک کے فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق کے حکم پر پھانسی چڑھا دیا گیا۔

1986ء: دس اپریل کو بےنظیر بھٹو اپنی جلاوطنی کے بعد جب لاہور پہنچیں تو ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ سے زائد افراد ان کے استقبال کے لئے لاہور کی سڑکوں پر آئے۔

1988ء: سولہ نومبر کو ہونے والے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی نے شاندار کامیابی حاصل کی اور قومی اسمبلی میں سب سے بڑی جماعت کے طور پر ابھری۔

1988ء: دو دسمبر کو بےنظیر بھٹو نے پاکستان کی پہلی خاتون وزیراعظم کے طور پر حلف اٹھایا۔

1990ء: اگست میں صدر غلام اسحاق خان نے اسمبلیاں تحلیل کر دیں اور بےنظیر بھٹو کی حکومت کو برخاست کر دیا۔ بےنظیر کے خاوند آصف علی زرداری کو اغواء کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

1990ء: اکتوبر کو ہونے والے عام انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی ہار گئی اور اسے اپوزیشن میں بیٹھنا پڑا۔ بےنظیر بھٹو کو قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف چنا گیا۔

1993ء: اکتوبر میں ہونے والے انتخابات میں پی پی پی نے کامیابی حاصل کی اور بےنظیر بھٹو دوسری بار وزیراعظم بن گئیں۔

1996ء: اکتوبر میں صدر فاروق احمد لغاری نے بےنظیر بھٹو کی دوسری حکومت کو کرپشن اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے الزامات کے تحت ختم کر دیا۔ آصف علی زرداری کو ایک بار پھر گرفتار کر لیا گیا۔

1999ء: اپریل میں لاہور ہائی کورٹ نے بےنظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کو سیکنڈ اور ایس ای ایس کیس میں سزا سنائی۔ دو سال بعد سپریم کورٹ نے یہ سزا ختم کر دی۔

1999ء: اپریل میں ہی بےنظیر بھٹو نے جلاوطنی اختیار کی۔ اس دوران انہوں نے اپنا زیادہ تر وقت لندن اور دبئی میں گزارا۔

1999ء: 21 اکتوبر کو نواز شریف کی حکومت کو ختم کر کے جنرل پرویز مشرف نے اقتدار سنبھالا۔

2002ء: جولائی کو ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے تیسری مرتبہ وزیراعظم منتخب ہونے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ بظاہر اس آرڈیننس کا مقصد سابق وزرائے اعظم نواز شریف اور بےنظیر بھٹو کا اقتدار میں آنے کا راستہ روکنا تھا۔

2003ء: جولائی میں ایک سوئس عدالت نے بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کو منی لانڈرنگ کے ایک مقدمے میں چھ ماہ کی سزا سنائی۔ بعد میں اپیل پر عدالت نے سزا ختم کر دی۔

2006ء: جنوری میں انٹرپول نے پاکستانی حکومت کی ایک درخواست پر بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کے خلاف بین الاقوامی ریڈ نوٹس جاری کر دیئے۔

2007ء: 14 ستمبر کو پی پی پی قیادت نے اعلان کیا کہ بے نظیر بھٹو 18 اکتوبر کو وطن واپس پہنچیں گی۔

2007ء: چار اکتوبر کو صدر مشرف نے بے نظیر بھٹو کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت قومی مفاہمتی آرڈیننس جاری کر دیا۔

2007ء: بارہ اکتوبر کو سپریم کورٹ نے سابق وفاقی وزیر مبشر حسن، سابق بیوروکریٹ روئیداد خان اور قاضی حسین احمد کی درخواستوں پر مفاہمتی آرڈیننس کے تحت ملنے والی رعایت کو عدالتی فیصلے سے مشروط کر دیا۔

(روزنامہ ''خبریں'' 6 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

میری زندگی

محترمہ بے نظیر بھٹو کی کتاب ''دختر مشرق'' سے دلچسپ اقتباسات

اخذ و تلخیص: لائبہ خان

ہماری خاندانی تاریخ میں المرتضیٰ کا حوالہ انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ میرے والد اور ان کی تین ہمشیرگان یہیں پیدا ہوئیں۔

اگرچہ المرتضیٰ کی جدید کاری نے پرانے گھر کی ہیئت کو تبدیل کر دیا ہے، تاہم المرتضیٰ ہی بھٹو خاندان کا قدیم اور اصلی گھر محسوس ہوتا ہے۔

سامنے کا دروازہ نیلی اور سفید ٹائلوں سے مزین کیا گیا ہے۔ ان ٹائلوں کا ڈیزائن دراصل 2500 ق م میں اس علاقے میں پھلنے پھولنے والی موہنجوداڑو کی عظیم تہذیب کی جدید شکل ہے جس میں سندھی تہذیب کے زمانے کے مردوں اور عورتوں کے طرز زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ بچپن میں میرا خیال تھا کہ اس قدیم شہر کو ''موہنجوداڑو'' اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اس لفظ کا مطلب ہی سندھی زبان میں ''میری جگہ'' ہوتا ہے۔ میرے بھائیوں، بہن اور مجھے اس بات پر ہمیشہ فخر رہا کہ ہم موہنجوداڑو کے سائے میں پلے بڑھے ہیں۔ ہم دریائے سندھ کے کنارے پر رہائش پذیر ہیں جو اوائل زمانہ سے ہماری زمینوں کو سیراب کرتا ہے۔ کسی دوسری جگہ ماضی سے تسلسل کا ایسا رشتہ ہم نے محسوس نہیں کیا کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد کا تعلق 712ء میں مسلمانوں کے ہندوستان پر حملہ کرنے کے ساتھ براہ راست بنتا ہے۔ ہمارے اجداد میں ایک فرد کی ڈائری میں خاندان کے بارے میں پوری تفصیلات درج تھیں جو میرے پردادا کے زمانہ میں ایک بہت بڑے سیلاب کی نذر ہو گئیں۔ لیکن بچپن ہی سے ہمیں بتایا گیا کہ یا تو ہم ہندوستان کی جنگجو نسل راجپوت سے تعلق رکھتے ہیں جو مسلمانوں کو حملہ کے وقت مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے اور یا ان فاتح عربوں کی اولاد میں سے ہیں جو ہمارے آبائی صوبہ سندھ میں سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ اسی لیے سندھ کو ''باب الاسلام'' کا نام دیا جاتا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں لاکھوں افراد بھٹو قبیلے میں شامل ہیں۔ سندھ کا یہ سب سے بڑا قبیلہ ہے جس میں چھوٹے کسان بھی ہیں اور بڑے بڑے زمیندار بھی۔ ہمارا خاندان بھٹو قبیلے کے مشہور مورث اعلیٰ سردار ڈودو خان کی براہ راست اولاد میں سے ہے۔ اپر سندھ یعنی بالائی سندھ کے متعدد دیہات، میر پور بھٹو جہاں چچا ممتاز کا خاندان آباد ہے اور گڑھی خدا بخش بھٹو جہاں ہمارے خاندان کا قبرستان واقع ہے۔ ہمارے اجداد کے ناموں سے معروف ہیں جن کی زیادہ تر صوبے میں ارضی ملکیت تھی اور جو سیاست میں سینکڑوں برسوں سے حاوی چلے آ رہے تھے۔ میرے بڑوں نے نوڈیرو میں گڑھی خدا بخش بھٹو کے نزدیک ایک گھر اپنی تحویل میں رکھا ہوا تھا۔ جہاں عید کے دنوں میں میرے والد اور بھائی پکے ہوئے میٹھے چاول اور عرق گلاب سے معطر پانی روایتی تحفہ کے طور پر مہمانوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ لیکن میرے دادا کے وقتوں سے خاندان میں مرکزی

حیثیت لاڑکانہ کے المرتضیٰ کو حاصل ہوگئی تھی۔

1958ء کی پہلی زرعی اصلاحات سے قبل بھٹو خاندان ہی کے پاس صوبے کے باریوں کی سب سے بڑی تعداد ملازم تھی۔ سندھ میں ہماری زمینیں دوسرے زمینداروں کی طرح ایکڑوں میں نہیں، مربع میلوں میں ناپی جاتی تھیں۔ بچپن میں ہم 1843ء میں سندھ کے برطانوی فاتح چارلس نیپیئر کی حیرت کی کہانی مزے لے لے کر سنا کرتے تھے "یہ زمینیں کس کی ہیں؟" وہ وقفے وقفے سے سندھی زمینوں کے دورے کے دوران اپنے ڈرائیور سے پوچھا کرتے تو برجستہ جواب ملتا "بھٹو کی زمینیں" اس نے ڈرائیور کو حکم دیا "جب بھٹو کی زمینیں ختم ہو جائیں تو مجھے جگا دینا" کچھ عرصے بعد جب اس کی آنکھ خود ہی کھل گئی تو اس نے پوچھا "ان زمینوں کا کون مالک ہے؟" تو ڈرائیور کا جواب سن کر حیرت زدہ رہ گیا "بھٹو ہی مالک ہے"۔

میرے دادا سر شاہنواز نے سب سے پہلے بھٹو خاندان میں جاگیردارانہ ذہنیت ختم کرنے کی ابتداء کی کیونکہ یہ چیز معاشرے کے ایک بڑے حصے کو تباہ کر رہی تھی۔ ان کے وقتوں تک بھٹو افراد کی شادیاں بھٹو خاندان ہی میں ہوتی تھیں یعنی چچا زادوں یا ماموں زادوں میں یا ان کی اولادوں میں۔ اسلام میں عورتیں بھی جائیداد کی وراثت کی حقدار ہیں اور زمین کو خاندان ہی میں رکھنے کا طریقہ یہی تھا کہ خاندان ہی میں شادی کی جائے۔ ایسی ہی ایک مطلوبہ شادی میرے والد اور ان کی فرسٹ کزن امیر بیگم میں ہوئی۔ جب وہ ابھی بارہ سال کے تھے اور امیر بیگم ان سے آٹھ یا نو سال بڑی۔ انہوں نے اس شادی پر مزاحمت کی مگر میرے دادا نے انگلستان سے کرکٹ سیٹ منگوا کر دینے کا لالچ دے کر ان کو راضی کر لیا۔ ان کی شادی کے بعد امیر اپنے خاندان میں رہنے کے لئے واپس چلی گئیں اور میرے والد سکول میں جس نے ان کے ذہن پر اس ناانصافی کا پختہ اثر مرتسم کیا خصوصاً عورتوں کے بارے میں ان پر خاندانی شادیوں کا جبر کا۔ اپنے بچوں کو تعلیم دلوا کر سر شاہ نواز نے دوسرے سندھی جاگیرداروں کے لئے ایک مثال قائم کرنے کی کوشش کی۔

اپنے ہم پایہ دوستوں کے بھویں چڑھانے کے باوجود انہوں نے میرے والد کو وطن سے دور تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا۔ میرے والد نے بھی اس ضمن میں انہیں مایوس نہیں کیا۔ انہوں نے نہ صرف برکلے میں کیلیفورنیا یونیورسٹی سے آنرز میں گریجوایٹ کیا بلکہ آکسفورڈ میں کرائسٹ چرچ میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پاکستان میں وکالت کرنے سے قبل لنکنز ان سے بار ایٹ لاء بھی کیا۔

ہمارے مردانہ غلبہ زدہ کلچر میں لڑکوں کو ہمیشہ ہی لڑکیوں پر ترجیح دی جاتی تھی اور نہ صرف انہیں اکثر تعلیم ہی سے محروم رکھا جاتا بلکہ بعض مرتبہ اتنی انتہا بھی کی جاتی کہ لڑکوں کو کھانا بھی پہلے دیا جاتا جب کہ ماں اور بیٹیاں انتظار کرتیں۔ تاہم ہمارے خاندان میں ایسی کوئی تفریق نہیں تھی۔ مجھے سب سے زیادہ توجہ ملتی۔ چاروں میں سب سے بڑی میں 21 جون 1953ء کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ میرے جلد گلاب کی طرح سرخ ہونے کی بنا پر میرا نام "پنکی" پڑ گیا۔ میرا بھائی میر مرتضیٰ میرے ایک سال بعد پیدا ہوا۔ صنم 1957ء میں اور بے بی شاہ نواز 1958ء میں۔ بڑی ہونے کے ناطے آغاز ہی سے گھر میں میری مخصوص اور الگ حیثیت تھی۔ میری عمر چار سال تھی اور والد کی 28 سال جب پریذیڈنٹ اسکندر مرزا نے میرے والد کو اقوام متحدہ میں بھیجا۔ میرے والد کی بعد ازاں صدر ایوب خان کی کابینہ میں تقرری بطور وزیر تجارت ہوئی، پھر وزیر توانائی بنے اور پھر وزیر خارجہ۔ وہ اکثر اقوام متحدہ میں پاکستانی وفود کے سربراہ کے بطور شریک ہوئے۔ اس سات سالہ دور نے انہیں اور والدہ کو زیادہ عرصہ گھر سے دور رہنے پر مجبور

کر دیا۔ میں نے اپنے والد کو اخبارات کے پہلے صفحات کی زینت بنتے دیکھا اور اسی طرح اقوام متحدہ میں پاکستان اور تیسری دنیا کے ممالک کی حمایت میں دلیلیں دیتے ہوئے۔

میری والدہ عام طور پر ان کے ساتھ سفر کرتیں۔ بچوں کو گھر میں گھریلو عملہ کے پاس چھوڑ دیتیں اور مجھے تنبیہ کے انداز میں کہتیں "دوسرے بچوں کا خیال رکھو تم سب سے بڑی ہو۔" میں فقط آٹھ سال کی تھی جب مجھے گھر کی نگہداشت کا چارج سنبھالنا پڑا جبکہ میرے والدین گھر سے دور تھے۔ میری والدہ خوراک اور گھر کی دوسری ضروریات کے لئے مجھے پیسے دے جاتیں جو میں اپنے تکیے کے نیچے چھپا دیتی۔

ہمارے گھر میں سب سے زیادہ ترجیح تعلیم کو حاصل تھی۔ اپنے والد کی طرح میرے والد ہمیں تعلیم یافتہ اور ترقی پسند پاکستانیوں کی اگلی نسل میں ایک مثال کے طور پر شامل کرنا چاہتے تھے۔ تین سال کی عمر میں مجھے لیڈی جیننگز کے نرسری سکول میں بھیجا گیا۔ پھر پانچ سال کی عمر میں کراچی کے اعلیٰ ترین مدرسوں میں یعنی کانونٹ آف جیسس اینڈ میری میں۔ کانونٹ میں ذریعہ تعلیم انگریزی تھا اور یہی زبان ہم گھر پر بھی زیادہ تر بولتے تھے۔ بجائے والدین کی مقامی زبانوں یعنی سندھی یا فارسی کے یا قومی زبان اردو کے۔

"میرا تم سے صرف ایک ہی سوال ہے کہ تم اپنی پڑھائی میں اچھی پوزیشن حاصل کرو۔" میرے والد بار بار یہی پوچھا کرتے تھے۔ جیسے ہی ہم عمر میں بڑھتے گئے انہوں نے ہمارے لیے سکول کے بعد سہ پہر کے وقت حساب اور انگریزی پڑھانے کے لئے اتالیق رکھ دیئے۔ وہ خود دنیا کے کسی کونے میں بھی ہوتے تو ٹیلی فون پر ہماری سکول رپورٹوں کا پوچھتے رہتے۔ خوش قسمتی سے میں اچھی طالبہ تھی کیونکہ ان کے ذہن میں میرے لیے وطن سے باہر تعلیم حاصل کرنے والی بھٹو خاندان کی پہلی خاتون کا اعزاز حاصل کرنے کی بڑی بڑی تجاویز تھیں۔

"تم اپنے اپنے سوٹ کیس تیار رکھو اور میں تم سب کو ایئر پورٹ پر الوداع کہنے کے بعد چھوڑ آؤں گا"۔ انہوں نے ہم چاروں کو بہت پہلے سے کہنا شروع کر دیا تھا۔ "پنکی ایک چھوٹی سی بچی کی طرح جائے گی اور واپس ساڑھی میں ملبوس ایک خوبصورت نوجوان لیڈی بن کر آئے گی۔ شاہنواز اپنے سوٹ کیس میں اتنے کپڑے بھر لے گا کہ اس سے بند نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں ملازم بابو کو بلانا پڑے گا تاکہ وہ اس کے اوپر بیٹھے۔ میرے خاندان میں ایسا کوئی سوال نہیں تھا کہ میری ہمشیرہ اور مجھے زندگی میں وہی مواقع نہیں ملیں گے جو میرے بھائیوں کو ملیں گے۔"

ہر سہ پہر اتالیق سے نصابی سبق پڑھنے کے بعد ہم نے مولوی صاحب سے جو ہمارے گھر پڑھانے آتے تھے قرآن مجید میں سے یاد اور دوسری سورتیں پڑھیں اور اسی طرح دیگر مذہبی ہدایات حاصل کیں۔ قرآن کریم کی عربی میں تلاوت اور پھر اس کے اسباق کو سمجھنا ہمارے لیے سب سے اہم موضوع تھا۔ ہم گھنٹوں مشکل عربی الفاظ پر تگ و دو کرتے۔ عربی کے حروف تہجی اردو سے ملتے جلتے ہیں مگر اس کی گرائمر اور مطالب انگریزی اور فرانسیسی کے مابین تفاوت کی طرح بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

میری والدہ نے نماز کے تمام آداب مجھے سکھائے۔ وہ اپنے دین پر سختی سے پابند تھیں۔ دنیا کے جس خطے میں بھی ہوں اور جو کچھ بھی کر رہی ہوں، وہ پنجگانہ نمازیں ضرور ادا کرتی تھیں۔ جب میں نو سالہ بچی تھی، وہ نماز فجر کے لیے صبح سویرے بستر سے جگاتیں، ہم اکٹھے ہی وضو کرتیں۔

میرے والد کا مصمم ارادہ تھا کہ وہ اپنے ملک اور اپنے بچوں کو بیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق پروان چڑھائیں۔ "کیا بچے خاندان

ہی میں شادیاں کریں گے؟'' میں نے ایک دن والدہ کو والد سے یہ سوال پوچھتے ہوئے سنا۔ جواب سننے کے لیے میری سانس وہیں رک گئی۔ ''میں نہیں چاہتا کہ لڑکے اپنے چچازادوں کے ساتھ شادی کریں اور باہر جاتے ہوئے ان کو گھر کی چاردیوار میں چھوڑ جایا کریں اور اس طرح میں لڑکیوں کو اپنے رشتہ داروں کی چاردیواری میں زندہ درگور ہونے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا۔'' مجھے یہ جواب سن کر بہت سکون ہوا۔ ''انہیں پہلے اپنی تعلیم مکمل کر لینے دو پھر وہ اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں گے۔''

میرے والد ہمیشہ مجھے اس وسیع کائنات کا حصہ بننے کے لیے کہتے۔ اگرچہ بعض اوقات ان کی باتیں میرے شعور سے ماورا ہوتی تھیں۔ 1963ء کے موسم خزاں میں، میں ان کے ساتھ وزیر خارجہ کے خصوصی ریل کے ڈبے میں سفر کر رہی تھی کہ انہوں نے مجھے ہلا کر جگایا۔ ''یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔'' انہوں نے زور دے کر کہا ''ایک بہت بڑا سانحہ ہو گیا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نوجوان صدر کو گولی مار دی گئی ہے۔'' اگرچہ میری عمر صرف دس سال تھی اور صدر امریکہ کے بارے میں مبہم سی شنید تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس رکھا۔ جب تک صدر جان ایف کینیڈی کی حالت کے بارے میں تازہ ترین بلیٹن آتے رہے وہ صدر امریکہ سے وائٹ ہاؤس میں کئی مرتبہ ملاقات کر چکے تھے اور ان کے معتدل سوشل خیالات کی وجہ سے ان کے بڑے مداح تھے۔ کبھی کبھی وہ پاکستان آئے ہوئے غیر ملکی وفود سے ملنے لیے میرے بھائیوں، بہن اور مجھے ساتھ لے جاتے۔ جب ایک روز انہوں نے ہمیں بتایا کہ چین سے آئی ہوئی بہت اہم شخصیات سے تمہیں ملواؤں گا تو میں عجیب جوش اور ہیجان محسوس کیا۔ میرے والد اکثر انقلاب چین اور اس کے رہنما ماؤزے تنگ کے بارے میں تعریفاً بتاتے کہ کس طرح انہوں نے فرسودہ نظام کو ختم کرنے کے لیے اپنی فوج کو منظم کیا اور کس طرح پہاڑوں اور صحراؤں میں اس کی رہنمائی کی۔ میرے والد چیئرمین ماؤ کے مداح تھے اور ان کی ٹوپی بطور ذاتی تحفہ کے میرے والد کے ڈریسنگ روم میں لٹک رہی تھی۔

جب میں دس سال اور صنم سات برس کی تھیں تو ہمیں شمال کی جانب مری کے سایہ دار سفیدے کے درختوں میں چھپے سابقہ برطانوی بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا گیا۔ ہماری گورنس نے مختصر سا نوٹس دیا کہ وہ انگلستان جا رہی ہیں۔ اس کے جانے کے بعد فوری طور پر بورڈنگ ہاؤس میں داخلہ تھا اور میرے والد اس کے حامی تھے تاکہ یہ تجربہ ہمیں سختی جھیلنے کا عادی بنا دے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے اپنا بستر بچھانا، اپنے جوتوں کو پالش کرنا، نہانے اور دانت صاف کرنے کے لیے برآمدہ میں لگے نلکوں سے پانی ڈھونا پڑا۔ ''میرے بچوں سے دوسرے بچوں سا سلوک کرو۔'' میرے والد نے آیاؤں سے کہہ رکھا تھا اور انہوں نے اس پر عمل کیا اور قواعد و ضوابط کی کسی بھی خلاف ورزی پر صنم اور مجھے قصوروار ٹھہرایا جاتا۔

مری میں میرے والد نے خط و کتابت کے ذریعہ ہماری سیاسی تعلیم جاری رکھی۔ غیر جانبدار ملکوں کی سربراہی کانفرنس منعقدہ جکارتہ سے واپسی کے فوراً بعد انہوں نے ہمیں ایک طویل خط لکھا جس میں اقوام متحدہ میں سپر پاورز کی خود غرضیوں اور تیسری دنیا کے ملکوں سے بے اعتنائی کی تفصیلات درج کیں۔ ایک آیا نے سکول کے باغ کے ایک بنچ پر صنم اور مجھے بٹھایا اور پورا خط ہمیں پڑھ کر سنایا۔ اگرچہ خط کے متن کو ہم بہت کم سمجھیں۔

مری میں ہمارے دوسرے اور آخری سال میں صنم اور میں نے گہرائی سے سیاسی اسباق کا مطالعہ کیا۔ 6 ستمبر 1965ء کو ہندوستان اور

پاکستان کشمیر کے مسئلہ پر آپس میں الجھ پڑے جبکہ میرے والد کشمیریوں کے حق خود اختیاری کی حمایت میں اور ہندوستانی حملے کے خلاف مباحثے میں حصہ لینے کے لیے اقوام متحدہ بذریعہ ہوائی جہاز چلے گئے۔ جیز اور میری کانونٹ کی آیاؤں نے ہندوستانی ہوائی حملہ کے امکان کی بنا پر طلبہ کو تیار کیا۔ کشمیر کی طرف سڑک مری میں سے ہو کر گزرتی تھی اور اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ ہندوستانی افواج کو پاکستان میں گھسنے کی کھلی دعوت تھی۔

جہاں ہم کبھی شام کے کھانے کے بعد بکرے کی ہڈیوں سے ''جیک جیک'' کھیلا کرتے تھے اور اینڈ بلائٹن کی کتابیں پڑھتے تھے۔ اب وہاں ہوائی حملوں سے بچاؤ اور بلیک آؤٹ کی پریکٹس ہو رہی تھی۔ آیاؤں نے بڑی لڑکیوں کو اپنی چھوٹی بہنوں کو پناہ گاہوں میں لے جانے کی ذمہ داری ڈال دی اور میں نے سنی کو اپنے جوتے پاؤں میں باندھ کر سونے کا عادی بنایا تا کہ انہیں ہمیں تلاش کرنے میں وقت ضائع نہ ہو۔ ہمارے سکول کی بہت سی لڑکیاں اعلیٰ سرکاری افسران یا فوجی افسروں کی بیٹیاں تھیں اور ہم نے جوش میں ایک دوسرے کے مصنوعی نام رکھ دیئے تھے تا کہ دشمن کے ہاتھوں میں پڑنے پر اسے دھوکا دیا جا سکے۔ ابتدائے بلوغت کی وجہ سے ہمیں یہ بالکل ڈرامائی محسوس ہوتا تھا کہ ہمیں اغوا کیا جا سکتا ہے اور پہاڑوں میں چھپایا جا سکتا ہے۔ سترہ روز اس عرصے میں حملے کا امکان حقیقی اور خوفناک تھا۔

جون 1966ء میں ایوب نے آخر کار میرے والد کا استعفیٰ منظور کر لیا۔ ایوب اور میرے والد کے درمیان اختلافات اب پوری طرح عیاں تھے اور میرے والد کی عوامی حمایت ایک سیاسی رہنما کے طور پر بہت بلند ہو گئی تھی۔ وزیر خارجہ کے ریلوے سیلون میں لاڑکانہ کی طرف ہمارے آخری سرکاری سفر نے عوام کو پاگل کر دیا تھا۔ وہ ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑتے تھے اور ہمارے ساتھ ڈبوں میں سوار ہونے کی کوشش کرتے۔ فخر ایشیا زندہ باد، ہجوم میں لوگ نعرہ لگاتے اور ٹرین کی چھت پر چڑھ جاتے اور قریب کے مکانوں کی چھتوں پر بھی لوگ ہی لوگ تھے جو نعرہ زن تھے'' بھٹو زندہ باد۔ بھٹو زندہ باد۔''

لاہور میں جب میرے والد ٹرین سے اتر کر ظہرانے کے لیے گورنر پنجاب کے پاس گئے تو مجھے بہت خوف محسوس ہوا۔ ''بھٹو کی قمیض پر میں نے خون دیکھا ہے۔'' کسی نے چلا کر کہا۔ میرا دل منجمد ہو گیا۔ جب تک میں نے انہیں ہجوم میں سے واپس آتے مسکراتے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے نہیں دیکھ لیا۔ ان کی قمیض پھٹی ہوئی تھی۔ ماتھے پر خفیف سی خراش تھی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان کی نکٹائی غائب تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ہزاروں روپوں میں نیلام ہو گئی تھی۔ جب وہ دوبارہ وزیر خارجہ کے سیلون میں بیٹھے ہجوم نے گاڑی کو جھولے کی طرح آگے پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ یہ دورانیہ تیز تر ہوتا گیا اور مجھے خدشہ پیدا ہوا کہ ہم سب کہیں نیچے نہ گر جائیں۔

صحیح سلامت گھر واپسی پر ہماری گفتگو میں سیاست زیادہ سے زیادہ دراندازی کر گئی۔ ''کولڈ وار'' یعنی سرد جنگ اور ''آرمز ایمبارگو'' یعنی اسلحہ پر پابندی ایسی اصطلاحات جن کو پوری طرح ہم ابھی سمجھتے بھی نہیں تھے بچپن ہی سے ہماری روزمرہ گفتگو کے ذخیرہ الفاظ کا حصہ بن چکی تھیں۔ گول میز کانفرنسوں اور سربراہی ملاقاتوں کے نتائج سے ہم بالکل اسی طرح آشنا تھے جس طرح دوسرے بچے عالمی کرکٹ کپ کے سکور سے لیکن 1966ء میں میرے والد کے ایوب خان سے کشیدہ تعلقات کے بعد ''شہری آزادیاں'' اور جمہوریت ایسے الفاظ ہماری زبان کا حصہ بن گئے جو زیادہ تر پاکستانیوں کے لیے دیو مالائی یعنی افسانوی حیثیت رکھتے تھے۔ جنہوں نے ایوب کے زیر سایہ سیاست میں محدود شراکت کا تجربہ ہی کیا تھا۔ میرے والد نے

1967ء میں اپنی سیاسی جماعت ''پاکستان پیپلز پارٹی'' کی بنیاد رکھ دی۔

''روٹی، کپڑا اور مکان'' یہ تینوں چیزیں پیپلز پارٹی کا ہدف اور لوگوں کے جم غفیر کا نقطہ اتصال بن گئیں۔ یہی بنیادی ضروریات تھیں جو پاکستان کے مظلوک الحال عوام کے پاس نہیں تھیں۔

''خدا کا ایسا کوئی قانون نہیں کہ صرف پاکستانی ہی مفلس ہوں۔'' میرے والد غرباء کے ہجوموں سے خطاب کرتے اور اسی طرح ان عورتوں سے بھی جو ہجوم کے اطراف میں گروہوں کی شکل میں اکٹھی ہو جاتیں۔ ''ہمارا ملک امیر ہے، ہمارے پاس وسائل کی کثرت ہے۔ پھر کیوں غربت، بھوک اور بیماری ہمارا مقدر ہے؟'' یہ بات تھی جسے عوام الناس آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔

70 کلفٹن کراچی کے ہمارے گھر کی پہلی منزل پر پی پی پی کا دفتر بن گیا۔ میری ہمشیرہ 11 سالہ اور میں 14 سال کی عمر میں چار چار آنے دے کر پارٹی کی جوشیلی کارکن بن گئیں تا کہ اپنے بزرگ ترین ملازم بابو کے ساتھ لوگوں کی بھاری تعداد کی رکنیت کرنے میں امداد کے لیے شریک ہو سکیں جو ہمارے دروازے پر ہر روز لائن بنا کر پارٹی رکنیت کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہم اپنے والد سے ان مراعات کی کہانی بھی سنتے جن کی ایوب حکومت انہیں پیشکش کرتی۔ ''تم جوان ہو، تمہارے سامنے ایک زندگی پڑی ہے۔ ایوب اپنی باری پوری کر لے تو بعد میں تمہاری باری ہے۔ ہمارے ساتھ کام کرو بجائے اس کے کہ ہماری مخالفت کرو۔ ہم تمہارے لیے سب کچھ آسان بنا دیں گے۔'' ایوب اور اس کے رفقاء میرے والد کو پیغام دیتے اور بالکل انہیں الفاظ میں ایک اور آمر کے قاصد یہی پیغام میرے لئے لاتے۔ جب ایوب کی رشوت کی پیش کش میرے والد کو خاموش رکھنے میں ناکام رہی تو موت کی دھمکیاں آنا شروع ہو گئیں۔

میں ظلم اور زیادتی کی دنیا سے اب تک ناواقف تھی۔ ایک دنیائے سیاست تھی جس میں میرے والد مصروف تھے اور ایک دنیا بچوں کے مدرسوں اور کھیلوں کی تھی اور ساحل سمندر پر ہنسی مذاق کی لیکن دونوں دنیائیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ جب میرے والد پر مسلح حملے ہونا شروع ہو گئے۔ ایوب کے حامیوں نے ان پر رحیم یار خان، سانگھڑ اور پی پی پی کو عوام الناس میں مقبول عام کرنے کے دوران سفر کی قیام گاہوں میں گولی چلائی۔ سانگھڑ میں میرے والد کی زندگی ان کے حامیوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر بچائی جنہوں نے گولی چلنے کے دوران خود کو ان کے اوپر گرا دیا اور خود گولیوں کے زخم کھائے۔

ہمارے گھر میں ہلچل سی مچ گئی لیکن میں نے سہم کر رہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس طرح خوفزدہ ہونے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ پاکستان میں سیاسی زندگی کے یہ لوازمات تھے اور ایسی زندگی بسر کرنے پر ہم مجبور تھے۔ موت کی دھمکیاں، ظلم و ستم جو کچھ تھا وہ تھا مگر میں نے خوفزدہ رہنے سے انکار کر دیا۔ دراصل میں نے کوشش کی کہ کسی قسم کی حساسیت کو پاس نہ آنے دوں۔ پی پی پی کی بنیاد کے گیارہ ماہ بعد میرے والد اور پارٹی کے اعلیٰ رہنماؤں کو قیدی بنا کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ آمروں کے یہی وطیرے تھے، جہاں کہیں احتجاج ہوا اسے بزور دبا دیا۔ جہاں غیر محققین ہوں انہیں گرفتار کر لو۔ کس قانون کے تحت؟ پوچھنے پر کہا جاتا، ہم خود ہی قانون ہیں۔

پاکستان میں ایوب کے خلاف احتجاج اس وقت شروع ہوا جب یہ خبر پھیلی کہ میرے والد کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور میانوالی جیل میں پھینک

دیا گیا ہے جو پاکستان کے بدترین قید خانوں میں شمار ہوتی تھی۔ احتجاج جاری رہا۔ پھر انہیں ساہیوال کی جیل میں تبدیل کر دیا گیا جہاں ان کی کوٹھڑی میں چوہوں کی بہتات تھی۔ فسادات کو دبانے کی کوشش میں حکومت نے تمام سکول اور یونیورسٹیاں بند کر دیں۔ دریں اثناء مجھے اپنی تعلیمی زندگی کے مشکل ترین مرحلے کا سامنا تھا کیونکہ میں اپنے ''او لیول'' کے امتحانات کی تیاری کر رہی تھی جو میری تعلیم کے آخری تین سالوں پر محیط تھا اور میرے ریڈکلف میں ممکنہ داخلے کے امتحان کا بھی پیش رو تھا۔ میں نے اپنے والد سے برکلے میں جہاں وہ خود گئے تھے، درخواست دینے کی گزارش کی مگر وہ نہیں مانے۔ ''کیلیفورنیا کا موسم بہت عمدہ ہے۔'' ''میساچوسیٹس کی برفیلی فضا تمہیں پڑھائی پر مجبور رکھے گی۔'' انہوں نے مجھے کہا۔

امتحان میں نہ بیٹھنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا کیونکہ امتحانی پرچے دسمبر میں سال میں صرف ایک دفعہ انگلستان سے بھیجے جاتے تھے۔ ''تم کراچی میں ٹھہرو اور اپنی پڑھائی جاری رکھو۔'' میری والدہ نے کہا اور باقی بچوں کو وہ لاہور اپنے ساتھ لے گئیں تاکہ میرے والد کی حراست کے خلاف عدالت عالیہ میں حبس بے جا کی درخواست دے سکیں۔ میں 70 کلفٹن میں تنہا رہ گئی۔

''میں تمہارے ''او لیول'' امتحانات میں تمہاری کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔'' میرے والد نے 28 نومبر کو ساہیوال جیل سے مجھے لکھا۔ ''مجھے حقیقتاً ایسی بیٹی پر فخر ہے جو اس قدر ذہین ہے کہ مجھ سے بھی تین سال کم یعنی پندرہ برس کی چھوٹی سی عمر میں ''او لیول'' کر رہی ہے۔ اگر یہی رفتار رہی تو تم کسی روز صدر بھی بن جاؤ گی۔'' اگرچہ میرے والد کو قید تنہائی میں رکھا گیا تھا مگر میرے والد نے مجھے یقین دلایا کہ ان کی سب سے بڑی پریشانی میری تعلیم ہی تھی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم بہت مطالعہ کرتی ہو لیکن تمہیں ادب اور تاریخ کا مزید مطالعہ جاری رکھنا چاہیے۔'' انہوں نے خط میں لکھا ''جن کتب کی تمہیں ضرورت ہے وہ سب تمہارے پاس ہیں۔ نپولین بوناپارٹ کے متعلق پڑھو جو موجودہ تاریخ کا مرد کامل تھا۔ امریکی انقلاب اور ابراہم لنکن کے بارے میں پڑھو بسمارک، لینن، اتاترک اور ماؤزے تنگ کے متعلق پڑھو۔ قدیم زمانے سے اب تک تاریخ ہندوستان پڑھو اور سب سے بڑھ کر تاریخ اسلام پڑھو۔'' قید خانے کے فارم پر دستخط تھے۔ ''ذوالفقار علی بھٹو''

میری خواہش تھی کہ میں لاہور میں باقی خاندان کے ساتھ رہوں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ صنم نے مجھے ٹیلی فون پر بتایا کہ میری والدہ میرے والد کی حراست کے خلاف ہر دوسرے تیسرے دن عورتوں کا ایک احتجاجی جلوس نکال رہی ہیں اور ہر مظاہرہ کرنے والی خاتون کے پاس پلاسٹک کے تھیلے میں ایک گیلا تولیہ ضرور ہوتا ہے تاکہ ایوب کی پولیس کے آنسو گیس پھینکنے کی صورت میں استعمال کیا جا سکے۔ متعدد بار پولیس نے اپنی لاٹھیوں سے جلوسوں کو منتشر کیا مگر مظاہرین کی تعداد ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی تھی۔ ایوب نے افواج کو حکم دیا کہ احتجاج کرنے والوں کو گرفتار کر لیا جائے مگر سپاہیوں نے عورتوں کو گرفتار کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ان کی حمایت میں ہاتھ ہلاتے رہے۔ ایوب کے دور حکومت میں بھی خواتین کے تقدس کا لحاظ رکھا جا رہا تھا۔

جلد ''او لیول'' امتحانات کے انعقاد کا وقت آ گیا۔ جیز اینڈ میری کانونٹ نے ہمارے لیے ویٹی کن سفارتخانہ میں امتحان کا انتظام کیا جو کلفٹن میں واقع تھا۔ اس کے تقدس اور تجارتی مرکز سے کافی فاصلے پر ہونے کی بنا پر ہمارے لیے محفوظ جگہ بن گیا تھا۔ ادھر برطانیہ میں طلبہ صاف ستھرے کمروں میں کئی دنوں تک امتحان دے رہے تھے۔ ہمیں چرچ آف روم کے پاکستانی صدر مقام پر لے جایا جاتا رہا۔

میرے والد کی حراست کے تین ماہ بعد پاکستان میں بحرانی کیفیت کو دیکھ کر ایوب خاں پی پی پی کے رہنماؤں کو رہا کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اپنی رہائی کے بعد لاڑکانہ میں فتح مندی کے مارچ میں میرے والد صنم اور مجھے دیکھ کر چلاتے ہوئے پکارے ''نیچے اتر جاؤ۔'' جب ہماری کھلی کار ہجوم کے درمیان آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی اور لوگ ''جیئے بھٹو'' اور ''گرتی دیوار کو آخری دھکا دو'' کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ ایوب کے ایک کارندے نے میرے والد پر قریب سے فائر کر دیا۔ خدا کا معجزہ تھا کہ پستول منجمد ہو گیا اور گولی نہ چلی لیکن ہجوم اس وقت معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

اسی طرح میں وہ نظارہ بھی نہیں بھولی کہ کس طرح میرے والد نے ایوب کی آمریت اور حراست کے غیر منصفانہ اختیارات کے خلاف اپنے نامختتم احتجاج میں بھوک ہڑتال جاری رکھی۔ قید سے اپنی رہائی کے بعد مدتوں تک وہ سرعام المرتضیٰ میں شامیانہ لگا کر دوسرے پی پی پی کے رہنماؤں کے ساتھ بیٹھے رہے۔ تمام لاڑکانہ نے انہیں دیکھا کہ وہ روز بروز کمزور سے کمزور تر ہو رہے تھے اور اس بات نے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا۔ ''برائے مہربانی پاپا کی بات مان جاؤ۔'' خاموشی سے میں ایوب کے بارے میں یہ دعا کرتی رہی اور اس بات پر حیران ہوتی کہ میرے والد کے اردگرد بیٹھے ہوئے حضرات کیسے بٹے کٹے دکھائی دیتے ہیں۔ ''جب وہ اپنے کمروں میں جاتے ہیں تو خوراک طلب کرتے ہیں۔ ملازمین میں سے ایک نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا اپنے والد کو یہ مت بتائیں۔''

ایوب نے آخرکار 25 مارچ 1969ء کو صدارت چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا لیکن یہ فتح عارضی ثابت ہوئی کہ اپنے ہی آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایوب نے قومی اسمبلی کے سپیکر کی بجائے فوج کے چیف آف سٹاف یحییٰ خان کو پاکستان کا نیا سربراہ نامزد کر دیا۔ ایک مرتبہ پھر پاکستان فوجی آمر کی زد میں آ گیا جس نے تمام سول قانون معطل کر دیئے اور مارشل لاء نافذ کر دیا۔

''ریڈکلف سے تمہارے نام خط آیا ہے۔'' میری والدہ نے یکم اپریل کو مجھے بتایا میں نے کچھ شکوک کے ساتھ لفافہ پکڑا۔ کیا مجھے ضرور جانا چاہیے؟ کالج نے میرے والد کو متنبہ کر دیا تھا کہ ''سولہ سال کی عمر ریڈکلف میں داخلے کے لیے کم متصور ہوتی ہے اور مشورہ دیا کہ ایک سال اور انتظار کر لوں۔'' لیکن میرے والد نے مجھے ٹھہرنے کا مشورہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس کی بجائے انہوں نے اپنے دوست جان کینتھ گلبریتھ جو ہارورڈ میں اقتصادیات کے پروفیسر اور ہندوستان میں سابقہ امریکی سفیر تھے کی امداد طلب کی۔ میں نے لفافہ کھولا تو مجھے معلوم ہوا کہ 1969ء کے موسم سرما کے سیشن میں مجھے داخلہ دے دیا گیا تھا۔

میرے والد نے قرآن حکیم کا ایک خوبصورت نسخہ خوبصورت جلد میں مزین مجھے الوداعی تحفہ کے طور پر دیا۔ ''تم امریکہ بہت سی ایسی چیزیں دیکھو گی جو تمہاری حیرت کا سبب بنیں گی اور کچھ ایسی بھی جو ذہنی صدمے کا باعث بنیں گی لیکن مجھے امید ہے کہ تم میں حالات سے سمجھوتہ کرنے کی صلاحیت ہے۔ سب سے بڑی چیز تعلیم میں محنت ہے۔ پاکستان میں بہت کم لوگوں کو تمہاری جیسا موقع میسر آتا ہے اور تمہیں اس کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے یہ مت بھولو کہ تمہارے بھیجے جانے پر جو خرچہ اٹھے گا وہ ہماری اپنی زمینوں سے آتا ہے۔ ان لوگوں کی محنت ہے جو خون پسینہ ایک کر کے کماتے ہیں اور ان زمینوں پر کام کرتے ہیں۔ تمہیں ان کا قرض چکانا ہے اور یہ قرض تم چکا سکتی ہو۔ اگر بفضل خدا اپنی تعلیم کو ان لوگوں کی زندگیاں بہتر

بنانے پر صرف کرو۔" انہوں نے کہا۔

اگست کے آخری ہفتے میں 70 کلفٹن کے نکڑ سے ترا سیدہ راستے میں کھڑی تھی کہ میری والدہ نے قران حکیم کے نسخے کو میرے سر کے اوپر پھیرا۔ میں نے اس کا بوسہ لیا۔ ہم دونوں اس کے بعد ائیر پورٹ کے لئے روانہ ہوگئیں۔

1977ء میں پاکستان میں جو واقعات بھی رونما ہوئے، اس وجہ سے ہوئے کہ کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو ان واقعات کے انعقاد کے ذمہ دار تھے۔ اگر قومی اتحاد کے رہنماؤں نے اپنے مفاد کے بجائے پاکستان کے قومی مفاد کو پیش نظر رکھا ہوتا، اگر میرے والد کے چیف آف سٹاف نے اپنے ذاتی مفاد کے بجائے قومی مفاد کو ترجیح دی ہوتی، حکومت کا تختہ نہ الٹا ہوتا۔ یہ ہم سب کے لیے سیکھنے کا ایک اہم سبق تھا اور ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اپنے قومی مفاد میں عمل کیا مگر ہم نے اپنے قومی مفاد کا ذرہ بھر خیال نہیں کیا۔ بعض لوگ 1977ء کے واقعات کا سارا الزام امریکہ پر دھر دیتے ہیں۔ اگر ہم میں کچھ لوگ ایسے نہ ہوتے جنہوں نے امریکی سازش میں ان سے تعاون کیا تھا اور جنہوں نے ملک کی خدمت کے برعکس اپنے اقتدار کے مواقع کو سامنے رکھا تھا تو پاکستان کی منتخب حکومت کو نقصان نہ پہنچتا، لیکن آکسفورڈ کی ایک طالبہ کے طور پر یہ بات ابھی میری سمجھ سے باہر تھی۔

سورج اپنی بھرپور تمازت سے چمک رہا تھا۔ جب میں اپنے چوبیسویں یوم پیدائش کی صبح جاگی۔ 21 جون کا موسم گرما کا دن اپنی پوری حدت کے ساتھ طلوع ہوا۔ میں پاکستان واپسی سے پہلے ملکہ ایلزبتھ ہاؤس کے باغات میں اپنی طرف سے دی جانے والی ایک بڑی الوداعی اور اپنی سالگرہ کی دعوت کی منتظر تھی۔ سٹرابری اور کریم کے پیالوں پر طبع آزمائی کرتے ہوئے ہم نے ماضی کی یادوں کو دہرایا اور ایک دوسرے کے گھروں کے پتوں کا تبادلہ کیا۔

میں آکسفورڈ اور اپنے متعدد دوستوں سے الوداع پر رنجیدہ تھی۔ میں اپنی چھوٹی پیلی کار کو چھوڑنے پر غمگین تھی جسے میر موسم خزاں میں فروخت کرنے پر آمادہ تھا۔ چار سال تک میرے کمرے کے باہر کا ڈاک بکس دوستوں کے پیغامات کے لئے بلیٹن بورڈ بنا رہا اور اسی طرح جو شیلے ٹریفک وارڈنوں کے لیے پارکنگ ٹکٹوں کا آشیانہ بھی، لیکن میں پاکستان میں نئے منتظر امکانات کے سلسلہ میں بھی بہت پر جوش تھی۔

میرے والد بھی میری آمد کے اتنا ہی منتظر تھے، جتنا میں گھر واپس جانے کے لیے بے تاب تھی۔ انہوں نے مجھے خط میں لکھا، "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں پاکستان میں تمہاری ذہنی ہم آہنگی کے لیے اپنی بھرپور کوشش کروں گا تاکہ تمہارا مستقبل جلد ہی خوشگوار ہو جائے۔ اس کے بعد تمہیں اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہونا ہے۔ البتہ میرے مزاج کے طنزیہ تیروں کو تمہیں برداشت کرنا ہوگا۔ بدقسمتی سے میں اب اس عمر میں اپنے مزاج کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ میں اپنی پہلوٹی بیٹی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ تم زود رنج مزاج رکھتی ہو اور تمہاری آنکھوں سے فوراً ہی ٹپ ٹپ آنسو گرنا شروع ہو جاتے ہیں، جیسے میری اپنی آنکھوں سے بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں ایک ہی گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں۔ آؤ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کا معاہدہ کر لیں۔ تم ایک متحرک طبیعت کی مالک ہو۔ ایک متحرک انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ صحرا کو صحت کے بغیر اور پہاڑوں کو برف کے بغیر دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تم اپنی دھوپ کی چمک اور اپنی قوس قزح، اپنی باطنی اقدار اور اخلاقیات میں تلاش

کروگی اور یہیں تمہیں کامیابی کا حصول ممکن ہوگا۔ ہم دونوں قابل تعریف کامیابیوں کے لیے مشترکہ طور پر جدوجہد کریں گے۔ کیا تم شرط لگاتی ہو کہ ہم اس میں سرخرو ہو جائیں گے۔''

25 جون 1977ء کو میرا اور میں اپنے والدین اور دیگر اہل خاندان کے پاس راولپنڈی میں بذریعہ طیارہ پہنچ گئے۔ شاہ نواز سوئٹزرلینڈ میں اپنے سکول سے واپس آیا اور ضم ہارورڈ سے۔ یہ آخری موقع تھا کہ ہمارا سارا خاندان ایک جگہ اکٹھا ہوا۔

ضیاء الحق کی غداری

عام دنوں میں بھی المرتضیٰ میں ہنسی خوشی اور مذاق کی آوازیں آتی رہتی تھی۔ اکثر میرے والد دفعتاً گانا شروع کر دیتے تھے۔ سندھی لوک گیتوں کو دیہاتی انداز میں گاتے ہوئے یا مغرب کی دل پسند دھنوں کو آزماتے ہوئے، جنوبی بحرالکاہل کے موسیقاروں کی دھنیں جو انہیں نے نیویارک میں سنی تھیں۔ فرینک سناترا کا مشہور گانا جو کراچی میں مقبول تھا اور ان کی میری والدہ سے محبت کا غماز اور ان کا مخصوص گانا ''کیو، سرا سرا'' میں اب بھی ان کو گاتے ہوئے سن سکتی ہوں۔

کسے اس تاریک مستقبل کا پتہ تھا؟ جو 5 جولائی 1977ء کی صبح سویرے ان پر فوری طور پر نازل ہو گیا اور فوجی سازشیوں نے ان کا تختہ الٹ کر ہمارے لیے ازلی المیے کا آغاز کر دیا اور پورے پاکستان کے لئے دائمی پریشانی کا۔

5 جولائی 1977ء صبح 1:45 بجے وزیراعظم کی رہائش گاہ۔ راولپنڈی

''اٹھو جاگو فوراً کپڑے تبدیل کرو۔'' میری والدہ نے تیزی میں پکارا اور میری ہمشیرہ کو جگانے کے لیے میرے کمرے سے ہوتے ہوئے کہنے لگیں: ''فوج نے قبضہ کر لیا ہے، فوج نے قبضہ کر لیا ہے۔''

چند منٹ بعد میں گھبراہٹ میں اپنے والدین کے سونے کے کمرے میں پہنچ گئی۔ مطلقاً یہ نہ جانتے ہوئے کہ کیا ہو رہا ہے؟ ایک فوری انقلاب! یہ انقلاب کیسے برپا ہو سکتا ہے؟ صرف ایک روز پہلے ہی پاکستان پیپلز پارٹی اور حزب مخالف کے رہنماؤں میں انتخابات پر تصفیہ ہوا ہے۔ اگر فوج نے قبضہ کر لیا ہے تو کون سے فوجی افسران اس میں ملوث ہیں؟ فقط دو روز پہلے جنرل ضیاء اور اس کے کور کمانڈر فوج کی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے میرے والد کے پاس آئے تھے۔ میرے والد فون پر فوج کے چیف آف سٹاف جنرل ضیاء اور وفاقی وزراء سے رابطہ کر رہے ہیں۔ پہلی آواز جو موصول ہوئی وہ وزیر تعلیم کے گھر سے تھی۔ ''فوج جوان یہاں پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے میرے والد کو پیٹا ہے اور پکڑ کر لے گئے ہیں۔'' سسکیاں بھرتے ہوئے حفیظ پیرزادہ کی بیٹی نے کہا۔ وہ چند گھنٹے قبل میرے والد کے پاس تھے اور حزب مخالف سے معاہدہ پر خوشی کا اظہار کر کے گئے تھے۔ جب میں اندرون خانہ اپنی ہمشیرہ سے ہنسی مذاق میں مشغول تھی تو میں نے ان کے نعروں کے شعلے اور لان میں ان کی ہنسی کی آوازیں سنی تھیں۔

''سکون سے رہو۔'' پاپا نے حفیظ پیرزادہ کی بیٹی کو پر اعتماد لہجے میں تلقین کی۔ ''اپنے خاندان کے وقار کا خیال رکھو۔''..... اگلی کال پر گورنر سرحد سے بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ ٹیلی فون کٹ گیا۔

میری والدہ کا چہرہ زرد ہو گیا۔ میری والدہ نے آہستہ آواز میں مجھے بتایا کہ تمہارے پاپا کو سازش کا علم ایک پولیس کے سپاہی سے ہوا۔ اس نے فوجی سپاہیوں کو وزیراعظم کی رہائش گاہ کو گھیرے میں لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اپنی زندگی خطرے میں ڈالتے ہوئے وہ جوانوں سے نظر بچاتے ہوئے پیٹ کے بل رینگتے ہوئے بڑے دروازے تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ ''بھٹو صاحب کو بتا دو کہ فوج انہیں قتل کرنے کے لیے آ رہی ہے۔'' اس نے زور دے کر عرس سے (جو میرے والد کا خادم تھا) کہا ''انہیں فوراً چھپ جانا چاہیے، چھپ جانا چاہیے۔'' میرے والد نے یہ پیغام سکون سے سنا۔ ''میری زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔'' انہوں نے عرس کو جواب دیا۔ ''اگر فوج نے مجھے قتل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے تو وہ مجھے ضرور قتل کر دیں گے۔ چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی تم میں سے کسی کے مزاحمت کرنے کا۔ انہیں آنے دو۔'' پولیس کے سپاہی کی بروقت تنبیہ نے شاید ہم سب کی زندگیاں بچا لیں۔

''وزیراعظم چیف آف آرمی سٹاف سے بات کرنا چاہتا۔'' میرے والد نے صنم کے ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے کہا۔ خوش قسمتی سے صنم کی لائن پرائیویٹ تھی جس پر وہ اپنے دوستوں اور عزیزوں سے گفتگو کرتی رہتی تھی۔ معجزانہ طور پر یہ لائن کاٹنے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔

''جناب مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ کام کرنا پڑا۔'' ضیاء وزیراعظم اور حزب مخالف کے درمیان طے پا جانے والے معاہدہ کا کوئی حوالہ دیئے بغیر بول اٹھا۔ ''ہمیں کچھ دیر کے لیے آپ کو حفاظتی نگہبانی میں لینا ہے۔ میں 90 دنوں میں نئے انتخابات کروا دوں گا۔ آپ یقیناً دوبارہ وزیراعظم منتخب ہو جائیں گے اور جناب میں آپ کو سلامی دے رہا ہوں گا۔''

اب میرے والد کو پتہ چلا کہ اس بغاوت کی سربراہی کون کر رہا ہے۔ انہوں نے تشویش کے انداز میں آنکھیں سکیڑ لیں۔ ضیاء نے انہیں بتایا کہ جہاں وہ چاہیں وہاں انہیں لے جایا جائے گا۔ مری میں وزیراعظم کے ریسٹ ہاؤس میں، لاڑکانہ میں ان کے آبائی گھر میں جہاں بھی وہ چاہیں، البتہ ان کے اہل خانہ راولپنڈی کے وزیراعظم ہاؤس میں مزید ایک ماہ قیام کر سکتے ہیں۔ آرمی کے جوان ان کے پاس 2:30 بجے صبح پہنچ جائیں گے۔

''میں لاڑکانہ جاؤں گا اور میرا کنبہ کراچی جائے گا۔'' میرے والد نے کہا۔ ''یہ وزیراعظم کی سرکاری رہائش گاہ ہے۔ چونکہ میں اس وقت وزیراعظم نہیں ہوں، اس لیے میرے اہل خانہ شام تک یہاں سے چلے جائیں گے۔''

اسی دوران میرے دونوں بھائی میر اور شاہنواز کمرے میں داخل ہوئے۔ ظاہر ہے انہوں نے جلدی میں لباس پہنا ہے۔

''ہمیں مزاحمت کرنا چاہیے۔'' میر کہتا ہے۔

''فوجی بغاوت کی کبھی مزاحمت مت کرو۔'' میرے والد خاموشی سے کہتے ہیں۔ ''جرنیل ہمیں مار دینا چاہتے ہیں۔ ہم اپنے قتل کا انہیں کوئی بہانہ کیوں مہیا کریں؟''

''ضیاء ہی اس بغاوت کا سرغنہ ہے۔'' میری والدہ میرے دونوں بھائیوں کو بتاتی ہیں کیونکہ ہم اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتے تھے۔

''وہ یہ بھی کہتا ہے کہ 90 دنوں میں انتخابات منعقد کرا دے گا۔''

''وہ اپنا قبضہ مستقل جاری رکھے گا اور 90 دنوں میں انتخابات بھی کرا دے گا؟'' شاہ کہتا ہے۔ اس نے چھوٹی سی عمر سے اب تک ہم سب سے زیادہ گھر میں وقت گزارا ہے اور سیاسی طور پر زیادہ بالغ نظر ہے۔

ضیاء نے بغاوت برپا کرنے میں اس قدر دیر سے اہتمام کیوں کیا؟ ایجی ٹیشن تو ماہ اپریل میں اپنی موت آپ مر چکا تھا۔ چند گھنٹے قبل قومی اتحاد سے مذاکرات کامیابی سے مکمل ہو چکے تھے۔

''ضیاء نے غلط اندازہ لگایا۔'' میرے والد کہتے ہیں۔ ''اس کا خیال تھا کہ قومی اتحاد سے مذاکرات ناکام ہو جائیں گے اور اسے قبضہ کرنے کا بہانہ مل جائے گا۔ اس نے حتمی معاہدہ پر دستخطوں سے پہلے ہی اپنا وار کر دیا۔''

''خدا ہی علیم و خبیر ہے کہ ہم پر کیا گزرے گی؟'' میری والدہ خاموشی سے کہتی ہیں۔

میری والدہ ریڈیو کو کوئی خبر سننے کے لئے آن کرتی ہیں۔ اگرچہ اتنی صبح سویرے کونسی نشریات سنائی دے سکتی ہیں۔ چنانچہ کچھ بھی نہیں۔ جب ہم فوجی جوانوں کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں، میرے والد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔

''ذمہ داری کا بوجھ میرے کندھوں سے اتر گیا ہے۔'' وہ کہتے ہیں۔ ''حکومت ایک امانت ہے اور میں نے اسے ایماندار سے نبھایا، اب یہ بوجھ مجھ پر نہیں ہے۔'' ہم اپنے والدین کے سونے کے کمرے میں صوفے پر بے حس و حرکت بیٹھے ہیں جبکہ میرے والد اپنی روزمرہ عادت کے مطابق سکون سے اپنی کرسی پر بیٹھے میز پر فائلوں کے انبار کی ورق گردانی میں مصروف ہیں۔

ایک سیاہ فائل وہ مطلقاً نہیں پڑھتے بلکہ تمام متن پر چپ چاپ دستخط کر دیتے ہیں۔ ''میرا پہلا کام بطور وزیراعظم قتل کے مجرموں کو سزا کو تبدیل کرنا تھا۔'' وہ کہتے ہیں ''میرا آخری عمل بھی یہی ہوگا۔ میں زندگی کے لیے اپیل کرنے والوں کی درخواستیں پڑھنا پسند نہیں کرتا۔'' میں انہیں گلے ملنے کے لیے آگے بڑھتی ہوں مگر وہ آہستہ سے مجھے پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔

''اب جذباتیت کے لیے کوئی وقت باقی نہیں۔'' وہ مجھے سمجھاتے ہیں۔ ''بہت کڑا وقت آنے والا ہے۔''

ہم بی بی سی کی اردو کی صبح کی نشریات پر ریڈیو لگاتے ہیں۔ وہاں صرف اتنی ہی خبر سننے کو ملتی ہے کہ فوج نے حکومت پاکستان پر قبضہ کر لیا ہے۔

''تمہارا مضمون عالمی حکومتیں'' تھا۔ تم بتاؤ کیا ضیاء انتخابات منعقد کرائے گا؟''

''ہاں۔ کرائے گا، پاپا۔'' میرا جواب ہے۔ ابھی تک میں طالب علمانہ منطق اور مثالیت پسندی میں یقین رکھتی ہوں۔ ''انتخابات کی بذات خود نگرانی کر کے ضیاء مخالفین کو کسی ایسے دعویٰ سے محروم کر دے گا کہ دھاندلی کی گئی ہے اور ایجی ٹیشن کے آغاز کے بہانے سے بھی۔''

''بے وقوف مت بنو پنکی۔'' میرے والد خاموشی سے کہتے ہیں۔ ''افواج اقتدار چھوڑنے کے لئے حاصل نہیں کرتیں اور نہ ہی جرنیل بغاوت کا ارتکاب اس لیے کرتے ہیں کہ انتخابات منعقد کریں اور جمہوری آئین کو بحال کریں۔''

میں والدین کے کمرے سے باہر آتی ہوں تا کہ سامان باندھ سکوں۔ میرے والد کئی برس پہلے ہی ہمیں وزیراعظم ہاؤس کو الوداع کہنے کی

تربیت دیتے رہے تھے۔ اگرچہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہمیں بندوق کی نوک پر کرنا پڑے گا۔ ان کا اصرار تھا کہ اس رہائش گاہ کو اپنا گھر تصور نہ کریں بلکہ ایک سرکاری عمارت سمجھیں۔ جب انہیں ان کے عہدے سے برطرف کر دیا گیا تو وہ سرکاری رہائش گاہ کو جلد از جلد چھوڑنا چاہتے تھے۔ اپنے فوجی پیش رو یحییٰ خان کی طرح نہیں جو عہدے سے برطرف ہونے کے باوجود مہینوں سرکاری رہائش گاہ کو استعمال کرتا رہا۔ ''اتنا سامان ہی اپنے پاس مت رکھو جو ایک دن میں باندھ نہ سکو۔'' میرے والد نے ہمیشہ ہمیں نصیحت کی لیکن میں اس اہم اصول پر عمل پیرا نہ ہو سکی۔

میں مکمل اضطراب کی حالت میں رہی جبکہ میں اپنا سامان باندھ رہی تھی اور اپنے والدین کے سونے کے کمروں میں بھاگ دوڑ کرنے کے دوران مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ میرے والد کو کہیں اچانک وہ لوگ لے نہ جائیں۔

''بنکی بیٹے، جلدی آؤ تمہارے پاپا جا رہے ہیں۔'' میں والدہ کو 9:00 بجے سے کچھ ہی پہلے پکارتے ہوئے سنتی ہوں۔

گھر کے عملے کا ایک شخص بھی اونچی آواز میں پکارتا ہے۔ ''جلد کرو، صاحب جا رہے ہیں۔'' اس نے سرخ اور سفید رنگوں کی وزیراعظم ہاؤس کی وردی پہنی ہوئی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو رواں ہیں۔

ہم سفید اور سنہری رنگوں میں سجی ہوئی راہداری سے بڑے دروازے تک پہنچتی ہیں۔ لان میں سے بلکتی ہوئی آوازیں سنائی دے رہی ہیں، جہاں گھر کا عملہ اکٹھا ہو گیا ہے۔

پاپا وزیراعظم کی سیاہ مرسیڈیز میں بیٹھے ہیں۔ جیسے ہی کار حرکت میں آتی ہے، صنم اور میں روتے ہوئے عملے کے پاس سے گزر کر باہر کے دروازے تک آتی ہیں۔ ''الوداع پاپا۔'' میں اپنے بازو زور زور سے ہلاتے ہوئے چیخ پڑتی ہوں، وہ ہماری طرف دیکھتے ہیں۔ نیم مسکراہٹ کے ساتھ کار میں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کار وزیراعظم کی رہائش گاہ کے دروازوں سے باہر نکل جاتی ہے جبکہ صبح کا سورج لائسنس پلیٹ پر کنڈلی مارے ہوئے پتوں کے درمیان وزیراعظم کی سنہری مہر پر چمک رہا ہے۔

میرے والد کی سول حکومت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ ایک مرتبہ پھر پاکستان پر جرنیل حکومت کرنے لگے ہیں۔

مجھے یہ سمجھ لینا چاہیے تھا کہ میرے والد کی گرفتاری نے پاکستان میں جمہوریت کو ختم کر دیا ہے۔ 1973ء کا آئین معطل ہو چکا تھا، مارشل لاء نافذ کر دیا گیا تھا لیکن میں اپنی طالب علمانہ سوچ اور سادہ لوحی سے چمٹی رہی کہ ضیاء انتخابات کرا دے گا۔ جن کا اگلے چند ہفتوں میں اس نے بار بار وعدہ کیا۔ ''میں اس بات کو کلی طور پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے کوئی سیاسی عزائم نہیں ہیں نہ ہی افواج اپنے سپاہیانہ پیشے کو خیرباد کہیں گی۔'' ضیاء نے بغاوت کی صبح ہی اپنی نشری تقریر میں اعلان کیا تھا۔ ''میرا واحد مقصد آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنانا ہے جو اس سال اکتوبر کے مہینے میں منعقد ہوں گے۔ انتخابات کے فوراً بعد اقتدار عوامی نمائندوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ میں حتمی یقین دہانی کراتا ہوں کہ میں اس طے شدہ پروگرام سے انحراف نہیں کروں گا۔'' وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا۔

جب ہم راولپنڈی سے 70 کلفٹن واپس پہنچے تو میرے والد کی نظر بندی اور پاکستان پر ظلمتوں کے گھمبیر سایوں پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پی پی پی کے ہزاروں حامی ہمارے گھر کے باہر میں اکٹھے ہو گئے۔ میر مرتضیٰ مردوں سے گفتگو کرتے رہے اور میری والدہ نے فشار خون میں

مبتلا ہونے کے باعث عورتوں سے بات کرنے کے لیے مجھے بھیج دیا۔ ''فقط اتنا کہو کہ حوصلہ رکھو۔'' میری والدہ نے بتایا۔ ''حوصلہ رکھو، حوصلہ رکھو۔'' میں نے یکے بعد دیگرے ہر آنے والی خاتون کو کہا۔ اپنی اردو میں لڑکھڑاتے ہوئے کیونکہ آٹھ سال غیر ممالک میں رہنے کی وجہ سے اردو زبان کمزور پڑ گئی تھی۔

میرے والد کی جرأت اور مزاح کی حس بلند تھی۔ انہوں نے بعد میں ایک روز بتایا، ''ایک صحافی نے آج فون کیا اور پوچھا، آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟ میں نے اسے بتایا کہ میں آج کل نپولین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ مطالعہ کر رہا ہوں تا کہ پتہ چلے اس نے اپنے جرنیلوں کو کس طرح قابو میں رکھا تھا جبکہ میں نہ رکھ سکا۔'' میرے والد کی بلند حوصلگی نے ہمیں اپنا توازن برقرار رکھنے میں خاصی مدد کی۔ بجائے اداس اور مایوس ہونے کے ہم مضبوط، پراعتماد اور بلند حوصلہ رہے۔ اول بات یہ تھی کہ میرے والد حیات تھے۔ دوسرے عوام ان کے حامی تھی۔ پی پی پی کی شہرت کا گراف اتنا ہی بلند تھا جتنا پہلے تھا جبکہ پاپا نے میر کو لاڑکانہ اپنے حلقہ انتخاب میں بھیج دیا۔ میں اور شاہ نے 70 کلفٹن میں ہزاروں لوگوں سے ملاقاتیں جاری رکھیں جو اپنے تعاون کا یقین دلانے کے لئے ہر روز آتے تھے۔

''ضیاء آج مجھے ملنے کے لیے آ رہا ہے۔'' میرے والد نے 15 جولائی کو مجھے ٹیلی فون پر بتایا۔ اگلے دن اخبارات میں شائع شدہ تصویر میں میرے والد سنجیدہ دکھائی دیتے تھے۔ ان کا چہرہ ملک کی سیاسی حالت کی گھمبیرتا کا عکاس تھا۔ ضیاء اس کے برعکس احساس گناہ کا شکار تھا۔ اس کا ہاتھ اس کے سینے پر دھرا ہوا تھا اور چہرے پر غلامانہ مسکراہٹ کا انداز۔ ''ضیاء نے انتخابات منعقد کرنے کا اپنا عزم دہرایا اور سیاسی جماعتوں کے درمیان خود ایک ریفری کا کردار ادا کرنے کا ارادہ بھی۔'' میرے والد نے اپنی ملاقاتوں کے بعد ٹیلی فون پر ہمیں بتایا۔ ضیاء اس بات پر کیوں زور دیتا ہے کہ وہ دیانتدار ہے۔ میرے والد کو اتنا بھی یقین نہیں تھا کہ وہ منصفانہ اور مساویانہ سلوک کا متحمل ہوگا۔ ہمیں بھی یقین نہیں تھا۔ میرے والد اور پی پی پی کے خلاف حکومت کی تحویل میں میڈیا نے جو باؤلا پن فضا میں پھیلا دیا تھا، اس کا تو یہی نتیجہ معلوم ہوتا تھا کہ ہمیں ضیاء پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

''لوگوں سے اپنا مضبوط رشتہ استوار رکھنے کے لیے لاہور جاؤ۔'' میرے والد نے کہا۔ ''انہوں نے بارشوں سے بہت نقصان اٹھایا ہے اور سیلاب بھی بہت تباہ کن تھے۔''

لاہور اپنے آپ چلی جاؤں۔ اس سے پہلی کسی پارٹی فریضے پر میں وہاں کبھی نہیں گئی۔ میرے دل میں ہول اٹھنا شروع ہو گیا۔

''مساوات میں اپنے پروگرام کا اعلان کرو اور شاہ کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔'' میرے والد نے مجھے بتایا۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر میں اور شاہ لاہور پہنچ گئے۔ ہزاروں پی پی پی کے حامی ایئرپورٹ پر ہمارے استقبال کے لیے پہنچ گئے اور مارشل لاء حکم نمبر 5 کے باوجود جس میں کسی سیاسی جلسے کا اہتمام کرنے یا اس میں حاضر ہونے پر پانچ سال قید کی سزا دی جا سکتی تھی، لوگوں نے پی پی پی کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ہجوم اس قدر پرجوش تھا کہ شاہ اور مجھے اپنی کار تک پہنچنے کے لیے بڑی مشکل سے راستہ ملا۔ میرا اٹھارہ سالہ بھائی اور میں اس غیر متوقع مظاہرہ سے بہت متاثر ہوئے۔ ہم تو صرف وزیراعظم کے بچے تھے اور ہماری کوئی سیاسی حیثیت نہیں تھی۔

بیگم خاکوانی صدر خواتین ونگ پنجاب کے بنگلہ پر ہجوم اور بھی بڑا تھا۔ لوگ گھر کے باغ سے باہر گلی تک پھیلے ہوئے تھے۔ شاہ اور میں اس

ہجوم کی وجہ سے استقبالیہ کمرے میں پسینے میں شرابور ہو گئے۔ کمروں کی روشنی نے بھی ہماری آنکھیں تقریباً اندھی کر دیں کیونکہ لوگ ہماری تصویریں دھڑا دھڑ کھینچ رہے تھے۔ استقبالیہ کے درمیان میں مجھے ٹیلی فون پر بلایا گیا۔ ''یہ وزیراعظم بھٹو کا ہے۔'' یہ پیغام ہجوم میں سرسراتا ہوا مجھے ملا۔ ''چیئرمین بھٹو بلا رہے ہیں۔''

سینکڑوں لوگ رہائشی کمرے میں میرے ساتھ ہی داخل ہو گئے۔ ''تم کیسی ہو؟'' میرے والد نے مجھے پوچھا۔ وہ شاہ اور میرے استقبال سے قطعی بے خبر تھے۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ایئرپورٹ پر اور لاہور میں یہاں ہزاروں لوگ استقبال کے لیے جمع تھے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ''میری طرف سے انہیں سلام دو۔'' میں نے ٹیلی فون بند کیا اور متوقع ہجوم کی طرف مڑی۔ ''میرے والد نے ان تمام لوگوں کے لئے اظہار ہمدردی بھیجا ہے جنہوں نے گھروں اور فصلوں کا نقصان اٹھایا ہے۔'' میں لڑکھڑاتی اردو میں کہتی چلی گئی۔ ''پی پی پی متاثرہ خاندانوں کی بحالی کے لئے امداد کی طالب ہے۔''

پاکستان کے لوگ عموماً اس رہنما کا پیچھا چھوڑ دیتے ہیں جو اقتدار کے سنگھاسن سے علیحدہ ہو چکا ہو اور اپنی تمام تر حمایت نئے آنے والے رہنما کے حق میں انڈیل دیتے تھے لیکن اس مرتبہ ضیاء کا میرے والد کو سازش سے اتارنا الٹے نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ میرے والد کو چھوڑنے کی بجائے لوگوں کی وفاداری سو فیصد ان کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ضیاء نے میرے والد اور دوسرے نظر بند رہنماؤں کو بغاوت کے تین ہفتوں کے بعد رہائی کا حکم دے دیا۔ لاکھوں لوگ مارشل لاء کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں میرے والد کے استقبال کے لیے پہنچے۔ مغرب میں کبھی اتنا ہجوم اکٹھا نہیں ہوتا جتنا ایشیا میں، لیکن ہمارے معیار کے مطابق بھی ہجوم جو میرے والد کی تقریر سننے آتے، ہر طرح سے بہت بڑے تھے۔

میرے والد سب سے پہلے کراچی پہنچے جہاں ان کے استقبال میں ہجوم کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ قیاس لگانا بھی ممکن نہیں تھا۔ ریلوے سٹیشن سے ہمارے گھر تک راستہ آدھ گھنٹے کا تھا مگر میرے والد کو دس گھنٹے لگے۔ ان کی کار میں 70 کلفٹن پہنچنے تک گڑھے پڑ گئے۔

کچلے جانے کے خوف سے میرے بھائی، بہن اور میں بڑے دروازے سے باہر ہجوم میں واپنے والد کے استقبال کے لیے نہیں گئے بلکہ ہم ان کی آمد کا منظر دیکھنے کے لیے چھت پر چڑھ گئے۔ اگرچہ ہم نے جذباتی ہجوم پہلے بھی دیکھے تھے مگر اس مرتبہ یہ بے مثال تھا۔ اتنی تعداد میں لوگ انہیں دیکھنے، انہیں چھونے اور ان کے قریب جانے کی تگ و دو کر رہے تھے کہ ہمارے گھر کی چار دیواری ان کے بوجھ تلے ٹوٹ گئے۔

''اوہ، پاپا میں آپ کو آزاد دیکھ کر کس قدر خوش ہوں، اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔'' میں نے والدین کے سونے کے کمرے میں اس رات انہیں کہا۔

''آزاد ابھی تو ہوں مگر۔'' میرے والد کا جواب تھا۔

''ضیاء دوبارہ آپ کو گرفتار کرنے کوشش نہیں کرے گا۔'' میں نے کہا۔

''اس نے ہجوموں کو حکم دیکھ لیا ہے۔''

''چپ۔'' انہوں نے انگلی کو دائرے میں گھماتے ہوئے مجھے متنبہ کیا۔ غالباً ان کے خیال میں کمرے میں جاسوسی کے آلات لگائے گئے تھے۔ میں نے اپنی ضد میں زور دے کر کہا ''ضیاء بزدل ہے، غدار ہے۔''

''اس نے بہت بڑی غداری کی ہے۔'' میں نے بلند آواز سے کہا۔ یہ امید رکھتے ہوئے کہ میرے الفاظ ریکارڈ ہو رہے ہوں گے اور یہ یقین کرتے ہوئے کہ ایسے بڑے ہجوم والد کے محافظ ثابت ہوں گے۔

''تم بے احتیاطی کر رہی ہو۔'' میرے والد نے زور دے کر کہا۔ ''تم مغرب کی کسی جمہوریت میں نہیں، تم اپنے گھر میں بھی مارشل لاء کے ماتحت ہو۔''

سیاسی جلسے تواتر سے ہو رہے تھے۔ ضیاء نے 18 اکتوبر کو انتخابات کے انعقاد کا پروگرام بنایا تھا اور 18 ستمبر سے ایک ماہ کی انتخابی مہم کی اجازت دینے والا تھا۔ جب میرے والد نچلی منزل میں پارٹی رہنماؤں کے ساتھ ملاقاتوں میں مصروف رہتے تھے، میں اوپر کی منزل میں کھانے کے کمرے میں اردو کے اسباق پڑھنے میں مصروف رہتی تھی۔ ''تمہیں اپنی اردو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔'' میرے والد نے مجھے بتایا۔ ''میری بجائے تمہیں بولنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' میں اردو اخبارات کا مطالعہ بغور کرتی اور اتالیق سے سیاسی اصطلاحات کی شد بد حاصل کرتی۔ ''یہ کیسے جا رہی ہے۔'' میرے والد نچلی منزل میں سیاسی ملاقاتوں کے وقفوں کے دوران اوپر کھانے کے کمرے میں دروازہ کھول کر میرے استاد سے پوچھتے۔

اب جبکہ نئی انتخابی مہم میں صرف دو ہفتے رہ گئے تھے، ضیاء نے اس پرانے الزام کو استعمال کر کے میرے والد کو گرفتار کرنے کا ایک بہانہ بنایا لیکن ایک مرتبہ پھر ضیاء کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ عدالت عالیہ کے جس جج نے یہ الزامات سنے، اس نے ریکارڈ کردہ تمام مواد کا جائزہ لینے کے بعد اسے ''متضاد اور نامکمل'' قرار دیا اور میرے والد کو کسی طرح بھی اس قتل میں ملوث نہیں پایا۔ اس نے میرے والد کی ضمانت پر رہائی کا حکم دے دیا۔ میں دوبارہ مستقبل کی خوش امیدی پر خوش تھی۔ ''اگر سول عدالتوں نے وزیراعظم کو رہا کر دیا ہے تو میں بھی انہیں مارشل لاء حکم کے ماتحت گرفتار کرنا نہیں چاہتا۔'' ضیاء نے صحافیوں سے اس فیصلے پر یہ تبصرہ کیا۔

میرے والد 13 ستمبر کو سیدھے گھر کراچی پہنچے اور اگلی صبح شاہ نواز کے ساتھ ماہ رمضان کے خاتمہ پر لاڑکانہ میں میرے بھائی میر کے پاس جا کر عید منانے کا پروگرام بنایا۔ اب ہم پر دباؤ بھی شدید ہو گیا۔ صرف پانچ دن بعد انتخابی مہم کا آغاز ہونا تھا اور میرے والد نے اگلے تین دنوں میں 90 جلسوں سے خطاب کرنے کا پروگرام طے کیا تھا۔ معمول کے مطابق پورا کنبہ والدین کے سونے کے کمرے میں اس رات جمع ہوا جہاں گفتگو نے ایک غیر متوقع موڑ لیا۔ ''تم جانتی ہو نصرت! پنکی کی اب شادی ہو جانا چاہیے۔'' میرے والد نے بستر پر لیٹتے اور سگار کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کے لیے برتلاش کروں گا۔'' میں صوفے پر سیدھا تن کر بیٹھ گئی۔ ''میں ابھی شادی کرانا نہیں چاہتی۔'' میں نے احتجاج کیا۔ ''میں تو ابھی کچھ عرصہ پہلے گھر پہنچی ہوں۔'' صنم اور شاہ کو بچپن کی طرح مجھے تنگ کرنے کا موقع مل گیا۔ ''تمہیں شادی کرنا ہو گی۔ تمہیں شادی کرنا ہو گی۔'' انہوں نے گنگنانا شروع کر دیا۔ ''دراصل.....'' میرے والد نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنی پسند کا ایک لڑکا دیکھ لیا ہے۔'' میری والدہ مسکرائیں۔ غالباً شادی کا منصوبہ پہلے ہی بن چکا تھا۔ ''میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔ آپ مجھے ہاں کہنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔'' میں نے باغیانہ انداز میں کہا۔ ''تم

اپنے والد کو "نہیں" بھی تو نہیں کہہ سکتی۔" پاپا نے کہا جو شاہ اور صنم کو کورس میں گنگنایا۔ "نہیں، نہیں، نہیں۔" اتنے میں میرے والد کے لیے عشائیہ کی ٹرالی آ گئی جس سے میں مزید جھگڑے میں پڑنے سے بچ گئی۔ بفضل خدا، گفتگو کا عنوان بدل گیا لیکن نیا مضمون اور بھی پریشان کن ثابت ہوا۔

"مجھے بتایا گیا کہ ضیاء کسی قیمت پر مجھے نہیں چھوڑے گا، اس لیے مجھے بھاگ جانا چاہیے۔" پاپا نے اپنے طعام کے دوران کہا۔ "پی پی پی کے ایک رہنما نے آج مجھ سے رقم مانگی تاکہ وہ فرار اختیار کر سکے۔ اس نے مجھے بھی مشورہ دیا کہ میں بیرون ملک چلا جاؤں۔" میں نے کہا "لیکن میں چوہا نہیں ہو جو مفرور ہو جاؤں۔ میں یہیں رہوں گا اور ضیاء کا سامنا کروں گا۔"

"اور آپ انتخابات جیت جائیں گے اور جنرل ضیاء پر غداری کا مقدمہ چلائیں گے۔" میں نے بلند آواز سے کہا۔ "احتیاط کرو پنکی۔" میرے والد نے دیواروں کی طرف جاسوسی آلات کا اشارہ کرتے ہوئے مجھے خبردار کیا مگر میں اپنے والد کو حراست سے آزاد ہونے پر اور دوبارہ گھر میں دیکھ کر محتاط رہنے کے متعلق بھول چکی تھی۔ میں نے ضیاء کی غداری پر اپنے تبصرے کو جاری رکھا، یہاں تک کہ میرے والد غصے میں آ گئے۔

"چپ رہو۔" انہوں نے ناراضگی سے کہا۔ "تم نہیں جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" ہم نے ایک دوسرے پر نگاہ ڈالی اور غصے اور رنج میں میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اب معترف ہوں کہ انہیں علم تھا، واقعات کیا موڑ لینے والے ہیں اور وہ حقیقت پسند تھے جسے میں دیکھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ انہیں پتہ چلا کہ جنرل ضیاء کس قدر سنگدل ہے اور وہ مجھے اشتعال انگیز بیانات کے اظہار سے روکنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن میں اس وقت بہت اڑیل مزاج تھی اور ایسی چیزوں سے لاپروا۔ میں نے کتنی ہی مرتبہ بعد میں خدا کا شکر ادا کیا کہ انہوں نے لاڑکانہ جانے سے پہلے مجھے صحیح معنوں میں حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر دیا۔

"جو کچھ میں نے تمہیں کل رات کہا، اسے دل کی گہرائیوں میں مت لے جاؤ۔" صبح وہ میرے کمرے میں آئے اور انہوں نے میرے بستر کے ایک کنارے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔"

پاپا نے مجھے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔

"میں سمجھتی ہوں پاپا اور میں بھی معافی مانگتی ہوں۔" میں نے انہیں الوداعی بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ مجھے ان کی خاکستری رنگ کی قمیض شلوار اور شالیمار کی خوشبو کا نظارہ ابھی تک یاد ہے۔ یہ آخری مرتبہ تھا، جب میں نے انہیں آزاد دیکھا۔

(روزنامہ "سنڈے ایکسپریس" 6 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

''رمزی یوسف کو بھی مجھے قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا''

شہید بے نظیر کی معرکہ آراء سوانح حیات ''دختر مشرق'' سے انکشافات خیز چند اقتباسات

ترجمہ: شاہین مصطفیٰ

جس بات پر مجھے بہت زیادہ فخر ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے ایک ایسے معاشرے میں خواتین کے حقوق کے فروغ کے کام کو مکمل کیا جہاں کافی عرصہ سے انہیں نظر انداز کیا جا رہا تھا اور جہاں کھلے عام ان سے برا سلوک کیا جاتا تھا، میں نے اپنی کابینہ میں متعدد خواتین کو شامل کیا اور ترقی نسواں کی وزارت قائم کی۔ ہم نے یونیورسٹیوں میں خواتین کی تعلیم کے پروگرام شروع کئے اس امر کو یقینی بنایا کہ جیل میں قید خواتین بہتر طریقہ سے قانونی مشورہ اور نمائندگی کی سہولت حاصل کر سکیں۔

ہم نے صرف خواتین کو قرضہ دینے کے لیے وومن ڈویلپمنٹ بینک قائم کیا۔ علاوہ ازیں خواتین کو عام بینکوں سے قرضہ لینے کی سہولت بھی حاصل تھی ہم نے خاندانی منصوبہ بندی، غذائیت کے متعلق مشاورت، چائیلڈ اور برتھ کنٹرول کے لیے ادارے تشکیل دیئے۔ بین الاقوامی سطح پر منعقد ہونے والے کھیلوں کے مقابلے میں خواتین کی شرکت کو قانونی شکل دی اور اس عمل کی حوصلہ افزائی کی جس پر ضیاء نے فوجی آمریت میں پابندی عائد تھی۔

یہ ایک ایسے معاشرے میں ٹھوس آغاز تھا جہاں ایک مشکل دہائی میں اسلام کو معاشرے میں خواتین کی حیثیت کو دبانے کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ ہم نے تمام سیاسی اور انتظامی رکاوٹوں کے باوجود یہ امور سرانجام دیئے جب میں پہلی دفعہ وزیر اعظم کے دفتر میں گئی تو وہاں ڈپٹی سیکرٹری کے علاوہ اور کوئی سٹاف موجود نہیں تھا۔ مجھے فوری طور پر ایک ٹیم کو لندن بھیجنا پڑا تا کہ وہ یہ تعلیم حاصل کر سکیں کہ برطانوی وزیر اعظم کا دفتر کس طرح کام کرتا ہے اس طرح میرے دفتر کو مکمل انداز میں کام کرنے کے قابل بنایا جا سکے، علاوہ ازیں کئی روز تک مجھے فائلیں نہ بھیجی گئیں، کیبنٹ سیکرٹری کو ہدایت دی گئی تھی کہ فائلیں ایوان صدر بھیجی جائیں۔

میری حکومت کے پہلے دور میں سب سے اہم مسئلہ ہمسایہ ممالک افغانستان کی صورت حال تھی 1979ء میں جب سوویت یونین نے افغانستان پر قبضہ کیا تو پاکستان نے مجاہدین کی مدد کرنے کے لیے امریکہ کی شراکت داری میں کام کیا۔ امریکہ کے لیے اس کی حیثیت سرد جنگ کی حکمت عملی کے فعل جیسی تھی اسی سوچ نے اسے مداخلت کی تحریک دی، امریکہ کو افغانستان میں سوویت یونین کو اس کے وسائل اور منشاء سے محروم کرنے کا راستہ نظر آیا اس نے سوویت یونین کے غلط حملہ اور قبضہ سے فائدے اٹھانے کی کوشش کی۔ افغانوں، پاکستان کی آئی ایس آئی اور فوج کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا افغانستان میں روس کے خلاف خونی اور بالآخر مکمل جنگ کی جس کا نتیجہ 1990ء میں براہ راست سقوط روس کی

صورت میں نکلا۔

افغانستان میں پاکستان کے مفاد کی نوعیت پیچیدہ اور کثیر الجہتی تھی۔ افغانستان کا پاکستان کے ساتھ دیرینہ تنازعہ تھا جو "ڈیورنڈ لائن" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں 1947ء میں جب برصغیر کی تقسیم ہوئی تو پشتونوں کے اہم عناصر نے پاکستان کے قیام کی مخالفت کی۔ اہم افغان شخصیات کے بھارت کے ساتھ قریبی تعلقات تھے افغانوں کے دلوں میں پاکستان کے بارے میں شکوک وشبہات اور بداعتمادی کے احساسات تھے۔ افغانستان کے صدر داؤد نے 1970ء میں پاکستان کے قبائلی علاقہ میں بغاوت کی حمایت کی تھی جس کا جواب ہم نے ڈیورنڈ لائن کے پار جوابی بغاوت کی صورت میں دیا، دونوں ممالک کے درمیان سرحد حالت التوا میں تھی۔ فروری 1989ء میں جنیوا مذاکرات کی شرائط کے تحت افغانستان سے روسی افواج کے فوری انخلاء کے ساتھ پاکستان نے عبوری افغان حکومت کی تشکیل میں مدد دی۔ جنرلوں نے سفارشات پیش کیں کہ ہم افغان لیڈر سیاف کو صدر بناتے ہیں اور حکمت یار کو وزیراعظم کے عہدے پر برقرار رہنے دیتے ہیں میں نے اس سے اتفاق نہ کیا، میں نے فوج سے کہا آپ کے خیالات اور میری حکومت کی سوچ میں سمجھوتہ ہونا چاہیے، میں صدر کے طور پر ایک اعتدال پسند کی حمایت کرنا چاہتی ہوں، آپ اپنی پسند کے کسی شخص کو وزیراعظم بنا سکتے ہیں۔ ہماری کوششوں کے ساتھ افغان گروپوں نے صدر مجددی اور وزیراعظم سیاف کو افغان عبوری حکومت کے رہنماؤں کے طور پر قبول کیا۔

یہ کوئی آسان راستہ نہیں تھا۔ ایوان صدر میں ہمارے طویل اجلاس ہوئے جہاں ہم پیپلز اسمبلی کے لیے افغان گروپوں میں اتفاق رائے پیدا کرنے کی سخت کوشش کرتے رہے جب کبھی اذان کی آواز آتی تمام آدمی چلے جاتے اور میں اکیلی رہ جاتی، انہیں یہ گوارہ نہیں تھا کہ ایک عورت ان کے ساتھ نماز میں شریک ہو، مجھے یہ صورت حال بہت عجیب محسوس ہوتی تھی کیونکہ کعبہ شریف میں تمام مرد اور عورتیں اکٹھے دعا کرتے ہیں اسی طرح مدینۃ النبی میں بھی اکٹھے دعا کی جاتی ہے۔

سعودی انٹیلی جینس چیف شہزادہ ترکی بن فیصل اور ایرانی وزیر خارجہ اکثر دورے کرتے، ہر دفعہ جب میں نے اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش کی مجھے میری انٹیلی جینس ایجنسیوں نے مطلع کیا کہ یا تو سعودی یہ نہیں چاہتے کیونکہ شیعہ فرقہ کو غیر متناسب حصہ دیا جا رہا تھا یا ایرانی یہ نہیں چاہتے کیونکہ صدر مجھے اور میرے ساتھیوں کو قدرتی غیر جانبدار شخصیت دکھائی دیئے لیکن ایرانی بادشاہ ان کو نہیں چاہتے تھے، میں نے افغان گروپوں کے ساتھ بحث وتمحیص کے عمل کیلئے بہت زیادہ وقت دیا مجھے اکثر محسوس ہوا کہ وہ انٹیلی جنس ایجنسیوں کے اہلکاروں سے بریفنگ پوائنٹس لیتے تھے اسی لیے وہ سمجھوتہ نہ کر سکے۔ انٹیلی جنس سروس نے اصرار کیا کہ وہ افغانوں کو قائل نہیں کر سکی اس لیے ہمیں خاموشی سے اشاروں کو سمجھ کر کھیل کھیلنا ہوگا مجھے افغانوں کی حالت زار دیکھ کر بہت افسوس ہوا وہ طاقتور غیر ملکی قوتوں میں کچلے گئے تھے اور اگر وہ اپنے سرپرستوں کی پالیسی سے انحراف کرتے تو ان کا انجام تباہی پر ہوتا۔

O

پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹر جنرل ضیاء مولانا مودودی کے بہت قریب تھے جو جماعت اسلامی کے مذہبی رہنما تھے اور اسلامی برادری میں ان

کی قائدانہ حیثیت تھی۔ جب سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کیا جنرل ضیاء الحق نے جماعت اسلامی سے رجوع کیا اور اس کے ذریعے اسلامی برادری سے مدد کے لیے رابطہ کیا۔ انہوں نے مولانا مودودی کے کام کو فوج کے نصاب میں متعارف کرایا اور فوج اور تعلیمی اداروں کو اعتدال پسندوں سے پاک کیا جلد ہی آئی جے آئی کو فنڈز دیے تا کہ وہ ہیڈ کوارٹر بنائیں۔ نام نہاد تھنک ٹینکس کی تشکیل کریں اور فوجی حکومت کو مشورہ دیں کہ مہاجرین کیمپوں کے بچوں کو متاثر کرنے اور انتہا پسند مدرسے قائم کرنے کے لیے فنڈز کو کیسے استعمال کیا جائے اسلامی دنیا میں فنڈز جمع کرنے کے لیے سرگرمیاں شروع کی گئیں جہاں لوگ غریب اور ضرورت مند لوگوں کے لیے تعلیم، صحت اور خوراک کے لیے چندہ دیتے۔ یہ رقم ان سیاسی مدرسوں میں گئی جن کا دعویٰ تھا کہ وہ مہاجر کیمپوں کے یتیم بچوں کو تعلیم دے رہے ہیں اور ان کی پرورش کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہ ادارے نفرت اور دہشت گردی کی تبلیغ کر رہے تھے۔

انٹرنیشنل فنڈز پاکستان میں آئے، تاہم ان کا رخ آئی ایس آئی کے ہیڈ کوارٹرز کی طرف موڑ دیا گیا۔ ضیاء نے اس نقطۂ نظر پر اصرار کیا کہ سی آئی اے اور دوسری تنظیموں اور ملکوں کی طرف سے دیئے جانے والے فنڈز کا معاملہ ان کی فوجی حکومت پر چھوڑ دیا جائے جو مجاہدین کے معاملات کو منضبط کرے۔ ان کی تربیت کرے اور انہیں فنڈز اور اسلحہ فراہم کرے۔ یہ ایسا فیصلہ تھا جس کا قلیل المدت مقاصد کے لیے دفاع کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اس کے طویل المدت نتائج دنیا پر منڈلاتے رہیں گے۔

جب میں نے جون 1989ء میں امریکہ کا دورہ کیا تو وائٹ ہاؤس میں صدر بش اور مسز بش کی طرف سے میرے اعزاز میں دیا گیا شاندار سٹیٹ ڈنر عوام کی زبردست توجہ کا مرکز بنا۔ کانگریس کے مشترکہ سیشن میں میرا زبردست استقبال میرے لیے اور میرے ملک کے لیے زبردست موقع تھا۔ لیکن اس دورے کے دوران ایک اور واقعہ پیش آیا جو میرے لیے بہت زیادہ اہمیت کا باعث تھا، جب میں نے صدر بش کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں الگ ملاقات کی تو میں نے انہیں اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ میں نے کہا کہ افغانستان میں سوویت یونین کے ساتھ موثر طریقہ سے مقابلہ کرنا ہمارا مشترکہ جذبہ تھا، ہمارے ملکوں نے مجاہدین میں سے سب سے زیادہ جنونی عناصر کو طاقت دینے کا سٹریٹجک فیصلہ کیا جو بعد میں قابو سے باہر ہو سکتا ہے میں نے صدر بش سے افسردگی سے کہا" جناب صدر میں خوفزدہ ہوں کہ ہم نے فرینکنسٹائن کی عفریت تخلیق کر دی ہے جو مستقبل میں واپس آ کر ہمیں خوف زدہ کر سکتی ہے۔"

یہ المناک تھا کہ میں نے مستقبل کے واقعات کی پیش گوئی کر دی تھی۔ امریکی روسیوں کو شکست دینے کا قلیل المدت مقصد حاصل کر کے افغانستان چھوڑ گئے۔ جمہوریت کو موقع ملنا چاہیے تھا تاہم اس مقصد کے لیے اور جمہوریت کو مستحکم کرنے کے لیے بین الاقوامی امداد کی ضرورت تھی تا کہ اسے فوج کی طرف سے عدم استحکام کا شکار کرنے کی کوششوں سے تحفظ دیا جا سکتا لیکن اس مقصد کے لیے بین الاقوامی امداد حاصل نہیں تھی۔ روسیوں کے جانے کے بعد اور دیوار برلن کے انہدام کے ساتھ یورپ میں ڈرامائی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ دنیا کی توجہ اب اور طرف مبذول ہو چکی تھی۔

اگرچہ بہت کم لوگوں کو اس وقت اس حقیقت کا ادراک تھا۔ افغانستان میں سوویت تسلط کا خاتمہ ایک نئی جنگ کا آغاز تھا انتہا پسند مذہب کا

نام لے کر مغرب سے مقابلہ کرنے کے لیے پُرعزم ہو گئے۔ ان کے نزدیک اعتدال پسند پی پی پی اور میں ان کی اس فتح کے خوابوں کے راستہ میں خطرات کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس کی بنیاد اسلامی دنیا کے عوام کے مذہبی جذبات کے استحصال کرنے پر تھی۔

سوویت یونین کو طاقت کے ذریعے باہر نکالنے کے تجربہ اور اس کے نتیجے میں عالمی طاقت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی حقیقت نے انتہا پسندوں پر نشہ طاری کر دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ مغرب سے بھی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مغربی انٹیلی جنس کی اہم شخصیات میری نسبت جنرل ضیاء سے معاملات طے کرنے میں زیادہ آسانی محسوس کرتی تھیں۔ میں ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی تھی، جسے وہ سوشلسٹ اور پاکستان کے جوہری پروگرام کا بانی تصور کرتے تھے۔ علاوہ ازیں میرے بھائیوں نے سوویت قبضہ کے دوران افغانستان میں ''الذوالفقار'' کی تشکیل کی تھی۔

ایک مغرب نواز جنرل نے مجھے کہا آپ کی فوج نے روسیوں کو شکست دی ہے اور آپ کی طرف سے ایک کال پر ہم امریکہ کو شکست دے سکتے ہیں میں نے اس ششدر کر دینے والے بیان کا اپنے ایک سفیر سے ذکر کیا وہ فوراً چلے گئے اور میری گفتگو امریکی سفیر تک پہنچا دی جس نے ان سے کہا یہ کبھی سچ نہیں ہو سکتا۔ وہ شخص الکوحل پیتا تھا۔

میری حکومت کے پہلے ہفتے میں جب میں لاہور اتری، پھولوں کے گملے سے ایک بم برآمد ہوا اس نے اس وقت چلنا تھا جب میں نے اس کے پاس سے گزرنا تھا عوام کو میرے خلاف کرنے کے لیے افواہیں پھیلا کر لوگوں کو سڑکوں پر لانے کی بار بار کوشش کی گئی ان میں ایک احمقانہ مثال ان کا یہ الزام تھا کہ ایسے ملک کی وزیراعظم نے پیرس سے مہنگے دوپٹے خریدے ہیں جس کی عوام غریب ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ میں نے دوپٹے کراچی کے ایک بازار سے خریدے اور میں پاکستان کے عوام کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس طرح کی احمقانہ افواہوں کو مسترد کر دیا اور میرا ساتھ دیا جس نے پاکستانی معاشرے میں تبدیلی لانے کی کوشش کی۔

O

میرے انتخاب کے ایک ماہ کے اندر آئی ایس آئی کے سربراہ بریگیڈیئر امتیاز اور ان کے ڈپٹی نے میرے اراکین پارلیمنٹ سے رابطے کرنے شروع کر دیے تھے۔ وہ ان اراکین پارلیمنٹ کو مجھے چھوڑنے کیلئے کہہ رہے تھے ان کا پسندیدہ انداز یہ تھا کوئی اسے نہیں چاہتا امریکی اسے نہیں چاہتے فوج اسے نہیں چاہتی، اور جوں ہی وہ حکومت سے باہر ہوتی ہے اس کا شوہر بھی اسے اچانک چھوڑ دے گا۔

افغانستان میں جہاد کی کامیابی کے ساتھ ان کا منصوبہ تھا کہ مغرب کی طاقت اور اقتدار کا مقابلہ کیا جائے کیونکہ حکومت کی باگ ڈور میرے ہاتھوں میں تھی اس لیے وہ یہ کام آزادانہ طریقہ سے سرانجام نہ دے سکے آئی ایس آئی نے ڈکٹیٹر ضیاء کے سیاسی فرزند نواز شریف کو وزیراعظم بنانے کا عہد کیا۔ نواز جو پہلے ہی وزیراعلیٰ پنجاب کے عہدے پر فائز تھے نے اعلان کیا کہ وہ احکام کی مزاحمت کریں گے تاکہ عملی طور پر پورے ملک کی بجائے میں صرف اسلام آباد کی وزیراعظم بننے تک محدود رہوں۔

آئی ایس آئی کے سربراہ نے میری سیاسی بنیاد کا مقابلہ کرنے کے لیے انٹیلی جنس کا دائرہ کار بڑھانے کے لیے مجھے تجویز پیش کی کہ میں تسلسل برقرار رکھنے کے لیے ایک نئی انٹیلی جنس کور کی تشکیل کروں۔ مجھے کہا گیا کہ تمام سینئر سرکاری افسروں کی ترقیوں کی پہلے آئی ایس آئی کے ذریعے

چھان بین کی جائے۔ میں نے یہ تجویز مسترد کر دی اور اسے کہا جنرل ضیاء نے سوویت یونین اور بھارت کے ساتھ دو محاذ جنگ کا سامنا کیا لیکن انھیں گاؤں کی سطح پر بھی انگ فوجی کور کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور میں بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ آئی ایس آئی کے سربراہ نے اصرار کیا۔ ان کا موقف تھا کہ آئی ایس آئی کی توسیع کے بغیر اور ان ہی افسروں کے تسلسل کے بغیر ملک کی نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کے لیے سکیورٹی کنٹرول کو برقرار رکھنا مشکل ہے مجھے کہا جا رہا تھا کہ میں ریاست کے اندر ریاست بنانے کے لیے حکم دوں اور اس عمل کو قانونی جواز بھی مہیا کروں جو پاکستان میں انتخابات سمیت زندگی کے ہر پہلو میں جوڑ توڑ کرنے کا باعث ہوتا ہے میں نے انکار کر دیا تاہم میری حکومت برطرف کیے جانے کے بعد عبوری وزیراعظم غلام مصطفیٰ جتوئی (جسے آئی ایس آئی لائی) نے ان کی سکیم پر عمل کیا جنرلوں کی سیاسی مخالفت کے باوجود مجھے فوج کی طرف سے زبردست حمایت ملنے کا سلسلہ جاری رہا 23 مارچ 1989ء کو جب جنرل بیگ اور میں اپنی پہلی مارچ پاسٹ پریڈ میں گئے تو فوجیوں کے خاندان گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے میری کار کے گرد اکٹھے ہو گئے اور کار کی رفتار کم کرنے کے لیے مجبور کیا۔ جنرل بیگ نے جو عوام کی محبت کے اظہار کے طریقوں سے ناآشنا تھے نے پریشانی سے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ میرے ملٹری سیکرٹری نے جواب دیا فوجیوں کے خاندان وزیراعظم کو دیکھ کر خوش ہیں بیگ خوش نہ تھے فوج اور جنرلوں میں دو دہائیوں کے تصادم کے باوجود میں ہزاروں اور سینکڑوں میں یہ امتیاز کر لیتی ہوں کہ چند مٹھی بھر افسروں کے برخلاف عزت اور وقار سے ملک کی خدمت کر دں جنھوں نے میری مخالفت کی ان افسروں پر افغان جہاد کے اثرات تھے۔

میں نے خاتون کو وزیراعظم بنانے کے نکتہ پر او آئی سی میں پاکستان کی رکنیت معطل کرنے کی کوشش کامیابی سے ناکام بنائی۔ مختلف اسلامی ممالک کے علماء میرے انتخاب کے متعلق جھگڑے پر اتر آئے وہ مختلف فتوے اور حکم دینے لگے۔ بدقسمتی سے ایک سعودی عالم دین شیخ باز جو نابینا تھے لیکن ممتاز حیثیت رکھتے تھے، میرے متعلق فتویٰ دیا کہ مسلمان ملک کی سربراہی کرنا عورت کے لیے غیر اسلامی فعل ہے، تاہم میں خوش قسمت ہوں کہ چین، شام، مصر، عراق جہاں زیادہ سیکولر حکومتیں ہیں ان کے علماء نے اس صورتحال سے مجھے نجات دلائی۔

اگرچہ 1989ء میں اسامہ بن لادن نے القاعدہ کی تشکیل نہیں کی تھی میں نے پہلی مرتبہ اس کا نام اس وقت سنا جب اس نے میری پہلی حکومت کو برطرف کرنے کے لیے عدم اعتماد کی تحریک کے بل کے لیے فنڈز دیے وہ فروری 1989ء میں سوویت یونین کی فوجوں کے انخلاء کے بعد سعودی عرب واپس آ گئے تھے لیکن جب میں نے مئی میں آئی ایس آئی پر اپنا دعویٰ منوالیا تو انھیں واپس بلا لیا گیا۔ بن لادن کو آئی ایس آئی نے کہا کہ وہ جمہوری حکومت کو گرانے اور مذہبی حکومت قائم کرنے کے لیے مدد دیں۔ بن لادن نے 10 ملین ڈالر کی بڑی رقم تحریک عدم اعتماد کے لیے دی تاکہ اس رقم سے میری حمایت کرنے والے اراکین پارلیمنٹ کو خریدنے کی کوشش کی جائے۔

افغانستان کی جنگ ختم ہونے کے بعد بن لادن کی پاکستانی سیاست میں اچانک مداخلت کو ایک ابتدائی علامت کے طور پر پڑھ لیا جانا چاہیے تھا اور اس امر کو سمجھ لیا جانا چاہیے، تاکہ اس کا مقصد اور دوسرے لوگوں کے ساتھ جنھوں نے جہاد کی حمایت کی ایک اسلامی ملک سے سوویت تسلط پسندوں کو نکالنے سے بہت بڑا تھا۔ یہ حقیقت میں اسلامی ریاستوں میں خلافت کا بگڑا ہوا تصور تھا، جو یورپ، ایشیاء افریقہ میں مذہبی انتہا پسندوں کے کنٹرول کے تحت پھیل رہا تھا۔

کسی بھی صورت میں مجاہدین جو کسی وقت امریکہ اور مغرب کے قریبی دوست تھے اپنے پرانے سرپرستوں کے خلاف ہو رہے تھے۔ انھوں نے کسی حد تک یہ سوچ لیا کہ وہ امریکہ کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ اس وقت بھی جب کہ کابل پر حکومت مشکل ثابت ہو رہی تھی۔

اس دوران مجھے ایک رپورٹ موصول ہوئی کہ ایک سعودی طیارہ آموں کے ڈبے لے کر پاکستان اترا ہے۔ چونکہ سعودی عرب میں کھجوریں اگتی ہیں آم نہیں اس لیے ان کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہوئے۔ سویلین انٹیلی جنس نے پتہ چلایا کہ ڈبوں میں آم نہیں بلکہ رقم تھی میں نے سوچا کہ مجھے شاہ فہد کی حمایت حاصل ہے۔ جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے میرے والد کی تعریف کی تھی اور یاد دلایا تھا کہ کس طرح انھوں نے میرے والد کی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ میرے والد کا قتل ''غیر منصفانہ'' تھا۔ وہ میرے والد کے بھائی کی طرح تھے اور مجھے اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے۔ اس لیے میں نے اپنے وزیر قانون کو سعودی عرب بھیجا کہ وہ ان سے استفسار کریں کہ کیا وہ اپنی بیٹی سے ناراض ہیں اور اس کے مخالفین کو فنڈ زمہیا کرنے کے لیے سعودی پیسہ پاکستان بھیج رہے ہیں۔ شاہ نے یقین دلایا کہ جو رقم پاکستان منتقل کی گئی ہے اس کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے بیان کیا کہ کچھ لوگ جو افغان جہاد سے متاثر ہیں وہ اپنا نجی پیسہ بھیج رہے ہیں۔ شاہ کے ایک مشیر نے رقم بھیجنے کا ذریعہ دریافت کر لیا یہ اسامہ بن لادن تھے۔

O

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں رمزی یوسف نے نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر پہلے حملہ میں حصہ لیا تھا۔ القاعدہ کے پہلے حملہ کی اس طرح منصوبہ بندی کی گئی تھی کہ ایک مینار دوسرے مینار پر گرتا۔ فروری کی بمباری کے بعد یوسف امریکہ سے بچ کر نکل آیا اور پاکستان پہنچ گیا۔ 7 ماہ بعد اسے میرے قتل کی ذمہ داری سونپی گئی۔ 1993ء کی انتخابی مہم کے دوران وہ الگ مواقع پر اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔

ستمبر میں اس نے اپنے 2 ساتھیوں کے ساتھ میرے گھر کے سامنے کی گلی میں ایک بم رکھا جسے ریموٹ کنٹرول سے چلایا جانا تھا، اس کی منصوبہ بندی یہ تھی کہ جوں ہی میری گاڑی گیراج سے باہر نکلے بم دھماکے سے پھٹ جائے جب وہ یہ بم نصب کرنے کی کوشش کر رہا تھا ایک پولیس اہلکار نے وہاں سے گزرتے ہوئے اسے روکا اور پوچھا کہ وہ کیا کر رہا تھا، اس نے کہا کہ وہ اپنی چابیاں ڈھونڈ رہا تھا جو گلی میں گر گئی تھیں۔ پولیس اہلکار کو شبہ ہوا اس نے اسے فوری طور پر وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ بظاہر یوسف نے اس رات کو اس بم کو ناکارہ بنانے کی کوشش میں اپنے آپ کو زخمی کر لیا اور علاج کے لیے ہسپتال گیا۔ ہسپتال کی فائلوں کے مطابق اس رات اس کی ایک انگلی ضائع ہو گئی۔

یہ کوششیں نہ رکیں رمزی یوسف اور اس کا گروپ اپنے چچا خالد محمود شیخ اور اس کے حمایتیوں کی واضح ہدایات پر مجھے قتل کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ خالد شیخ جسے اب ہم جانتے ہیں القاعدہ کا سی ای او بن گیا۔ اس پر وال سٹریٹ جرنل کے بیورو چیف ڈینیل پرل کو قتل کرنے کا شک ظاہر کیا گیا ہے۔ (آج کل وہ امریکہ کی تحویل میں ہے) انھوں نے مجھ پر حملہ کرنے کی پھر منصوبہ بندی کی لیکن اس مرتبہ منصوبہ زیادہ پیچیدہ تھا اس کا ایک ثانوی سیاسی مقصد بھی تھا کہ پی پی پی کے عناصر کو ایک دوسرے کے خلاف کر دیا جائے۔

القاعدہ اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کا بتایا ہوا منصوبہ میرے قتل پر مبنی تھا اور اسے اس طرح ظاہر کرنا مقصود تھا جیسے میرا بھائی اس کا ذمہ دار تھا۔

میں نے نشتر پارک کراچی میں ایک بڑی انتخابی ریلی میں شرکت کرنی تھی۔ خالد شیخ نے بہت سے جدید ہتھیاروں کا انتظام کیا ہوا تھا جو پشاور سے رمزی یوسف کو پہنچائے گئے جسے ٹرین کے ذریعے قتل کے مقررہ دن پہنچنا تھا منصوبہ اس طرح ناکام ہوگیا کہ نرین حیدر آباد دیر سے پہنچی اور ریلی کے ختم ہونے تک ہتھیار نہ پہنچے، مضحکہ خیز امر یہ ہے کہ فروری 1995ء میں رمزی پاکستان میں گرفتار کیا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے میرے خلاف قاتلانہ حملوں کی کوششیں کرنے پر گرفتار کیا گیا ہے۔ اس نے پاکستان فیڈرل انویسٹی گیشن اتھارٹی کو بتایا کہ ہمارے ذہن میں اس کے لیے بھی حق موجود تھا تاہم ہتھیار وقت پر نہ پہنچے اسے میرے حکم پر امریکہ کے حوالے کر دیا گیا۔

1993ء کے انتخابات میں پی پی پی نے پنجاب میں اکثریت حاصل کی تھی اور پنجاب اسمبلی میں مخلوط حکومت تشکیل دی جسے نواز شریف اور انتہا پسندوں نے میری پہلی حکومت کو کمزور کرنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ 1990ء میں میری حکومت کے خلاف انقلاب کے صرف 3 سال بعد پی پی پی پاکستان کی حکمران جماعت کی حیثیت سے واپس لوٹی میں ایک مرتبہ پھر وزیر اعظم تھی۔

دوسری دفعہ وزیر اعظم بننے کا غیر معمولی موقع ملنے کے بعد پر عزم تھی کہ ہر دن کو پاکستان کے کام کرنے والے گھرانوں کی زندگی بہتر بنانے کے لیے استعمال کروں اور خطرناک بین الاقوامی ماحول میں اعتدال پیدا کروں۔

جب میں نے دوسری مرتبہ پاکستان کی وزیر اعظم کی حیثیت سے حلف اٹھایا تو پاکستان کو درپیش بہت سے چیلنج میرے ذہن میں آئے۔ میرا ملک دہشت گرد ریاست قرار دیے جانے کے کنارے پر کھڑا تھا۔ کراچی میں فوجی آپریشن کیا جا رہا تھا اور پاکستان اقتصادی طور پر دیوالیہ قرار دیے جانے کے کنارے پر تھا۔ یہ کثیر الجہتی قومی بحران تھا۔

میں نے دوبارہ جہاں تک ممکن ہو سکا تیز اور موثر انداز میں پاکستان کو جدید دور میں لانے کی کوشش کی، ابتدائی مہینوں میں میری حکومت نے انتہائی آرزومندانہ سوشل ایکشن پلان (SAP) بنایا اور اس کا نفاذ شروع کیا۔ اس منصوبے کے مقاصد میں تعلیم، صحت عامہ، صحت و صفائی، انفراسٹرکچر، حقوق نسواں جیسے شعبوں میں ملکی سطح پر تیز ترقی کے اہداف حاصل کرنا تھا۔ (SAP) کا اہم نکتہ پبلک پرائیویٹ شراکت داری تھی جس میں یہ عزم کیا گیا تھا کہ مرکزی حکومت سے غیر معمولی حد تک فنڈز، بین الاقوامی ترقیاتی تنظیموں سے گرانٹس حاصل کی جائیں، اس کے ساتھ اسے پاکستان کے سرعت پذیر نجی شعبہ کی بھی مدد حاصل ہو۔

میری نئی حکومت کے پہلے سال ہی میں ہم نے 20 بلین ڈالر غیر ملکی سرمایہ کاری کا ریکارڈ ہدف حاصل کیا۔ ایک ہی سال میں ہم نے اتنی سرمایہ کاری حاصل کر لی جو گزشتہ 40 سالوں میں ممکن نہ ہو سکی تھی۔ نئی غیر ملکی سرمایہ کاری کا 80 فیصد حصہ پاور جنریشن میں تھا جس کا مقصد بجلی بند کرنے کے سلسلہ کو ختم کرنے کے عزم کا آئینہ دار تھا اور اس کا یہ بھی مقصد تھا کہ اقتصادی سرگرمیوں کو تیز رفتاری سے شروع کیا جائے۔

ہم نے سٹاک ایکسچینج کے قوانین کو جدید بنایا اور سٹیٹ بینک آف پاکستان کو کمپیوٹرائزڈ کیا۔ تمام ایشیا میں بجلی کے شعبہ میں سب سے کم نرخوں پر سرمایہ کاری کرنے کے لیے مذاکرات کیے اور اس طرح بجلی بند کرنے کا سلسلہ ختم کیا۔

نجکاری سے حاصل شدہ منافع سے ہم بڑے قرضے ادا کرنے لگے اور سود کی لاگت کم کی۔ پاکستان کی تاریخ میں ہم پہلی حکومت تھے

جنھوں نے صرف سود کی بجائے حقیقتاً اصل سرمایہ واپس کیا۔ ہم نے صنعتوں کی نجکاری متعارف کرائی اور اپنے اقتصادی اداروں کو اس قابل بنایا کہ وہ جدید دنیا میں ترقی اور تقابل کر سکیں۔ ملکی قرضہ کو کم کرنے کے لیے مشکل فیصلے کیے۔ ہم نے 3 بلین روپے کے غیر ترقیاتی اخراجات کم کیے جو اس وقت ہمارے ٹیکسوں کا ایک تہائی تھے۔ ان مشکل فیصلوں کے اچھے ثمرات وصول ہونے۔ پاکستان خوشحال ہونا شروع ہو گیا۔

O

جب میں نے وزیر اعظم کی حیثیت سے لندن کا دورہ کیا تو اس طرح کے اسلامی اتحاد کے داعی مذہبی انتہا پسند گروپ ڈورچسٹر ہوٹل کے باہر اور ان مقامات پر جمع ہو گئے تا کہ میرے خلاف نعرے بازی کر سکیں۔ ان انتہا پسندوں نے نعرے لگا کر لندن میں مجھے رات بھر جگائے رکھا اور مجھے احساس ہوا کہ انگلینڈ میں ان کی معقول تعداد موجود ہے چونکہ انتہا پسندوں نے مغرب سے مقابلہ کرنے کے لیے اپنی خواہش کو بہت کم چھپا کر رکھا اس لیے مجھے ملک سے باہر بھی ان کی رسائی کے متعلق تشویش لاحق تھی۔ اگلے روز جب میں برطانوی وزیر اعظم جان میجر سے ملی تو انھیں کہا کہ وہ ان مسجدوں کو چیک کریں جہاں امام (جنھوں نے افغان مہاجرین کی حمایت کی تھی) وعظ دیتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ پاکستانی آبادکاروں اور برطانوی پاکستانیوں کی دوسری نسل کو نفرت اور تشدد کی تعلیم دیتے ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ حیران ہو گئے۔ پاکستان میں مجھ پر انتہا پسندوں کا خطرہ عیاں تھا کیونکہ مجھے ہر روز دہشت گردوں اور انتہا پسندوں سے نمٹنا پڑتا تھا تاہم مغرب والوں کو اب بھی اس کا ادراک نہیں تھا۔ یہ صورتحال جلد تبدیل ہو گئی۔

انتہا پسندوں کی یہ سوچ غیر منطقی نہیں تھی کہ میں ان کے عزائم کے راستے میں رکاوٹ تھی۔ وہ اس لیے میری مخالفت کرتے تھے کہ وہ پاکستان پر مکمل قبضہ کرنا چاہتے تھے اس لیے انتہا پسندوں نے میری پالیسیوں کو ناکام بنانے اور میری دونوں حکومتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے توانائیاں صرف کیں اور اپنے وسائل کا بھرپور استعمال کیا۔

میں حقیقتاً یہ سوچتی ہوں کہ یہ کچھ اتفاقی امر ہے کہ دہشت گردوں کے بڑے حملے اس وقت ہوئے جب انتہا پسندوں کو ایک جمہوری پاکستانی حکومت سے نہ نمٹنا پڑا جب انھوں نے کسی پابندی اور نگرانی کے بغیر کام کیا ان میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر 1993ء اور 2001ء کے حملے، بمبئی دھماکے، بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ، افریقہ میں امریکی سفارتخانے پر حملہ شامل ہیں۔ میرا یقین ہے کہ اگر 1996ء میں پاکستان میں میری حکومت کو عدم استحکام سے دوچار نہ کیا جاتا تو طالبان اسامہ بن لادن کو افغانستان میں مرکز قائم کرنے کی اجازت، تمام اسلامی دنیا سے اعلانیہ نوجوان بھرتی کر کے انھیں تربیت دینے کا کام اور 1998ء میں امریکہ میں جنگ کا اعلان نہ کر سکتے۔

دوسری مدت اقتدار کے دوران مجھے سیکیورٹی پر بریفنگ دینے کے لیے ایک مرتبہ پھر جنرل ہیڈکوارٹرز میں مدعو کیا گیا۔ ڈائریکٹر ملٹری آپریشنز میجر جنرل پرویز مشرف (جو بلاشبہ بعد میں چیف آف آرمی سٹاف اور اقتدار تھین کر صدر بنے) نے مجھے بریفنگ دی۔ مجھے یہ گھسا پٹا منظر محسوس ہوا کیونکہ ایک مرتبہ پھر میں نے یہ سنا کہ اگر میں احکامات جاری کر دوں تو پاکستان کس طرح سرینگر پر قبضہ کر سکتا ہے۔ مشرف نے اپنی بریفنگ ان الفاظ پر ختم کی کہ فائر بندی ہو جائے گی اور پاکستان کا مقبوضہ کشمیر کے دارالحکومت سرینگر پر قبضہ ہو گا۔ میں نے ان سے استفسار کیا اس کے بعد کیا ہو گا؟ وہ میرے سوال سے حیران ہوئے اور کہا اس کے بعد ہم پاکستان کا جھنڈا سرینگر کی پارلیمنٹ پر لہرا دیں گے پھر کیا ہو گا؟ میں نے

جنرل سے پوچھا، اس کے بعد آپ اقوام متحدہ جائیں گی اور انھیں بتائیں گی کہ سرینگر اب پاکستان کے کنٹرول میں ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ میں نے اصرار جاری رکھا۔ میں دیکھ سکتی تھی کہ جنرل مشرف اس قسم کے سخت سوالوں کے لیے تیار نہ تھے اور اس صورتحال سے گھبرا گئے۔ انھوں نے کہا کہ اور..... اور آپ انھیں بتائیں گی کہ نئے جغرافیائی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے دنیا کا نقشہ تبدیل کر دیں۔

آپ جانتے ہیں اقوام متحدہ مجھے کیا کہے گا؟ میں نے جنرل مشرف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جبکہ آرمی چیف ساتھ بیٹھے تھے ماحول ساکت ہوگیا۔ میں نے واضح طور پر کہا وہ سلامتی کونسل کی قرارداد پاس کریں گے جس میں ہماری مذمت کی جائے گی اور مطالبہ کیا جائے گا کہ ہم یکطرفہ طور پر سرینگر سے فوجیں نکال دیں۔ ہمیں اپنی کوششوں سے سوائے بے عزتی اور تنہائی کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس کے بعد میں نے اچانک اجلاس ختم کر دیا۔

انتہا پسندوں کی طرف سے میری حکومت کو برطرف کرنے کی کوشش کا نتیجہ ستمبر 1995ء میں بریگیڈیئر مستنصر کی طرف سے انقلاب کی صورت میں نکلا۔ یہ گروپ اسلام آباد ہتھیار سمگل کر رہا تھا۔ انھوں نے ایک اجلاس کے دوران ملٹری ہیڈ کوارٹرز پر قبضہ اور تمام جنرلوں کو ہلاک کرنے کی منصوبہ بندی کی۔ اس کے بعد ان کا ارادہ یہ ظاہر کرنے کا تھا کہ ہلاک شدہ جنرل مجھے جی ایچ کیو لے جاتا اور پھر قتل بھی کرنا چاہتے تھے۔ جب جی ایچ کیو پر قبضہ کے لیے استعمال کرنے والے ہتھیار سرحد سے اسلام آباد جانے والے راستہ کے دوران روک لیے گئے تو گروپ نے دعویٰ کیا کہ وہ کشمیری عسکریت پسند تھے لیکن مقامی پولیس نے جو منتخب حکومت کی وفادار تھی۔ آئی ایس آئی کے ساتھ مل کر معاملے کی چھان بین کا فیصلہ کیا۔ آئی ایس آئی کے چیف نے ان کی گرفتاری اور انکوائری کے احکامات دیے۔

اس وقت جنرل وحید کاکڑ آرمی چیف تھے۔ انھوں نے مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے کہا میں نے انھیں وزیراعظم ہاؤس میں بلایا۔ سازش کی تفصیلات منکشف کرنے کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا وزیراعظم! آپ خوش قسمت خاتون ہیں۔

میں نے احتیاط سے قوم سے خطاب کا مطالعہ کیا جو سازش کے ایک کردار میجر ظہیر الاسلام عباسی نے پہلے ہی سے لکھ کر رکھا تھا۔ ان کا خطاب تمام مسلمانوں سے اس اپیل سے شروع ہوا کہ تمام مسلمان اسلامی انقلاب کے لیے متحد ہو جائیں جو رونما ہو چکا تھا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اب سے اسلامی دنیا میں کوئی سرحدیں نہیں ہوں گی۔ افغانستان اور پاکستان کے مابین سرحدیں ختم ہو جائیں گی کیونکہ اسلام کے مطابق ہم ایک قوم ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ کنفیڈریشن کا پرانا خیال تھا جو اب نئی زبان میں تیار کیا گیا تھا۔ یقیناً سخت گیروں کا یقین تھا کہ وہ افغانستان سے وسط ایشیا، ترکی، چیچنیا سے یورپ کے ساحلوں تک پہنچ سکتے ہیں اور اسلام پھیلا سکتے ہیں۔ یہ خلافت کے لیے القاعدہ کی طرح کا خاکہ تھا۔ جنرل وحید کاکڑ نے مجھے کہا وزیراعظم! میں ان افراد پر بغاوت کے الزام میں فوجی عدالتوں میں مقدمہ چلاؤں گا اور انھیں پھانسی پر لٹکاؤں گا۔ یہ سازشی افراد جنرل مشرف کے دور میں رہا کر دیے گئے۔

O

میں فوج میں انتہا پسندوں کے گھس جانے کی وجہ سے پریشان تھی اور جنرل کاکڑ سے کہا کہ وہ 1995ء میں اپنی ریٹائرمنٹ کی بجائے بعد میں بھی اس عہدے پر اپنی خدمات جاری رکھیں بدقسمتی سے جنرل کاکڑ نے آرمی چیف کی حیثیت سے اپنی ملازمت جاری رکھنے کی میری تجویز سے اتفاق نہ کیا۔

آئی ایس آئی کے ایک سابق افسر میجر عامر نے ٹی این ایس ایم (تحریک نفاذ شریعت محمدی) کے نام سے جنگجو تنظیم بنا رکھی تھی جو صوبہ سرحد میں فعال تھی اس تنظیم نے 1996ء میں صوبہ سرحد کے علاقے مالاکنڈ میں مسلح بغاوت تیار کی۔ مذہبی انتہا پسندوں نے پولیس سٹیشنوں پر قبضہ کر لیا اور میری پارٹی کے ایک رکن اسمبلی کو ہلاک کر دیا۔ میری حکومت نے ان کی چالبازیوں کے آگے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ ہم عسکریت پسندوں کو گرفتار کرنے کے بعد کامیاب تھے اور مالاکنڈ میں امن وامان قائم کیا۔ ایک پریس رپورٹ کے مطابق اس بغاوت کے ایک اہم لیڈر مولانا لیاقت 30 اکتوبر 2006ء کو باجوڑ واقعہ میں مارا گیا جبکہ اس کا ایک مسلح ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا جب مجھے دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کرنا پڑا تو میں نے وہ کیا جس کی ضرورت تھی اور مجھے عوام کی حمایت حاصل تھی۔ داخلی اور خارجی سطح پر دہشت گردی کے واقعات کم ہو گئے۔ جنوری 1996ء میں اکھوڑا ڈیم کا افتتاح کرنے کے لیے بلوچستان گئی یہ بلوچستان کے عوام کو پینے کا پانی فراہم کرنے کے لیے میرے وعدے کی تکمیل تھی۔ ایک سینئر صحافی نے مجھے آگاہ کیا کہ اسے آرمی ہیڈ کوارٹرز میں بلایا گیا۔ جہاں اسے بتایا گیا فوج اس (بے نظیر) سے تنگ ہے۔ ایک فولڈر اس کے حوالے کیا گیا جس میں موجود مواد پر منی کرپشن کے متعلق کہانیاں لکھنے کے لیے انہیں کہا گیا۔

مارچ میں فوج کے ایک میجر نے مجھے اطلاع دی کہ انٹیلی جنس نے میری حکومت برطرف کرنے کے لیے عدم استحکام کی کوششوں پر مبنی مکمل پروگرام تیار کیا ہے ایک ماہ بعد ایک اور فوجی افسر نے مجھے اطلاع دی کہ افسر ڈیل کرنے کے لیے سپریم کورٹ سے رجوع کر رہے ہیں۔ آئینی بحران کے بدلے میں جو صدر میری حکومت کو برطرف کرنے کے لیے برپا کرتے چیف جسٹس کو عبوری وزیراعظم بنانے کا وعدہ کیا گیا۔

میں نے اور میری ٹیم نے آرمی چیف جنرل کرامت سے بعض فوجی افسروں کے تبادلے کرنے کا ایشو اٹھایا لیکن وہ ایسا کرنے کے لیے متذبذب تھے۔ اس کی بجائے انہوں نے استعفیٰ دینے کی پیش کش کی جب میں نے ڈائریکٹر جنرل آف ملٹری آپریشنز جنرل محمود کے متعلق شکایت کی جو میرے خیال کے مطابق میرے خلاف مہم چلانے میں فعال کردار ادا کر رہے تھے۔ فوج اور انٹیلی جنس ایجنسیوں میں وہ تبدیلیاں جو 1995ء کے آخر میں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ جب جنرل کاکڑ ریٹائرڈ ہوئے اور جنرل جاوید اشرف کاکڑ آئی ایس آئی سے تبادلہ ہو گیا میری دوسری حکومت کی تباہی کا باعث بنیں۔

جنرل کاکڑ کی ریٹائرمنٹ کے بعد فوج کے سخت گیروں نے صدر کی حمایت حاصل کر لی اور میری حکومت کو برطرف کرنے کی سازش کی۔ صدر کے ایک رشتہ دار نے اگست 1996ء میں مجھے اطلاع دی کہ ملٹری انٹیلی جنس نے ان سے کہا ہے کہ وہ صدر تک ان کا پیغام پہنچا دیں۔ پیغام میں میری حکومت کو برطرف کرنے کے لیے اس انداز کی دھمکی دی گئی کہ جب تک وہ ایسا نہیں کرتے فوج صدر اور وزیراعظم دونوں سے نجات حاصل کر لے گی۔

فوج سے معاملہ طے کرنے والی آئینی قوتیں صدر کی بجائے میرے ساتھ ہوتیں تو میں ان لوگوں کے خلاف انضباطی کارروائی کا حکم دیتی جو قانونی حکومت کے خلاف جوڑ توڑ میں شریک تھے لیکن صدر میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ انٹیلی جنس کے جنرلوں کا مقابلہ کرتے۔

صدر اس فریب میں مبتلا تھے کہ فوج کی حمایت سے وہ دس سال تک صدر رہ سکتے تھے یہ یقینی امر ہے کہ صدر کو انٹیلی جنس نے ڈرایا دھمکایا تھا۔ آئی ایس آئی کے سابق سربراہ جنرل حمید گل اگست 1996ء میں آرمی کے سربراہ سے ملاقات کرنے کے لیے گئے انہوں نے جنرل جہانگیر کرامت سے کہا کہ صدر وزیراعظم کو برطرف کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن انہیں شبہ ہے کہ فوج کے سربراہ وزیراعظم سے بہت قریب ہیں۔ اگر یہ صورتحال نہیں ہے تو آرمی چیف کو صدر کے ساتھ وزیراعظم کو برطرف کرنے کا ایشو اٹھانا چاہیے۔

ان دو پیغامات جن میں سے ایک جنرل محمود کی طرف سے صدر کے رشتہ دار کو دیا گیا اور دوسرا جو جنرل گل نے ملٹری چیف کو دیا میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ فریب وہی پرانی کھیل کھیلا جا رہا ہے میرا اندازہ ہے کہ صدر کو دھمکی دی گئی تھی کہ اگر وہ حکومت کو برطرف نہیں کرتے تو انہیں بھی ہٹا دیا جائے گا۔ آرمی چیف کو دھمکی دی گئی کہ اگر وہ وزیراعظم کے بہت نزدیک ہیں تو انہیں صدر کے ذریعے ہٹایا جا سکتا ہے۔ اس وقت صدر کے پاس فوج کے سربراہوں کا تقرر کرنے اور انہیں ہٹانے کے آئینی اختیارات تھے۔

ایم آئی کے سربراہ جنرل محمود جنرل مشرف کے انقلاب کے بنیادی محرک تھے بعد ازاں وہ آئی ایس آئی کے سربراہ بن گئے انہیں نائن الیون کے بعد بین الاقوامی دباؤ کے تحت ریٹائر کیا گیا۔ بڑھتی ہوئی سیاسی بے یقینی کے درمیان میں میرے خاندان کے ساتھ ایک اور المناک واقعہ پیش آیا۔ میرے والد ڈکٹیٹر ضیاء الحق کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے، میرے بھائی شاہنواز کو فرانس میں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا اور 20 ستمبر 1996ء کو میرا خاندان ایک اور قتل سے سخت صدمہ انگیز صورتحال کا شکار ہوا میرے بھائی مرتضیٰ بھٹو کو کراچی میں اس کے گھر کے سامنے پولیس فائرنگ کے ذریعے قتل کر دیا گیا، میں خصوصاً سخت پریشان ہوئی کیونکہ کچھ سالوں کی سیاسی رنجش کے بعد ہماری اب مصالحت ہوئی تھی اور ہمارا خاندان ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کے قریب آ رہا تھا۔

میں بہت افسوس کے ساتھ کہتی ہوں کہ میں امریکہ کے ضیاء کے متعلق غلط اندازوں کا عمل نئے فوجی ڈکٹیٹر پرویز مشرف کے معاملے میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ پاکستان میں جمہوریت کے خلاف ضیاء کے انقلاب کی دو دہائیوں کے بعد ایک اور آرمی چیف نے سویلین حکومت کے خلاف انقلاب برپا کیا ہے۔

اپنے سے پہلے کی ڈکٹیٹرشپ کی قیادت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نئے پاکستانی ڈکٹیٹر نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اپنے مفاد کے لیے مدد فراہم کر کے مغرب کے ساتھ فلرٹ کیا ہے۔ اس سے امریکہ اور برطانیہ اس کی سیاسی حمایت سے دور ہوئے ہیں جبکہ طالبان پاکستان کے قبائلی علاقوں میں پھر منظم ہوئے ہیں اور ہمسایہ ملک افغانستان میں نیٹو کے فوجیوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔

عسکریت پسندوں کے سیل جوں کے توں ہیں ان کے لیڈر گرفتار کیے جاتے ہیں اور جوں ہی عالمی توجہ رخ پھیرتی ہے انہیں رہا کر دیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اپوزیشن لیڈروں پر دباؤ ڈال کر منتخب کردہ سیاسی جماعتوں کو قتل کر کے، پریس پر پابندیاں عائد کر کے اور انسانی حقوق کی

وجوہات کو روک کر فوجی ڈکٹیٹرشپ اب بھی رو بہ عمل ہے۔

فوجی حکومت کا مقصد یہ ہے کہ اس امر کی یقین دہانی حاصل کی جائے کہ حکومتیں تشکیل دینے کے لیے انٹیلی جنس اداروں کا کوئی متبادل نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پی پی پی کی مخالفت کرتے ہیں۔ فوجی حکومت کے حامیوں کو صدر جان ایف کینیڈی کے الفاظ یاد رکھنے چاہئیں جو انھوں نے 1961ء میں اپنے افتتاحی خطاب میں کہے تھے۔ ''جو شیر کی کمر پر سواری کرتا ہے عموماً اندر سے ڈرا ہوتا ہے۔''

جنرل مشرف سے میری اتفاقیہ ملاقات اس وقت ہوئی جب ترک فوجیوں کے دوروں کے دوران انھوں نے ترک مترجم کے فرائض سرانجام دیے۔ میں نے انھیں اپنا ملٹری سیکرٹری بنانے سے انکار کیا۔ ہم نے نسلی اور اکثر مشتعل مہاجر قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کے ساتھ ان کے مشتبہ روابط کی وجہ سے شروع میں ان کی ترقی کرنے سے انکار کر دیا۔ آخری دفعہ میری ان سے ملاقات سب سے اہم تھی جب انھوں نے 1996ء میں کشمیر پر جنگ کے متعلق خاکہ پیش کیا۔

مشرف کی طرف سے پی پی پی کو روکنے اور مجھے دوبارہ منتخب ہونے کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے کے عزم اور خبط کا نتیجہ ملک میں کمزور سیاسی اداروں اور سیاسی جماعتوں اور شہری اداروں میں جمہوریت کا انفراسٹرکچر تباہ ہونے کی شکل میں نکلا ہے۔ علاوہ ازیں بجٹ میں ان کی ترجیحات کا رخ سماجی شعبہ سے فوج کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ اس سے لاکھوں پاکستانی جو غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارتے ہیں ان کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

ہم اس امر سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ جنرل مشرف پر قاتلانہ حملوں کی متعدد کوششیں کی گئی ہیں۔ اگرچہ یہ امید کی جاتی ہے کہ ان پر مزید کوئی حملہ نہیں ہوگا۔ خطرہ پھر بھی موجود ہے۔ پاکستان میں پائیدار جمہوریت قائم کرنے کی کوشش میں ناکامی کے دوررس نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔

O

مشرف حکومت پاکستانی سرحد کے حصوں میں اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئی ہے ان کا دعویٰ ہے کہ یہ کنٹرول نہیں کیے جا سکتے، یہ انوکھا خیال کہ پاکستان کے یہ وسیع حصے کنٹرول نہیں کیے جا سکتے محض حماقت ہے۔ وزارت عظمیٰ کے دونوں ادوار میں میری حکومت نے امن و امان قائم کرنے کے لیے ان علاقوں میں فوجیں بھیجیں اب مشرف حکومت نے دہشت گردوں کو ان علاقوں پر حکومت کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ ان کی حکومت ان دہشت گردوں کے ساتھ رہتی ہے جو طیاروں، ٹرینوں اور بسوں میں سفر کرنے والی معصوم خواتین، بچوں اور مردوں پر حملے کرتے ہیں۔ اگر ایک خاتون وزیراعظم کے دور میں اس طرح کے واقعات ہوتے ہیں تو اس پر کمزور اور بے صلاحیت ہونے کا الزام عائد کیا جائے گا لیکن یہ جنرل ہر کام سزا کی بریت کے بغیر کر رہا ہے، خواتین کے عظیم کاموں کے باوجود عورت مرد کی کارکردگی کو جانچنے میں دوہرے معیار برقرار ہیں۔

مشرف دہشت گردی کے خلاف جنگ میں تھوڑا تھوڑا کر کے مدد فراہم کر رہے ہیں۔ چچھ بھر ضرورت کے مطابق تاکہ واشنگٹن اور لندن کی نگاہوں میں اچھے بنے رہیں لیکن ان کی پالیسیاں مغرب کے دشمنوں کو طاقت دے رہی ہیں، میں نے جو سال وزیراعظم کی حیثیت سے گزارے تو یہ سیاسی مدرسے جو ملک میں مغرب کے خلاف عدم رواداری اور جنگ کی تعلیم دے رہے ہیں انھیں کنٹرول کیا اور بعض اوقات انھیں ختم بھی کیا اب یہ

موجودہ پاکستانی ملٹری ڈکٹیٹر کے تحت پھل پھول رہے ہیں۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور 29 دسمبر 2007ء)

مذکورہ انکشافات انگیز اقتباسات کی روشنی میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بے نظیر کی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کے لیے ایجنسیوں نے کیا کیا منصوبے بنائے۔ اگر مستقبل میں بھی ان ایجنسیوں نے منتخب حکومتوں کے خلاف یہی طرز عمل جاری رکھا تو پھر پاکستان کا خدا حافظ اس لیے تمام پاکستانیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ بنیان مرصوص بن کر اپنی منتخب حکومت کے پیچھے رہیں اور ایجنسیوں کے امریکی منصوبے ناکام بنا دیں۔ اسی میں پاکستان کی بقا ہے۔

♥.....♥.....♥

بے نظیر بھٹو کامیاب ہونے کے بعد کیسا پاکستان چاہتی تھیں؟

وکیل انجم

لیاقت باغ راولپنڈی کے خودکش حملے سے ایک روز قبل بے نظیر بھٹو نے پشاور کے جلسہ عام سے خطاب کیا تھا یہ وہ شہر ہے جہاں وہ خود بھی ایک بار قومی اسمبلی امیدوار بنی تھیں۔ صوبہ سرحد پیپلز پارٹی کا ہمیشہ گڑھ رہا ہے، انتخابی سیاست میں فتح شکست کے علاوہ اور پارٹی میں کئی مرتبہ ٹوٹ پھوٹ ہونے کے باوجود بے نظیر بھٹو سے یہاں کے لوگوں کو بے پناہ عقیدت تھی۔ بے نظیر بھٹو کی آمد سے چند روز قبل صوبہ سرحد میں ایک خوفناک خودکش حملہ ہوا تھا جس کی بے نظیر بھٹو نے جلسہ عام میں مذمت کی تھی اور عوام کو بتایا تھا کہ ''اس وقت پاکستان میں خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں، افغانستان میں طالبان تورا بورا پہنچے اور اس کے بعد ہمارے علاقہ غیر میں آئے، انہی کی وجہ سے آج ہمارے اپنوں پر جہازوں سے بمباری ہو رہی ہے۔ بے نظیر بھٹو جہاں طالبان کی مذمت کر رہی تھیں دہشت گردی کے خلاف آواز بلند کر رہی تھیں اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے سوات اور وزیرستان میں بے گناہ افغانیوں کے بہائے جانے والے خون کی مذمت بھی کی۔ انہوں نے حکومت وقت کی پالیسیوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا اور کہا چارسدہ میں مسجد میں خودکش حملے سے عوام میں خوف و ہراس پھیلا ہے۔ بعض لوگ عوام کو غلام بنانے کے لئے اپنے مذموم مقاصد کو پورا کر رہے ہیں۔ انہوں نے موجودہ حکومت کی دہشت گردی کے خلاف مہم پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ خوف و ہراس اس حد تک پھیل گیا ہے کہ ماضی میں جلسے شہروں اور چوراہوں میں ہوا کرتے تھے لیکن اب شہروں سے دور دراز علاقوں کے لوگ اس وجہ سے جلسوں کا رخ نہیں کرتے کہ انہیں ڈرا دیا گیا ہے۔'' بے نظیر بھٹو نے جتنے بھی عوامی جلسے کئے اس میں سب سے زیادہ پریشانی انہیں اسی جلسے سے تھی کہ مقامی طالبان کے علاقے میں وہ دہشت گردوں اور دہشت گردی کو چیلنج کر رہی تھیں حقیقت میں بے نظیر کی شہادت اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ہوگئی وہ خود کہا کرتی تھیں کہ ''وہ ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی ہیں جنہوں نے موت قبول کر لی لیکن کسی ڈکٹیٹر کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف جو ماضی میں دو دو مرتبہ وزیراعظم رہے اور دونوں ہی ماضی میں ایک دوسرے کے زبردست حریف رہے تھے لیکن صدر پرویز مشرف کے دور اقتدار میں وہ جلاوطن رہے اسی جلاوطنی نے دونوں کو جمہوریت اور پاکستان کی سیاست کے حوالے سے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ دونوں لیڈروں کی جماعتیں مسلم لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی ایک دوسرے کی تیس سال تک حریف رہیں اسے پاکستان کی سیاست کا معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ ایک دوسرے سے اس قدر مخالف رہنے والی جماعتیں بحالی جمہوریت کے نام پر ''میثاق جمہوریت'' کریں گی جس میں 1973ء کے آئین کی بحالی اور پاکستان سے آمرانہ حکومت کا خاتمہ تھا۔ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف نے حکومت اور ایجنسیوں کی پوری کوششوں کے باوجود ایک دوسرے کے خلاف بیان بازی نہیں کی بلکہ 2008ء کے انتخابات کی انتخابی مہم اور جلسوں میں خطاب کا موضوع پاکستان میں عدلیہ کی بحالی اور جمہوریت کی بالادستی ہی رہی۔ یہاں تک کہ 25

دسمبر جو میاں نواز شریف کا جنم دن تھا اس دن نہ صرف بے نظیر بھٹو نے ٹیلی فون پر مبارک باد دی بلکہ پھولوں کا گلدستہ بھی بھیجا اس کے جواب میں میاں نواز شریف بھی بے نظیر کی لیڈر شپ کے قائل تھے اور انہیں مستقبل میں بے نظیر بھٹو کو وزیر اعظم تسلیم کرنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ دونوں لیڈروں کے درمیان اعتماد کی جو فضاء قائم ہو چکی تھی اس کے اثرات کارکنوں کی سطح پر بھی سامنے آ رہے تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ میاں نواز شریف انتخابی مہم کے سلسلے میں جب گجرات کے دورے پر گئے تو پاکستان پیپلز پارٹی کے ہزاروں کارکنوں اور مقامی لیڈروں نے میاں نواز شریف کا پیپلز پارٹی کے پرچموں کے ساتھ استقبال کیا۔ اور ایسا ہی شاندار استقبال 29 دسمبر 2007ء کو میاں نواز شریف کا اس وقت ہوا جب وہ بے نظیر بھٹو کی شہادت پر تعزیت کے لئے لاڑکانہ گئے تھے۔ 26 دسمبر کو بے نظیر بھٹو نے ارباب نیاز سٹیڈیم میں جب خطاب کیا تو انہوں نے اس موقع پر بھی اس کا اظہار کیا کہ ”پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) ہی پاکستان کی دو بڑی سیاسی جماعتیں ہیں، عوام ان کو ووٹ دے کر نمائندے منتخب کریں تا کہ ملک سے بدامنی، بے روزگاری، مہنگائی اور غربت کا خاتمہ کر سکیں اور یہی بات میاں نواز شریف کہتے تھے کہ محترمہ اور مسلم لیگ (ن) کو ووٹ دے کر پاکستان سے آمریت کا خاتمہ کریں۔ بے نظیر بھٹو نے جتنے بھی جلسے کیے وہ اعتدال پسندی اور جمہوریت پر سب سے زیادہ زور دیتی تھیں۔

14 دسمبر کو بے نظیر بھٹو نے انتخابی جلسوں کا آغاز کرنے سے پہلے لال شہباز قلندرؒ کے مزار پر حاضری دی جہاں انہوں نے ملکی سلامتی، غربت کے خاتمہ اور جمہوریت کی بحالی کے لئے خصوصی دعا کی اور کہا کہ پاکستان پیپلز پارٹی انتخابات میں ملک بھر سے کامیابی حاصل کرے گی اس موقع پر انہوں نے حکومت سے جو مطالبہ کیا وہ یہی تھا کہ الیکشن پر اثر انداز ہونے والے ناظمین اور تمام ریاستی وسائل کو استعمال کرنے سے روکا جائے جہاں انہوں نے یہ مطالبہ حکومت سے کیا اس کے ساتھ عالمی برادری سے بھی اپنے خطاب میں اپیل کی کہ وہ پاکستان میں شفاف انتخابات کے انعقاد کے لئے اپنا کردار ادا کرے اور اس سلسلہ میں دباؤ بھی ڈالا جائے۔ اسی روز محترمہ نے بلاول ہاؤس میں جرمنی کے قونصل جنرل نیس جوآشم سے ملاقات کے دوران الیکشن کے شفاف منعقد کرانے پر زور دیا۔ انہوں نے اپنی ملاقاتوں میں سندھ سے آئے ہوئے قومی اور صوبائی اسمبلی کی امیدواروں پر زور دیا کہ سرکاری امیدواروں کی دھاندلیوں کو ناکام بنانے کے لئے ہر غلط ووٹ کو چیلنج کریں۔ بے نظیر بھٹو نے اسی روز یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ مخالفین نے قومی اسمبلی کے ہر حلقہ میں 20 ہزار اور سندھ اسمبلی کے ہر حلقہ میں 10 ہزار جعلی ووٹ بھگتانے کی اسکیم تیار کی ہے۔ حقیقت میں بے نظیر بھٹو پاکستان میں عوامی حاکمیت اور حقیقی جمہوریت چاہتی تھیں ان کا خیال تھا کہ ہر فرد کو اپنی مرضی کے مطابق ووٹ دینے کا حق دیا جائے۔ بے نظیر بھٹو کا دورہ کوئٹہ بھی تاریخی تھا جہاں انہوں نے بلوچ رہنماؤں سے ملاقات کی تھی۔ 15 دسمبر 2007ء کو بے نظیر بھٹو 12 سال کے طویل عرصے کے بعد اپنے دو روزہ دورہ پر کوئٹہ پہنچیں تو انہوں نے وہاں ایک جلسہ عام اور ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ اس کے علاوہ مختلف وفود سے ملاقاتیں بھی کیں۔ انہوں نے جلسہ عام میں جہاں ملکی مسائل کا تذکرہ کیا اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بلوچستان میں جاری آپریشن کی زوردار الفاظ میں مذمت کی اور کہا کہ پیپلز پارٹی اقتدار میں آ کر بلوچستان میں جاری آپریشن بند کرے گی اور سیاسی کارکنوں کو رہا کر دیا جائے گا ہم نے ہمیشہ ظالم کے خلاف آواز بلند کی ہے اور مظلوم کا ساتھ دیا ہے اب عوام کو بھی ظالم سے ٹکرانا پڑے گا۔ پیپلز پارٹی اور عوام کی جدوجہد کے نتیجے میں آج یہ ممکن ہوا ہے کہ دو سابق وزرائے اعظم پاکستان میں موجود ہیں لوگ کہتے تھے کہ جنرل پرویز مشرف وردی نہیں اتاریں گے، عوام کی جدوجہد کے نتیجے

میں انہوں نے وردی اتار دی۔ یہ عوام کی طاقت ہی ہے کہ اب ایمرجنسی بھی اٹھالی گئی ہے جب میں ملک میں آرہی تھی تو دھمکی دی گئی کہ پاکستان نہ آئیں آج بھی دھمکی دی گئی کہ دو روز قبل دھماکے ہوئے ہیں جلسہ منسوخ کر دیں لیکن میں ان دھمکیوں میں آنے والی نہیں ہوں۔ عوام پیپلز پارٹی کی طاقت ہیں، عوام کے لئے میں دس حکومتیں قربان کر سکتی ہوں اس وقت ملک بحران میں مبتلا ہے فوج اپنے ہی ملک میں لڑ رہی ہے، بم دھماکے ہو رہے ہیں، اس ملک میں جو بھی آمر آتا ہے وہ ججوں کو نکال دیتا ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم نے کسی چیف جسٹس کو نہیں نکالا، ججوں کو بحال کر کے عدلیہ کو تین نومبر والی پوزیشن پر لایا جائے گا۔"

کوئی انٹرویو ہو یا انتخابی جلسہ بے نظیر بھٹو پاکستان پیپلز پارٹی کے سیاسی فلسفے اور فکر پر بہت زیادہ زور دیتی تھیں۔ پشاور میں بھی انہوں نے کہا کہ "پاکستان پیپلز پارٹی ذوالفقار علی بھٹو کی پارٹی ہے جس میں قوم کو آئین جمہوریت صوبوں کو حقوق اور عوام کو طاقت دی۔ اس جلسہ میں انہوں نے مستقبل کا سیاسی منظر نامہ بھی پیش کیا کہ "عوام مخالف قوتیں نہیں چاہتیں کہ اقتدار عوام کے لوگوں کو ملے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ جمہوری حکومتوں پر شب خون مارا۔ آج کل نیا فیشن بنایا جا رہا ہے کہ عوامی سیاست کو روکنے اور عوام کو غلام رکھنے کے لئے تخریب کاری اور خودکش حملے کئے جا رہے ہیں تا کہ لوگ اپنی مرضی کے نمائندوں کو اقتدار تک نہ پہنچا سکیں۔ بعض لوگ عوام کو غلام بنانے کے لئے اپنے مذموم مقاصد کو پورا کر رہے ہیں۔ بے نظیر بھٹو کی تقریر کے ان فقروں کو دیکھا جائے تو خودکش حملوں کا تعلق وہ سیاست سے جوڑتی ہیں جس کا ایک ہی مقصد انہوں نے بتایا کہ "ایسا کرنے والے چاہتے ہیں کہ ملک میں حقیقی عوامی نمائندے اقتدار میں نہ آ سکیں۔" انہوں نے یہ عزم بھی کیا کہ "8 جنوری کا سورج پیپلز پارٹی کی فتح کی نوید لے کر طلوع ہوگا۔ پیپلز پارٹی ملک میں کلین سویپ کرے گی اور عوام کی طاقت سے عوامی حکومت قائم کریں گے۔" انہوں نے اپنے خطاب میں آمرانہ حکومتوں کے سیاسی کردار پر بھی تنقید کی اور کہا کہ "جب بھی ملک میں غیر جمہوری حکومتیں آئیں تو ملک کو نقصان پہنچا۔ ایک آمر کے دور میں مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہوا۔ دوسرے ڈکٹیٹر کے دور میں سیاچن ہم سے علیحدہ ہوا اور آج کی آمریت کے دور میں ملک میں خون خرابہ ہو رہا ہے۔ انتہا پسند بم بنا کر بے گناہ لوگوں کو مار رہے ہیں اور مساجد میں بھی عوام محفوظ نہیں۔ پشاور کے جلسے میں عوامی جوش اور پارٹی کارکنوں کا جوش دیدنی تھا اس موقع پر بے نظیر نے یادگار الفاظ میں کہا "آج ملک کو پیپلز پارٹی کی ضرورت ہے کیونکہ یہ وہ جماعت ہے جو چاروں صوبوں کے عوام کی طاقت سے ملکی بقاء کی ضامن ہو سکتی ہے۔"

25 دسمبر 2007ء کو بے نظیر بھٹو نے لودھراں میں بھی بہت بڑے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے اس بات کا واضح طور پر اعلان کیا کہ "پیپلز پارٹی اور آمروں کے درمیان ہمیشہ کشمکش رہی ہے کیونکہ اس نے کبھی آمروں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔" بے نظیر بھٹو نے اپنے خطاب میں مقاصد کے حصول کے لئے جان کی بازی لگانے کا عزم کرتے ہوئے کہا کہ "مسلم لیگ آمروں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی، ہر آنے والے جنرل نے اس کو استعمال کیا اور عوام کے حقوق غصب ہوتے رہے، عوام دشمن قوتیں ملک میں خانہ جنگی کرانا چاہتی ہیں اور عوام جھوٹے وعدوں سے تنگ آ چکے ہیں، عوام کو ان کے حقوق دلانے اور آمروں سے نجات کے لئے اپنی جانوں کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا جائے گا" یقیناً انہوں نے اپنی جان ہار دی اور لیاقت باغ میں 27 دسمبر کا دن ان کی انقلابی جدوجہد کا دن بن گیا۔ انہوں نے اس جلسہ میں عوام سے اپیل کی تھی کہ وہ پیپلز پارٹی کا

ساتھ دیں تاکہ ملک کو آمروں اور لیٹروں سے نجات دلائی جائے کیونکہ ہم پاکستان کو جدید ترین دنیا میں لے جانا چاہتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کا یہ پیغام ہے کہ صوبوں کے پاس خودمختاری ہو اور اقلیتوں کا تحفظ حکومت کی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔'' بے نظیر بھٹو نے عوام کو خبردار کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ سازش کے تحت ملک کو ایک بار پھر توڑنے کی کوشش کی جارہی ہے جو ہاتھ ملک کے دفاع کے لئے استعمال ہونے چاہئیں وہ اپنے ہی عوام کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی واحد جماعت ہے جو خیبر سے کراچی تک ملک کو بچا سکتی ہے۔ پاکستان کا پرچم نیچے کرنے اور انتہا پسندوں کا پرچم اونچا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ انتہا پسند سوات تک پہنچ چکے ہیں اور ڈر ہے کہ مستقبل میں اسلام آباد تک ان کی رسائی نہ ہو جائے ہمارے دور میں مسجدوں، چرچوں اور دیگر عبادت گاہوں پر حملے نہیں ہوئے اور ہر طرف امن کا دور دورہ رہا۔ میں نے سرائیکی بیلٹ سے فاروق لغاری کو صدر بنایا، سرائیکی بیلٹ سے چیف جسٹس لیا لیکن جب فاروق لغاری نے پیپلز پارٹی کی منتخب حکومت کو توڑا تو انہیں دکھ ہوا حالانکہ سرائیکی بیلٹ کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ لوگ جس کو بہن بنالیں اس کی عزت کرتے ہیں اور وہ اپنی بہن کی عزت کو داغ نہیں لگنے دیتے لیکن فاروق لغاری نے سرائیکی بیلٹ کی روایات کو بٹہ لگا دیا اس کے باوجود سرائیکی بیلٹ سے زبردست محبت ملی۔

بے نظیر بھٹو نے اپنا انتخابی منشور پیش کرتے ہوئے 30 نومبر کو جو ہنگامی پریس کانفرنس کی تھی اس میں انہوں نے یہ واضح طور پر کہا تھا کہ ''اگر اے پی ڈی ایم کے ساتھ کسی مشترکہ لائحہ عمل پر پہنچ گئے تو انتخابات کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔'' اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے صدر پرویز مشرف کے لئے یہ پیغام بھی چھوڑا کہ اگر انتخابات منصفانہ ہوئے تو ان کے ساتھ بھی تعاون پر سوچا جا سکتا ہے۔ بے نظیر بھٹو صدر پرویز مشرف کے بارے میں میاں نواز شریف جیسے خیالات نہیں رکھتی تھیں۔ انہوں نے پاکستان میں فوج کی سیاست میں مداخلت کا گہرائی اور سنجیدگی سے نوٹس تو لیا تھا لیکن وہ اس سے نجات کے لئے حکمت عملی کا راستہ اپنا رہی تھیں یہی وجہ تھی کہ وہ 2008ء کے الیکشن میں غیر جمہوری عناصر کا راستہ روکنا چاہتی تھیں۔ میاں نواز شریف نے جو اے پی ڈی ایم کے الیکشن بائیکاٹ کے فیصلے میں بے نظیر بھٹو کی شمولیت کے لئے جب محترمہ سے ملاقات کی تو محترمہ نے میاں نواز شریف کو اس بات پر قائل کر لیا کہ بائیکاٹ کی صورت میں ایسی قوتیں اقتدار میں آ جائیں گی جو ملک میں آمریت اور سیاست میں فوج کی حمایت کے نعرے لگاتی ہیں۔ بے نظیر بھٹو کے قائل کرنے پر ہی میاں نواز شریف کی مسلم لیگ ن کے الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کیا بے نظیر بھٹو نے الیکشن کی پہلے سے تیاری کر رکھی تھی اس سلسلے میں ان کی سینٹرل کمیٹی اور پارلیمانی بورڈ نے امیدواروں کے چناؤ کا کام مکمل کر لیا تھا بے نظیر بھٹو نے پریس کانفرنس میں جب اپنا منشور پیش کیا اس سے ان کے سیاسی تدبر کی جھلک نظر آتی تھی کہ وہ عوام کے لئے کتنی سنجیدگی سے سوچتی رہی ہیں۔ ویسے تو انہوں نے اپنا منشور اس وقت ہی پیش کر دیا تھا جب وہ جلاوطنی کے بعد پاکستان آئیں اور کراچی ایئرپورٹ پر اس کے نکات کی وضاحت بھی کی ''بے نظیر آئی ہے روزگار لائی ہے۔'' انہوں نے 30 نومبر 2007ء کو بھی اپنی پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ ''ان کی جماعت آئندہ انتخاب میں تمام لوگوں کے لئے روزگار، سب کے لئے تعلیم، توانائی کی کمی کو پورا کرنا مدارس کو اسلحہ سے پاک اور مدارس کے نصاب میں اس طرح کی اصلاحات نافذ کریں گے جس سے نفرت کا خاتمہ اور بھائی چارے کو فروغ ملے گا انہوں نے اپنے پروگرام اور منشور میں یہ بھی کہا کہ غربت میں کمی کرنے کے لئے 25 فیصد غریب خاندانوں کی کفالت کا پروگرام بنائیں گے۔

منشور میں نیشنل انٹرن شپ ہیلتھ انشورنس سکیم، اپنا گھر سکیم، غریب مکاؤ پروگرام اور 50 لاکھ افراد کو قرضے دینے کا اعلان بھی کیا تھا۔ جبکہ طلبہ یونین ختم کرنے اور مدرسہ اصلاحات کا وعدہ بھی کیا تھا انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہر شہر اور ہر صوبے کے عوام کو برابری کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔ تعلیم روزگار، توازن اور صاف فضا کے ذریعے ہم سب کو آگے جانا چاہیے ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان ایک ماڈرن سٹیٹ بنے جہاں ایک خود مختار حکومت قانون کی پاسدار ہو، آزاد عدلیہ اور ایسا نظام ہو جس کے ذریعے میرٹ پر لوگ آگے بڑھیں ہم ایک ایسا شہری پیدا کرنا چاہتے ہیں جو دنیا میں پاکستان کا نام روشن کر سکے۔ تعلیم کے حوالے سے ہم 25 فیصد غریب خاندانوں کے ایک ایک فرد کو ایک سال کے لئے نوکری دیں گے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کم از کم دو سال کی نوکری دیں گے۔ بے نظیر بھٹو نے اپنی پریس کانفرنس میں یہ بھی کہا کہ ہم پاکستان سے دس سال کے تمام بچوں کو 2015ء تک سکولز میں لانے کے لئے کام کریں گے اور بچوں کے لئے دلچسپی پیدا کریں گے۔ وہ خود سکول کی جانب آئیں گے، مدارس میں قلم اور تعلیم کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو اپنے بھائیوں اور غیر مسلمانوں سے لڑانے کی ضرورت نہیں ہم اپنے ملک میں اقلیتوں سمیت سب کو یکجا کرنا چاہتے ہیں۔ پیپلز پارٹی نے دوبارہ حکومت میں آ کر لوڈ شیڈنگ ختم کی جب ہماری حکومت جاتی ہے تو لوڈ شیڈنگ دوبارہ شروع ہو جاتی ہے ہم توانائی کے حصول اور پیداوار بڑھانے کے لئے کام کریں گے۔ کم آمدنی والوں کو گھر بنانے کے لئے قرضے دیں گے اور 65 سال سے زائد عمر کے لوگوں کو مالی مدد دیں گے۔ خواتین کو آگے لانے کے لئے کام کیا جائے گا اور ایسا قانون بنائیں گے کہ کوئی اقلیتوں یا خواتین کے ساتھ ناروا سلوک یا برتاؤ نہیں کر سکے گا۔ انہوں نے بیوروکریسی اور فوج میں اصلاحات لانے کا بھی اپنے منشور میں اعلان کیا اور کہا کہ زیر تربیت افسران میں جمہوریت جمہوری اداروں اور منتخب عہدے داروں کے لئے احترام کا جذبہ پیدا کیا جائے گا اور تینوں مسلح افواج کے سربراہان سے تعیناتی کے موقع پر از سر نو حلف لیا جائے گا۔ قبائلی علاقہ جات میں اصلاحات کی غرض سے صوبہ سرحد اسمبلی کو توسیع دے دی جائے گی تاکہ فاٹا کے منتخب ارکان کو سرحد اسمبلی میں نمائندگی دی جا سکے۔ پاکستان کے ریگولر قانون کو قبائلی علاقہ جات میں بھی توسیع دے کر ابتدائی طور پر فرنٹیئر کرائم ریگولیشن میں ترمیم کر کے سائیلان کو پشاور ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں اپیل کا حق دیا جائے گا بے نظیر بھٹو نے ماضی کے مقابلے میں الیکشن 2008ء کے لئے جو منشور جاری کیا تھا وہ دوسری جماعتوں سے خاصا منفرد تھا اس میں انہوں نے غریبوں کے لئے بہت سی مراعات اور جمہوریت کی بحالی کے لئے جو اقدامات تجویز کئے تھے اور فاٹا کے عوام جو اپنے حقوق سے 60 سال سے محروم تھے ان کو دینے کا جو وعدہ کیا تھا اس سے بہت سے با اثر اور با اختیار لوگوں کو اختلاف تھا جس روز بے نظیر بھٹو نے اپنے منشور کا اعلان کیا تھا عین اسی روز انہوں نے جمہوریت کی بحالی کے لئے اے پی ڈی ایم کو جو اپوزیشن جماعتوں کا بڑا اتحاد تھا اس سے جمہوریت کی بحالی اور انتخابات میں حصہ لینے یا نہ لینے کے سوال پر مشترکہ لائحہ عمل اپنانے کی دعوت بھی دی۔ انہوں نے اس اعتراض کا واضح الفاظ میں بھی جواب دیا کہ "ہم نے حکومت سے ڈیل نہیں ڈائیلاگ کئے جس کے نتیجہ میں آج صدر مملکت بغیر وردی کے ہیں" اس بات کا کریڈٹ یقیناً بے نظیر بھٹو کو ضرور جاتا ہے۔

(روزنامہ "جنگ" 6 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

بے نظیر کی شہید ذوالفقار علی بھٹو سے آخری ملاقات

3 اپریل 1979ء کو ایک تیز رفتار جیپ میں ہمیں سہالہ سے راولپنڈی جیل پہنچا دیا گیا۔ جیل کی میٹرن نے میری والدہ اور میری تلاشی لی۔ ایک مرتبہ جب ہم سہالہ کے قید خانے سے روانہ ہوئیں اور دوسری مرتبہ جب ہم راولپنڈی جیل پہنچیں ''آج تم دونوں اکٹھی کیوں آئی ہو؟'' میرے والد نے کال کوٹھڑی کے دوزخ سے آواز دی۔

میری والدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

''کیا یہ آخری ملاقات ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

اس وقت میری والدہ جواب دینے کی سکت نہ رکھتی تھیں۔

''میرا خیال ہے ایسا ہی ہے'' میں نے جواب دیا۔

وہ جیل سپرنٹنڈنٹ کو اشارہ کرتے ہیں جو پاس ہی کھڑا تھا۔

(یہ لوگ ہمیں پاپا کے ساتھ تنہا چھوڑنے پر کبھی تیار نہیں ہوئے)

''کیا یہ آخری ملاقات ہے؟ میرے والد پوچھتے ہیں۔''

''ہاں'' جواب میں جیلر کہتا ہے۔ حکومت کا پیغام دیتے ہوئے شرمسار محسوس ہوتا ہے۔

''کیا تاریخ کا تعین ہو گیا ہے؟''

''کل پانچ بجے'' جیل سپرنٹنڈنٹ کا جواب ہے۔

''کتنے بجے؟''

''جیل قواعد کے مطابق صبح پانچ بجے۔''

''یہ اطلاع تمہیں کب ملی؟''

''کل رات'' اس نے رکتے رکتے جواب دیا۔

میرے والد اسے نظر بھر کے دیکھتے ہیں۔

''اپنے اہل و عیال سے ملاقات کا کتنا وقت دیا گیا ہے؟''

''نصف گھنٹہ''

''جیل قواعد کے مطابق ہمیں ایک گھنٹہ ملاقات کا حق ہے۔'' وہ کہتے ہیں۔

''صرف نصف گھنٹہ'' سپرنٹنڈنٹ دہراتا ہے۔ ''یہ میرے احکامات ہیں۔''

''غسل اور شیو کرنے کے لئے انتظامات کرو۔'' میرے والد اسے کہتے ہیں۔ ''دنیا خوبصورت ہے، اسے میں اسی حالت میں الوداع کہنا چاہتا ہوں۔''

''صرف نصف گھنٹہ'' اس شخص سے ملاقات کے لئے..... صرف نصف گھنٹہ جو مجھے زندگی کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ سینے میں درد سے گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ مجھے رونا نہیں چاہئے۔ مجھے اپنے ہوش بھی نہیں کھونے چاہئیں۔ کیونکہ اس طرح میرے والد کی اذیت بڑھ جائے گی۔

وہ فرش پر پڑے گدے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی کوٹھڑی میں اب صرف یہی فرنیچر باقی رہ گیا ہے۔ جیل حکام کرسی اور میز لے جا چکے ہیں۔ چارپائی بھی وہاں سے اٹھائی جا چکی ہے۔ میگزین اور کتابیں جو میں پاپا کے لئے لاتی رہی تھیں وہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''انہیں لے جاؤ'' میں نہیں چاہتا یہ لوگ میری کسی چیز کو ہاتھ لگائیں۔''

وہ چند سگار جو ان کے وکلاء وہاں چھوڑ گئے تھے۔ میں آج شب کے لئے صرف ایک رکھ لیتا ہوں۔ شالیمار کولون یک شیشی بھی رکھ لیتے ہیں۔ وہ اپنی انگوٹھی بھی مجھے دینا چاہتے ہیں لیکن میری والدہ انہیں کہتی ہیں ''اسے پہنے رکھیں۔'' وہ کہتے ہیں ''اچھا ابھی میں رکھ لیتا ہوں لیکن بعد میں بے نظیر کے حوالے کر دی جائے۔''

''میں نے ایک پیغام باہر کی دنیا تک پہنچا دیا ہے۔'' میں نے بہت آہستہ آہستہ انہیں بتایا (جیل کے حکام میری آواز سننے کی کوشش کرتے ہیں)

میں تفصیلات بتاتی ہوں، وہ اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ ''یہ سیاست کے اسرار و رموز میں ماہر ہو چکی ہے۔'' ان کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ موت کی کوٹھڑی میں روشنی مدھم سی ہے۔ میں انہیں صاف طور پر نہیں دیکھ سکتی۔ اس سے قبل ہر ملاقات کوٹھڑی میں ان کے پاس بیٹھ کر ہوتی رہی لیکن آج ایسا نہیں ہے۔ کوٹھڑی کے باہر دروازے کی سلاخوں کے ساتھ میں اور میری والدہ سکڑ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ باتیں کھسر پھسر کے انداز میں کرتے ہیں۔ ''میر، سنی اور شاہ کو بتانا میں نے ہمیشہ ایک اچھا باپ بننے کی کوشش کی ہے اور میری خواہش ہے کہ کاش انہیں بھی الوداع کہہ سکتا۔'' میری والدہ سر ہلاتی ہیں، منہ سے کچھ نہیں بول سکتیں۔

''تم دونوں نے بہت تکالیف اٹھائی ہیں۔'' وہ کہتے ہیں۔ ''وہ آج مجھے قتل کرنے جا رہے ہیں، میں تمہیں تمہاری مرضی پر چھوڑتا ہوں۔ اگر چاہو تو پاکستان سے اس وقت تک باہر چلے جاؤ جب تک آئین معطل ہے اور مارشل لاء نافذ ہے۔ اگر تمہیں ذہنی سکون چاہئے اور زندگی نئے سرے سے گزارنا چاہتی ہو تو یورپ چلی جاؤ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔''

(ہمارے دل ٹوٹ رہے ہیں) ''نہیں نہیں'' ممی کہتی ہیں ''ہم نہیں جا سکتے۔ ہم کبھی نہیں جائیں گے۔ جرنیلوں کو کبھی یہ تاثر نہیں دیں گے کہ وہ جیت چکے ہیں۔ ضیاء نے انتخابات کا دوبارہ پروگرام بنایا ہے۔ اگرچہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ ایسا کرنے کی جرات بھی کرے گا یا نہیں ہم باہر چلی

جائیں تو پارٹی کی رہنمائی کے لئے کوئی نہیں ہوگا اور یہ وہ پارٹی ہے جس کی آپ نے بنیاد رکھی اور پروان چڑھایا۔"

"اور تم پنکی" میرے والد پوچھتے ہیں۔

"میں کبھی نہیں جا سکتی۔" میرا جواب ہے۔

وہ مسکراتے ہیں میں بہت خوش ہوں۔ تم نہیں جانتی مجھے تم سے کتنا پیار ہے۔"

"تم میری لعل ہو اور ہمیشہ رہی ہو۔"

"وقت ختم ہو چکا۔" سپرنٹنڈنٹ پکارتا ہے۔ "وقت ختم ہو چکا۔" میں سلاخوں کو پکڑ لیتی ہوں۔

"برائے مہربانی کوٹھڑی کا دروازہ کھول دو۔" میں اسے کہتی ہوں۔ "میں اپنے پاپا کو الوداع کہنا چاہتی ہوں۔"

سپرنٹنڈنٹ انکار کر دیتا ہے۔ میں دوبارہ التجا کرتی ہوں۔

"میرے والد پاکستان کے منتخب وزیراعظم ہیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے مجھے ان سے مل لینے دو۔"

سپرنٹنڈنٹ انکار کر دیتا ہے۔ سلاخوں کے درمیان سے میں اپنے والد کے جسم کو چھونے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ اس قدر نحیف و ناتواں ہو چکے ہیں۔ ملیریا، پیچش اور ناکافی خوراک کھانے کی وجہ سے جسم بالکل نحیف اور باریک ہو چکا ہے۔ لیکن وہ سیدھا اٹھ بیٹھے ہیں اور میرے ہاتھ کو چھو لیتے ہیں۔

"آج شب ملائم دنیا سے آزاد ہو جاؤں گا۔" چہرے پر ایک چمکتی روشنی لئے کہتے ہیں۔ "میں اپنی والدہ اور والد کے پاس چلا جاؤں گا۔ میں لاڑکانہ میں اپنے اجداد کی زمینوں کی طرف واپس جا رہا ہوں تاکہ اس سرزمین کا اس کی خوشبو اور اس کی فضا کا حصہ بن جاؤں۔"

"خلق خدا میرے بارے میں گیت گائے گی۔ میں اس کی کہانیوں کا جاوداں حصہ بن جاؤں گا۔"

وہ مسکراتے ہوئے کہتے ہیں "لیکن لاڑکانہ میں آج کل بہت گرمی ہے۔"

"میں وہاں ایک سائبان تعمیر کروں گی۔" میں بمشکل کہہ سکی جیل حکام آگے بڑھتے ہیں۔

"الوداع پاپا!" میں والد کی طرف دیکھ کر پکار اٹھتی ہوں اور میری ممی سلاخوں میں سے ان کو چھو لیتی ہیں۔ ہم گرد آلود صحن سے گزرتے ہیں۔ میں مڑ کر پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں لیکن حوصلہ نہیں پڑتا۔ مجھے معلوم ہے میں ضبط نہیں کر سکوں گی۔ "ہم جب پھر ملیں گے اس وقت تک خدا حافظ" مجھے ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔

تاہم میں چل پڑتی ہوں۔ مجھے چلنے کا مطلق احساس نہیں ہو رہا۔ میں پتھر بن چکی ہوں جیل حکام ہمیں جیل وارڈ کے اندر واپس لے جاتے ہیں۔ صحن میں فوجیوں کے متعدد ٹینٹ ایستادہ ہیں میں مدہوشی کے عالم میں چلی جا رہی ہوں۔ صرف اپنے سر کی موجودگی کا احساس ہے۔ "سر بلند رہنا چاہئے۔ وہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہیں۔"

مقفل دروازوں کے اندکار ہماری منتظر ہے تاکہ باہر ہجوم ہمیں دیکھ نہ سکے۔ میرا جسم اس قدر بوجھل ہو گیا ہے کہ کار کے اندر داخل ہونا بھی

مشکل معلوم ہوتا ہے۔ کار دروازوں کے بیچ میں سے تیزی سے حرکت کرتی ہے۔ اسے دیکھتے ہی ہجوم کے ایک سرے پر کھڑی اپنی دوست یاسمین پر اچانک میری نظر پڑتی ہے جس کے ہاتھ میں والد کے دینے کے لئے خوراک کا ٹفن کیریر ہے۔ ''یاسمین! وہ آج رات انہیں مار دیں گے۔'' میں کار کے شیشوں میں سے چلائی۔ ''کیا اس نے میری آواز سنی؟ کیا میں نے کوئی آواز نکالی بھی یا نہیں..... کیا کہہ سکتی ہوں۔''

صبح کے پانچ بج گئے، پھر چھ بجے..... ہر سانس جو میں لیتی مجھے اپنے والد کی آخری سانسوں کی یاد دلاتا۔ ''اے خدا! کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔'' میری ماں اور میں نے دعا مانگی۔ ''کچھ نہ کچھ ہو جانا چاہئے۔'' میری چن چن جسے میں اپنے ساتھ قید خانے میں لے آئی تھی وہ بھی تناؤ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے بلونگڑوں کو کہیں چھپا دیا تھا۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

ہم ناقابل یقین امید کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ سپریم کورٹ نے متفقہ طور پر سفارش کی تھی کہ میرے والد کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جائے۔ مزید برآں پھانسی دیئے جانے کی صورت میں پاکستانی قانون کے مطابق ایک ہفتہ قبل دن اور تاریخ کا تعین اعلانیہ کر دیا جائے لیکن ایسا کوئی اعلان سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔

پی پی پی کے رہنماؤں نے بھی یہ پیغام ارسال کیا کہ ضیاء نے سعودی عرب، متحدہ امارات اور دوسرے ملکوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ میرے والد کی سزائے موت کو تبدیل کر دے گا لیکن ضیاء کا ریکارڈ قانون سے بے اعتنائی اور جھوٹے مواعید سے بھرا پڑا تھا۔ ہمارے مستقل خدشات کی بدولت جب بھی پھانسی کی حتمی تاریخ کا حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا۔ سعودی عرب کے وزیر خارجہ اور لیبیا کے وزیر اعظم نے فوراً بذریعہ طیارہ پاکستان پہنچنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ ''کیا انہوں نے بی بی سی پر میرا پیغام سن لیا تھا؟'' کیا ابھی بھی ان کے پاس پاکستان پہنچنے کا وقت تھا؟''

چینیوں کا ایک وفد اسلام آباد میں تھا۔ میرے والد ہی نے پاکستان چین دوستی کا آغاز کیا تھا۔ کیا وہ ضیاء کو اپنے فیصلے سے منحرف کرا سکیں گے؟''

میری والدہ اور میں سہالہ کی شدید گرمی میں بے حس و حرکت اور خاموش بیٹھی تھیں۔ ضیاء نے یہ بات بھی پھیلائی تھی کہ وہ رحم کی اپیل اس وقت ہی سنے گا اگر یہ میرے والد یا ہماری طرف سے کی گئی۔ میرے والد نے ایسا کرنے کو سختی سے منع کر دیا تھا۔

موت کی جانب گنتی کے یہ لمحات کیسے گزرتے ہیں؟ میری والدہ اور میں گم سم بیٹھی تھیں۔ بعض اوقات ہم چلاتی بھی تھیں۔ جب ہم میں بیٹھنے کی سکت باقی نہ رہی تو ہم بستر کے تکیوں پر گر گئیں۔ وہ ان کی زندگی ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کے اپنے احساسات اس بھرپور تنہائی میں کیسے ہوں گے جبکہ ان کے پاس وقت کوئی بھی نہیں۔ انہوں نے اپنے پاس کوئی کتاب بھی نہیں رکھی۔ انہوں نے اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھا۔ صرف ایک سگار ان کے پاس تھا۔ میرا گلا گھٹن سے جڑ گیا اور میں اسے پھاڑ کر کھول دینا چاہتی تھی لیکن میں ان پہریداروں کو جو ہماری کھڑکی کے باہر ہر وقت ہنستے اور باتیں کرتے رہتے تھے۔ اپنی چیخوں سے استہزاء کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ ''ممی! میں برداشت نہیں کر سکتی بالکل نہیں کر سکتی۔''

آخر میں ڈیڑھ بجے کے قریب بالکل ٹوٹ گئی۔ وہ میرے لئے مسکن دوائی کی گولیاں لائیں۔ ''سونے کی کوشش کرو'' انہوں نے کہا۔

آدھ گھنٹے کے بعد میں اپنے بستر پر اچانک اٹھ بیٹھی..... والد کے گلے میں پھندا میں نے اپنے گلے کے اردگرد محسوس کیا۔

آسمانوں سے اس شب برف کے آنسو برسے۔ لاڑکانہ میں ہماری خاندانی زمینوں پر اولے پڑے۔ گڑھی خدا بخش میں ہمارے آبائی

قبرستان میں فوجی دستوں کی ہلچل سے لوگ جاگ اٹھے۔ جب میری والدہ اور میں اپنے قید خانے میں رات کے وقت کرب کی گھڑیاں گزار رہی تھیں، میرے والد کی میت گڑھی میں دفنانے کے لئے بذریعہ طیارہ لے جائی جا رہی تھی۔

(روزنامہ ایکسپریس، لاہور 28 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

باب دوم

محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی شہادت پر قلمکاروں کے خون کے آنسو
اور بے نظیر بھٹو کی کتاب
شہید بے نظیر بھٹو بنام پاکستانی عوام

نسیم شاہد

میرے پیارے بھائیو، بہنو اور واجب الاحترام بزرگو! میں خیریت سے اپنے شہید پاپا کے پاس پہنچ گئی ہوں۔ آپ سے اچانک جدا ہونے کا دکھ بہت تڑپا دینے والا تھا، مگر جس طرح آپ نے میری جدائی پر اپنی محبت اور غم کا اظہار کیا، اس کی وجہ سے میں اپنا دکھ بھول گئی۔ مجھے بلاول، بختاور اور آصفہ بھی بہت یاد آتے ہیں، لیکن پاپا کے کندھے پر سر رکھتی ہوں تو یہ سوچ کر صبر کر لیتی ہوں کہ وہ بھی اپنے پاپا کے پاس ہیں، میری یاد آئی تو ان کے کندھے پر سر رکھ کر رو لیں گے اور انھیں صبر آ جائے گا۔ تقدیر کے فیصلے انوکھے بھی ہوتے ہیں اور اٹل بھی۔ میں جب پاکستان میں تھی تو میرے بچے اور شوہر وہاں نہیں تھے، اب جبکہ میں عالم بالا میں آ گئی ہوں تو وہ پاکستان میں موجود ہیں۔ ان کے پاس تو دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے میری قبر موجود ہے۔ میرے پاس تو اب صرف ان کی یادیں ہی رہ گئی ہیں۔ شکر ہے کہ یہاں پاپا اور بھائی میرے پاس ہیں، ورنہ تو ان کی جدائی میرے لیے قیامت سے پہلے قیامت بن جاتی۔

ایسی بات بھی نہیں کہ مجھے یہاں آ کر صرف اپنے بچوں کی یاد آ رہی ہے۔ مجھے آپ سب بھی بہت یاد آ رہے ہیں۔ مجھے راولپنڈی کے عوام کی وہ محبتیں نہیں بھولتیں جو دنیاوی زندگی کے آخری لمحے تک میرے ساتھ رہیں۔ میرے ساتھ اس روز کئی اور مسافر بھی عالم بالا آئے۔ یہ وہ جاں نثار تھے، جنھوں نے میری محبت میں جان دی۔ یہ لوگ بھی اپنے پیچھے اپنے بچے اور والدین چھوڑ کر آئے ہیں، مگر انھیں اطمینان یہ ہے کہ انھوں نے اپنی قائد کی حفاظت کے لیے جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ میں ان کی محبتوں اور احسان کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ بھلائی تو وہ محبتیں بھی نہیں جا سکتیں، جن کا اظہار میرے ہم وطنوں نے میری دنیا سے رخصتی پر کیا۔ بیٹیاں جب والدین کی چوکھٹ سے جدا ہوتی ہیں تو دونوں طرف کے آنسو نکل آتے ہیں۔ پاکستان تو میرے لیے بابل کی چوکھٹ تھی۔ جس طرح بہنوں اور بیٹیوں کو وداع کرتے ہوئے آنکھیں بے اختیار جل تھل ہو جاتی ہیں، اسی طرح پورے پاکستان نے مجھے وداع کرتے ہوئے آنسوؤں کے نذرانے پیش کیے، جنھیں میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ خود میری حالت بھی ایک بیٹی جیسی

تھی، جو اپنے پیاروں سے جدا ہو کر ان دیکھے سفر پر روانہ ہو رہی تھی۔ میں ابھی آپ کے درمیان رہنا چاہتی تھی۔ آپ کے دکھ درد اور خوشی میں شریک ہونا چاہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ ان آرزوؤں اور امیدوں پر پوری اتروں جو آپ نے مجھ سے وابستہ کر رکھی ہیں، میں آپ کو جمہوریت، انسانی حقوق اور آئین کی مکمل بحالی کا تحفہ دینا چاہتی تھی، لیکن اچانک عالم بالا سے بلاوا آ گیا۔ یہ وہ بلاوا ہے جسے کوئی ٹال نہیں سکتا، یہ وہ حکم ہے کہ جس کی سرتابی نہیں ہو سکتی، سو میں سب خواب ادھورے چھوڑ کر عالم بالا چلی آئی، مگر یقین کریں کہ میرا دل اب بھی آپ کی محبتوں میں اٹکا ہوا ہے، میں اڑ کر آپ کے پاس آنا چاہتی ہوں، تاہم آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی کہ جس مقام پر میں آ چکی ہوں، یہاں سے کبھی کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔ سو مجھے اب یہاں رہنا ہے، آپ کی یادوں کے سہارے اور آپ نے وہاں رہنا ہے۔ میری یادیں اور باتیں اگر آپ کے کچھ کام آ سکیں تو مجھے راحت ملے گی۔

میں جب یہاں پہنچی تو پاپا نے بڑی گرم جوشی سے مجھے گلے لگایا۔ ان کا پہلا جملہ یہ تھا کہ ''خوش آمدید میری بیٹی، شہیدوں کی بستی میں خوش آمدید۔'' تب مجھے معلوم ہوا کہ میں شہادت کا رتبہ پا گئی ہوں۔ اتفاق سے اس وقت یہاں عزیز بھٹی شہید بھی موجود تھے۔ کہنے لگے بیٹی جو لوگ ملک و قوم کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، انھیں شہادت نصیب ہوتی ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی'' ان کی یہ بات سن کر میں نے اسی طرح جھلمل کرتی آنکھوں کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھا، جیسے 18 اکتوبر کو آٹھ سال بعد کراچی کی زمین پر قدم رکھنے کے بعد میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور بے اختیار اظہار تشکر کے لیے میری نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

پاپا کے ساتھ میرے استقبال کے لیے نوابزادہ نصر اللہ خان، مولانا شاہ احمد نورانی، ملک محمد قاسم، حکیم محمد سعید، محمد صلاح الدین، اکبر بگٹی، عبدالولی خان، حمید نظامی اور منور سہروردی بھی موجود تھے۔ وہ پاپا کو مبارک باد دے رہے تھے کہ باپ کے بعد بیٹی کو بھی شہادت کا رتبہ نصیب ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر میں دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کرنے لگی۔ نوابزادہ نصر اللہ خان نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہنے لگے: ''بیٹی! جمہوریت کے لیے کئی مہمات میں تم میرے ساتھ رہی ہو، تم نے بھٹو کی بیٹی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ اگر لوگ مجھے بابائے جمہوریت کے نام سے یاد کرتے ہیں تو اب تم جمہوریت کی بیٹی کے نام سے ہمیشہ عوام کے دلوں میں موجود ہو گی۔'' اس پر خان عبدالولی خان نے کہا: ''نوابزادہ صاحب بے نظیر اب صرف بھٹو کی بیٹی نہیں، ہم سب کی بیٹی ہے اور اس نے دختر مشرق ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ سن کر پاپا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے مجھے سینے سے لگا لیا اور اس طرح پیار کیا جیسے بچپن میں مجھے کیا کرتے تھے۔

پاپا مجھے وہاں سے اپنی قیام گاہ پر لائے، تو میرے دونوں پیارے بھائی شاہنواز اور مرتضیٰ استقبال کے لیے موجود تھے۔ مجھے برسوں بعد بھائیوں سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، باتیں ہوئیں تو شاہنواز کی اس بات نے ہم سب کو افسردہ کر دیا کہ بھٹو فیملی کے افراد کم عمری کی موت کا کیوں شکار ہو جاتے ہیں؟ اس پر پاپا نے کہا کہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انسان کو سو سال ملیں تو وہ کوئی کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے۔ اصل چیز تو انسان کا کردار اور اس کا نصب العین ہے، پھر انھوں نے کہا کہ مجھے دیکھو، میں نے پنکی سے بھی کم عمر پائی، لیکن پاکستانی عوام آج بھی میری پوجا کرتے ہیں۔ پنکی نے جس دلیری اور بہادری سے عوام اور جمہوریت کی جنگ لڑی، اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئی ہے۔

اس نے صرف 54 سال کی عمر پائی، لیکن اگر وہ بزدلی کے ساتھ 54 سال اور بھی جی لیتی تو جسم کے ساتھ ہی خود بھی ختم ہو جاتی۔ اب اس

کا جسم اگرچہ گڑھی خدا بخش کی زمین میں دفن ہو چکا ہے، لیکن وہ پاکستانی عوام کے دلوں میں نسل در نسل زندہ رہے گی۔

پاپا کی باتیں سن کر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ میں نے پاپا سے پوچھا کہ ان کا مشن زندہ رکھنے میں مجھ سے کوئی کوتاہی تو نہیں ہوئی؟ یہ سن کر ان کی آنکھوں میں شفقت بھری نمی جاگی، کہنے لگے، کل تک تم میرے نام سے پہچانی جاتی تھی، اب لوگ مجھے تمہارے نام کی وجہ سے پہچانیں گے۔ میں نے کہا پاپا ایسا تو نہ کہیں، انھوں نے کہا، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بیٹی، مجھے تو اندھیرے میں رکھ کر ایک آمر نے پھانسی پر چڑھا دیا، تمھیں تو سب کچھ معلوم تھا کہ موت تمہارا تعاقب کر رہی ہے، نادیدہ ہاتھ تمہاری جان کے درپے ہیں، مگر اس کے باوجود تم نے عوام کا ساتھ نہیں چھوڑا، اپنی فیملی اور پُرآسائش زندگی چھوڑ کر مقتل میں آ گئی، کیونکہ تمہارے سر پر ایک ہی دُھن سوار تھی کہ پاپا کی طرح عوام کے حقوق کی جنگ لڑنی ہے، ملک کو جمہوریت دینی ہے اور طالع آزما قوتوں کے پھیلائے ہوئے اندھیرے میں امید کی کرنیں بکھیرنی ہیں۔ پاپا کی یہ سحر انگیز گفتگو سن کر مجھے اتنا ہی مزا آیا، جتنا مزا بچپن میں ان سے کہانیاں سن کر آتا تھا۔

میں جانتی ہوں کہ آپ کو مجھ سے بچھڑ جانے کا بہت دکھ ہے۔ میں آپ کے غم کا اندازہ کر سکتی ہوں، لیکن مجھے یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ مشکل کی اس گھڑی میں آپ نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا، اپنے ہی ملک کو نقصان پہنچایا اور ایک خاص صوبے کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔ میرے بھائیو! یہ سب کچھ تو میرے دشمنوں کا مشن رہا ہے۔ ان کی تو ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وفاق کو توڑیں اور پاکستان کو نقصان پہنچائیں۔ میں انہی لوگوں کے خلاف تو پاکستان کی جنگ لڑتی رہی ہوں۔ اب اگر آپ بھی دکھ کی اس گھڑی میں نادانستہ طور پر ان لوگوں کے آلہ کار بن جائیں گے تو مجھے کتنی تکلیف ہوگی۔ آپ اپنی صفوں میں چھپے ہوئے دشمنوں کو پہچانیں اور پُرامن جدوجہد کریں، جس طرح میں زندگی بھر کرتی رہی ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ منزل مل کر رہے گی اور بالآخر پاکستان میں عوامی راج کا سورج طلوع ہوگا۔ جو قائداعظم کا بھی خواب تھا اور شہید قائد عوام کا بھی۔ جو لوگ یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ پیپلز پارٹی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گی، وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ پیپلز پارٹی کے اندر بھٹو خاندان کے شہیدوں کا لہو دوڑ رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ پیپلز پارٹی کی قیادت اس مشن کو جاری رکھے گی، جس کی پاداش میں پاپا کو پھانسی دی گئی اور مجھے گولی کا نشانہ بنایا گیا۔

میں نے یہ خط عجلت میں لکھا ہے۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ آپ کو اپنے ان جذبات سے آگاہ کروں، جو آپ سے اچانک بچھڑنے کے باعث میرے دل و دماغ میں مچل رہے تھے۔ میں آپ سے جسمانی طور پر دور ضرور ہوں، لیکن اگر آپ اپنے دلوں کو ٹٹولیں گے تو میں ہر وقت ان میں موجود ملوں گی۔ اللہ پاکستان کو محفوظ رکھے اور آپ کو جمہوریت، عدل و انصاف اور خوشحالی جیسی نعمتوں سے ہمکنار کرے۔ پاپا بھی میرے پاس کھڑے ہیں، ان کا پیغام بھی یہی ہے کہ اگر آپ ہماری روح کو شاد رکھنا چاہتے ہیں، تو پاکستان کو آباد و شاد رکھنے کے لیے ہر قسم کے تعصبات و مفادات سے بالاتر ہو کر اپنا کردار ادا کریں۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

فقط آپ کی بہن بے نظیر بھٹو از عالم بالا

(روزنامہ پاکستان، لاہور 31 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

بے نظیر شہادت کے تابندہ نقوش

الطاف حسن قریشی

بے نظیر کی المناک موت سے آنسوؤں اور سسکیوں کے اُٹھنے والے طوفان اور وسیع و عریض عوامی ردِعمل نے ثابت کر دیا ہے کہ واقعی وہ چاروں صوبوں کی زنجیر اور بڑی مقبول عوامی لیڈر تھیں اور انہیں عالمی برادری میں ایک بلند مقام حاصل تھا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے! پاکستان اور دنیا بھر کے اخبارات اور ٹی وی چینلز اور عالمی لیڈروں نے ان کی شخصیت کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور ان پر ہونے والے قاتلانہ حملے کی شدید ترین الفاظ میں مذمت ہوئی ہے۔ انہیں 28 دسمبر کی شام گڑھی خدا بخش کے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا، تو بی بی سی نے اسی رات اپنی رپورٹ میں کہا کہ شاید ان کے ساتھ ہی وفاق کی سیاست اور جمہوریت بھی دفن ہو گئی ہے، عوام کی لاکھوں بے نام خواہشات دم توڑ گئی ہیں اور انتخابی عمل بھی بے یقینی کا شکار ہو چلا ہے۔ بیشتر مغربی ذرائع ابلاغ آنے والے حالات کی ایک ایسی تصویر کشی کر رہے ہیں جسے دیکھ کر ذہن ماؤف ہو رہا ہے اور دل بیٹھا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہماری سیاسی جماعتوں اور بااختیار طاقتوں نے مہیب خطرات کا درست ادراک نہ کیا اور بالغ نظری اور سیاسی فراست سے کام نہ لیا، تو ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ حادثات ہماری بقا اور سلامتی پر کاری ضرب لگا سکتا ہے۔ ان کی بصیرت اور ذہانت کا اس وقت نہایت کڑا امتحان ہے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ جہاں بے نظیر کی ہلاکت سے بعض منفی قوتیں زور پکڑ سکتی ہیں، وہاں مثبت سوچ اور صحت مند سیاسی رویے بھی سامنے آئے ہیں جن سے ایک جمہوری، ایک معتدل اور ایک درخشاں پاکستان کی تعمیر میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

لیاقت باغ میں پاکستان کے پہلے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان 16 اکتوبر 1951ء کو اس وقت شہید کیے گئے تھے جب انہوں نے ''میرے ہم وطنو'' کے الفاظ ادا ہی کیے تھے۔ دوسری بار یہ سانحہ اس لمحے پیش آیا جب محترمہ بے نظیر بھٹو جلسۂ عام سے خطاب کرنے کے بعد اپنی بلٹ پروف لینڈ کروزر میں بیٹھ چکی تھیں۔ سکیورٹی کے تقاضوں کے مطابق اس گاڑی کو تیزی سے نکل جانا چاہیے تھا، مگر اچانک ایک گروہ اپنے قائد کے حق میں زبردست نعرہ بازی کرنے لگا اور دخترِ مشرق نے ہاتھ ہلا کر ان کے جوش و خروش کا جواب دینا ضروری سمجھا۔ انہوں نے مخدوم امین فہیم کو گاڑی کا سن روف کھول دینے کے لئے کہا۔ وہ جذبات سے اس قدر سرشار تھیں کہ مخدوم صاحب کو ان کی بات ماننا پڑی۔ بے نظیر صاحبہ نے سن روف سے اپنے شائقین کی امنگوں کا ہاتھ ہلا کر جواب دیا اور اسی اثنا میں تین فائر اور ایک خوفناک دھماکا ہوا جس کے بعد وہ پہلے نیچے جھکیں اور بعد میں ان کا سر ڈھلکتا چلا گیا۔ جلسے کی ویڈیو فلموں میں ایک کلین شیو اور چاق چوبند نوجوان جو سفید کپڑوں میں ملبوس ہے اور اپنی وضع قطع سے گوریلا دکھائی دیتا ہے اور اس نے آنکھوں پر ڈارک گلاسز چڑھا رکھے ہیں، وہ مجمع کے درمیان صرف چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہے اور ہینڈ گن تانے محترمہ کا نشانہ لے رہا

ہے۔اس کے عقب میں ایک شخص چادر کی بکل مارے ہوئے ہے۔عام خیال یہ ہے کہ وہ خودکش بمبار تھا جس نے قاتل کی سفاکانہ کارروائی کے بعد اپنے آپ کو بم سے اڑا دیا، بے نظیر صاحبہ کی گاڑی کے ٹائر پھٹ گئے، ہر طرف بھگدڑ مچ گئی اور غالباً قاتل کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

☆☆

اس ناقابل برداشت حادثے نے اہل سندھ کے پرانے زخم بھی ہرے کر دیے جو تاریخ کے مختلف مراحل میں لگتے رہے۔1951ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان کی میت راولپنڈی سے کراچی لائی گئی۔انہیں ایک افغان نژاد باشندے نے شہید کیا تھا۔چھبیس سال بعد 4 اپریل 1977 کو جناب ذوالفقار علی بھٹو کی میت رات کے آخری پہر فوجی طیارے سی 130 سے لاڑکانہ پہنچائی گئی اور تیسری میت جو بے نظیر بھٹو کی تھی، وہ بھی فوجی طیارے کے ذریعے جناب آصف علی زرداری کے ہمراہ سکھر ائیر پورٹ پر اتاری گئی جہاں سے وہ بھٹو ہاؤس نوڈیرو میں لائی گئی۔اس تیسری واردات پر پورے سندھ میں کہرام سا مچ گیا۔بے نظیر بھٹو کے بہیمانہ قتل کی خبر ساڑھے چھ بجے کے لگ بھگ پورے ملک میں پھیل چکی تھی۔سندھ کے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں تشدد کی لہر اٹھتی جا رہی تھی۔مشتعل ہجوم دکانوں، بینکوں، فیکٹریوں کو لوٹ رہے تھے اور ریلوے اسٹیشنوں، سرکاری اور غیر سرکاری عمارتوں کو نذر آتش کر رہے تھے۔غیر سندھی باشندے بپھری ہوئی ٹولیوں کی موجودگی میں اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگے تھے اور جرائم پیشہ گروہ لوٹ مار میں سب سے آگے آگے تھے۔لاڑکانہ میں اسلحے کی دکانیں، بینک اور پٹرول پمپ لوٹے اور جلائے گئے۔پیپلز پارٹی کے جیالوں نے ان شہروں اور قصبوں کی طرف رخ کیا جہاں ان کی انتخابی پوزیشن کمزور تھی۔گھوٹکی، جیکب آباد، پنوں عاقل، میر پور خاص، حیدرآباد، سکھر اور ٹنڈو آدم پر دو تین روز تک ڈاکو راج رہا۔کراچی بھی ایک عبد پر آشوب سے گزرا ہے۔جیلوں سے خطرناک قیدی فرار ہو کر بلوائیوں میں شامل ہو گئے تھے جو سرکاری اور غیر سرکاری املاک تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔صرف دو تین دنوں میں پاکستان کی معیشت کو تین کھرب روپے کا ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور ذرائع مواصلات کا پورا انظام درہم برہم ہو گیا۔اس بہت بڑے قومی سانحے پر عوامی غم و غصے کا اظہار کسی قدر ایک فطری امر تھا، مگر جلاؤ گھیراؤ کے جو شرمناک واقعات رونما ہوئے، ان سے خوف آنے لگا تھا اور حیرانی کی بات یہ کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اٹھارہ بیس گھنٹوں تک بے بسی اور بے عملی کی تصویر بنے رہے۔صدر پرویز مشرف نے قتل بے نظیر کی شدید مذمت کرتے ہوئے اپنا یہ عزم دہرایا کہ وہ دہشت گردی کو پوری طرح کچل کر دم لیں گے اور کسی کو قانون شکنی کی اجازت نہیں دیں گے، مگر عوام نے محسوس کیا کہ ان کے ''ارشادات'' کی گیدڑ بھبکیوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں۔

27 دسمبر کی شام اچانک جس تباہی نے جنم لیا، اس سے نبرد آزما ہونے میں ہماری مرکزی اور صوبائی حکومتیں خطرناک حد تک ناکام رہی ہیں۔لیاقت باغ کے جلسے کی ویڈیو فلموں سے یہ بات الم نشرح ہو گئی ہے کہ بے نظیر صاحبہ کے سکیورٹی انتظامات حد درجہ ناقص اور غیر تسلی بخش تھے اور سندھی عوام کا عمومی تاثر یہ ہے کہ مشرف حکومت اور اس کے طاقت ور سیاسی حلیف بے نظیر کے قتل کے ذمے دار ہیں۔بعض حکومتی اقدامات سے اس منفی تاثر کو بڑی تقویت ملی۔اعلیٰ مناصب پر اگر صاحبان بصیرت جلوہ افروز ہوں تو نازک لمحات میں وہ ایسے ایسے اقدامات کر جاتے ہیں جن سے جذبات کی آگ پھیلنے سے رک جاتی ہے۔جناب آصف زرداری محترمہ پر قاتلانہ حملے کی خبر سنتے ہی پاکستان چلے آئے۔وہ اپنے بیٹے اور بیٹیوں کے ہمراہ چک لالہ ائیر بیس پر دو تین گھنٹے رکے رہے۔اس دوران نگراں وزیراعظم جناب محمد میاں سومرو ان کے پاس تعزیت کے لیے چلے جاتے،

انہیں تسلی دیتے اور آنے والے حالات پر ایک دوسرے کو اعتماد میں لیتے تو ایک ایقان افروز منظر تخلیق ہو سکتا تھا جو اہل سندھ کے زخموں کے لئے مرہم ثابت ہوتا، مگر ہمارے منصب داروں نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا اور یہ سمجھا کہ تین دن قومی سوگ کے اعلان سے اظہار ہمدردی کا حق ادا ہو گیا ہے۔ اس حکومتی سرد مہری کا صدر صاحب کو از خود خیال آیا نہ کسی صاحب نظر نے انہیں بروقت مشورہ دیا۔ اگر حکومت کی طرف سے یہ عندیہ دیا جاتا کہ سابق وزیر اعظم کو قومی اعزاز کے ساتھ دفنایا جائے گا اور ان کی میت قومی پرچم میں لپیٹی جائے گی تو یقینی طور پر خیر سگالی کے جذبات غالب آ جاتے۔ کوتاہ فکری کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے نظیر بھٹو کی میت آنے پر گڑھی خدا بخش میں پنجاب، فوج اور جنرل پرویز مشرف اور پاکستان کے خلاف بہت نعرے لگے جو آصف زرداری کے منع کرنے پر وقتی طور پر بند ہو گئے تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اہل سندھ کی عزت نفس پر اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھوں وقفے وقفے سے جو چرکے لگتے رہے ہیں، ان کے سبب دلوں میں نفرتوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور انہیں محبت بھرے جذبات میں تبدیل کرنے کے لیے غیر معمولی ایثار سے کام لینے کی ضرورت ہے، جبکہ ہمارے حکمرانوں کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے بے نظیر صاحب کی میت کو پیک اور ڈسپیچ کرنے میں انتہائی جلد بازی اور بھونڈے پن سے کام لیا۔ سندھی عوام کی آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر وہی منظر چھا گیا جو ذوالفقار علی بھٹو کی میت کے موقع پر کلیجے کو چیرتا چلا گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حادثے کی سنگینی اور قیامت خیزی سے فیصلہ سازوں کے ذہن شل ہو گئے ہیں اور شیطانی خیالات حاوی ہوتے جا رہے ہیں۔ تقریباً اٹھارہ بیس گھنٹوں تک سندھ کے مختلف شہروں میں دہشت گردی کا بازار گرم رہا اور جب پوری دنیا میں پاکستان کا یہ امیج نقش ہو گیا کہ بلوچستان، سرحد، قبائلی علاقوں کے بعد سندھ میں بھی شورش برپا ہے اور حکومت کی رٹ ختم ہو گئی ہے، تب رینجرز فورس حرکت میں آئی اور بلوائیوں کو دیکھتے ہی گولی مار دینے کے احکام جاری ہوئے اور اندرون سندھ کے دس اضلاع میں فوج تعینات کی گئی۔ تین چار دنوں میں چالیس افراد جاں بحق ہوئے ہیں اور امن و امان کا دامن تار تار ہو چکا ہے جسے رفو کرنے کے لئے غیر معمولی وقت، محنت اور وژن درکار ہوں گے، جبکہ ہماری قسمت کے فیصلے سیاسی بونے اور بالشتیے کر رہے ہیں۔

☆☆

بین الاقوامی میڈیا بے نظیر بھٹو کی موت کو ایک عالمگیر سانحے کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ امریکی روزنامہ لاس اینجلز نے اپنی تازہ اشاعت میں لکھا ہے کہ امریکہ میں عالمی دہشت گردی، عراق اور افغانستان کے ایشوز پس منظر میں چلے گئے ہیں اور اس وقت پوری توجہ دختر مشرق کے قاتلوں کا سراغ لگانے پر دی جا رہی ہے۔ صدارتی امیدوار سینیٹر ہیلری کلنٹن نے دوٹوک الفاظ میں کہا ہے کہ غالباً پاکستان کے فوجیوں نے عظیم خاتون کو موت کی نیند سلا دیا ہے جس کی ایک غیر جانبدار اور شفاف تحقیقات بہت ضروری ہے جس میں ایف بی آئی بھی شامل ہو۔ امریکی ایوان نمائندگان کی انتہائی طاقت ور سپیکر نینسی پیلوسی نے بش انتظامیہ پر زور دیا ہے کہ پاکستان کو دی جانے والی امداد غیر جانب دار بین الاقوامی انکوائر سے مشروط کر دی جائے اور اس امر کی بھی تحقیق کی جائے کہ اسے اب تک دہشت گردی کے سدباب کے لیے جو امداد فراہم کی گئی ہے، وہ کہاں خرچ ہوئی اور اس کا حساب کتاب کہاں ہے۔ غیر ملکی ذرائع ابلاغ جن میں الیکٹرانک میڈیا بھی شامل ہے، وہ آئے دن ایک ایسی کہانی پیش کر رہے ہیں جو پرویز مشرف اور خفیہ اداروں کی انتہائی مایوس کن کارکردگی کا تاثر دیتی ہے۔ ایسی کہانیوں سے جھلا کر پاکستانی فوج کے ترجمان میجر جنرل وحید ارشد نے مغربی ذرائع ابلاغ کو ''الو کے پٹھوں'' کا لقب عطا کیا ہے اور یوں وہ اپنے ادارے اور پاکستان کے لیے سخت آزمائشوں کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔

امریکی انتظامیہ کو اپنے اس جرم کا احساس ہے کہ بے نظیر بھٹو اسے بار بار یہ پیغام دیتی رہیں کہ انہیں پاکستان میں انتہائی ناکافی سیکورٹی فراہم کی گئی ہے اور اس کی جان کو خطرات لاحق ہیں۔ معروف امریکی کالم نگار رابرٹ نووک کی ایک رپورٹ کے مطابق دسمبر کے اوائل میں انہوں نے اپنے حمایتی ایک سابق پاکستانی عہدے دار کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے حکام کو حقیقی خطرات سے باخبر کرنے اور پاکستان پر دباؤ ڈالنے کے لیے بھیجا تھا، لیکن امریکی اخبار ''ہارپر'' نے لکھا ہے کہ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے بے نظیر کی گہری تشویش پر توجہ دینے کے بجائے یہ کہا تھا کہ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہے اور جنرل پرویز مشرف انہیں گزند پہنچنے نہیں دیں گے۔

☆☆

بے نظیر صاحبہ برطانوی اور امریکی حکومتوں کے انتظامات کے تحت پاکستان آنے پر تیار ہوئی تھیں، مگر ان کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وطن میں ان کے لیے بڑے خطرات ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ستمبر کے وسط میں ایک خفیہ ای میل برطانوی فارن سیکرٹری ملی بینڈ (Miliband) کو بھیجی تھی جس میں لکھا تھا کہ آئی بی کے سربراہ ریٹائرڈ بریگیڈیئر سید اعجاز شاہ، پنجاب کے وزیر اعلیٰ چودھری پرویز الٰہی اور سندھ کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم ان کی جان کے درپے ہیں۔ اسی مضمون پر مشتمل ایک خط انہوں نے صدر جنرل پرویز مشرف کے نام ارسال کیا تھا اور ان سے مؤثر سیکورٹی فراہم کرنے کے لیے درخواست کی تھی۔ ان کے خدشات کے عین مطابق کراچی میں ان کے جلوس دہشت گردی کا نشانہ بنا اور وہ قاتلانہ حملے میں بال بال بچیں۔ انہوں نے آٹھ روز بعد یعنی 26 اکتوبر کو واشنگٹن میں اپنے دیرینہ دوست مارک سیگل کو ایک ای میل بھیجی کہ میں مشرف کے بعض ماتحت کارندوں کی طرف سے اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتی ہوں۔ ان کی طرف سے یہی ای میل سی این این کے رپورٹر وولف بلٹزر (Wolf Blitzr) کو بھی ارسال کی گئی تھی جس میں لکھا تھا کہ اگر مجھے کچھ ہوتا ہے، تو ذمے داری (صدر مشرف) پر عائد ہوگی۔ سی این این کے رپورٹر سے یہ وعدہ لیا گیا تھا کہ وہ میرے قتل کے بعد اسے استعمال کرنے کے مجاز ہوں گے۔ وولف بلٹزر نے 27 دسمبر کی رات اس ای میل کو سی این این پر نشر کیا تھا۔

بے نظیر کے دوست ایک سابق امریکی سفیر پیٹر گالبریتھ نے انکشاف کیا ہے کہ بے نظیر بھٹو کو حکومت کی فراہم کردہ سیکورٹی پر بھروسہ نہیں رہا تھا اور انہیں یہ خوف تھا کہ وہ سڑک پر بم دھماکے کا نشانہ بنا دی جائیں گی۔ مسٹر گالبریتھ نے وائس آف امریکہ سے باتیں کرتے ہوئے بتایا ہے کہ بے نظیر بھٹو نے انہیں 11 دسمبر کو ایک ای میل بھیجی تھی جس میں کہا تھا کہ وہ عراقی صدر جلال طالبانی سے درخواست کریں کہ وہ میری سیکورٹی ٹیم کو مضبوط بنانے کے لئے اپنے ماہرین تعینات کریں۔ دختر مشرق اپنی جان کے تحفظ کے لیے ہر طرف ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ لاس اینجلس ٹائمز نے اپنی ایک اشاعت میں لکھا ہے کہ ان کی جان کو لاحق خطرات کے پیش نظر اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ بے نظیر کو خفیہ معلومات فراہم کرتا اور انہیں سیکورٹی ہدایات بھی دیتا رہا۔ سفارت خانے کے حکام نے حکومت پاکستان سے حفاظتی انتظامات بڑھانے کی درخواست بھی کی تھی جو مسترد کر دی گئی تھی۔

☆☆

محترمہ نے کراچی آنے سے دو روز پہلے اپنا وصیت نامہ تحریر کیا اور اپنے خاندان کے مختلف افراد، دوستوں اور ملازموں کے نام الگ الگ خط لکھے اور انہیں پوری ذمے داری کے ساتھ پہنچانے کی ہدایات دیں۔ وہ دراصل ایک بہادر اور انسانوں سے محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ تمام تر خطرات کے باوجود انہیں کامل یقین تھا کہ ان کی وطن میں آمد سے عوام کے لیے امیدوں کی قندیل روشن ہو جائے گی اور پاکستان میں جمہوریت کا سورج طلوع ہوگا۔ انہیں اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور اپنے اہل وطن پر بڑا اعتماد تھا اور ان کی یہ سوچی سمجھی رائے تھی کہ جمہوری اداروں کے استحکام سے ملک میں عسکریت پسندی اور دہشت گردی پر قابو پایا جا سکتا ہے اور فوج کو بتدریج امور سیاست سے بے دخل کر دینا ممکن ہے۔ گزشتہ ایک ڈیڑھ سال سے پاکستان میں حالات ایک ایسی نہج پر بہ نکلے تھے جو انہیں ایک عوامی لیڈر کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنے کی دعوت دے رہے تھے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موت ان کو پاکستان کی طرف کشاں کشاں لا رہی تھی۔

بے نظیر صاحبہ کی شہادت سے پاکستان کے مستقبل پر کیا کیا اثرات مرتب ہوں گے، ان کا جائزہ لینے سے پہلے اس امر کا تجزیہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بہیمانہ قتل کی ذمے داری کس کس پر عائد ہوتی ہے۔ اپنے پیارے وطن کا تحفظ اور سلامتی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ان محرکات اور عوامل کا ٹھیک ٹھیک سراغ لگایا جائے جو اتنے عظیم حادثے کا باعث بنے ہیں اور جن کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی دہشت ناک اور بے وقت موت سے امریکی منصوبوں کو بہت دھچکا لگا ہے اور شرق اوسط میں عالمی طاقتیں انتہائی پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہیں۔ افغانستان میں ایک زبردست اور ناقابل تسخیر قوت مزاحمت نے نیٹو افواج کو ذہنی طور پر شکست سے دوچار کر دیا ہے، جبکہ پاکستان میں صدر پرویز مشرف سیاسی طور پر نزع کی حالت میں ہیں۔ بے نظیر بھٹو کی شہادت نے ایک بہت بڑا خلا پیدا کر دیا ہے جسے ایک جامع اور حقیقت پسندانہ حکمت عملی کے ذریعے ہی پر کیا جا سکے گا۔ البتہ ہمیں اس امر کا جائزہ لینا ہوگا کہ ان کی ہلاکت کے ذمے دار کون کون سی داخلی اور خارجی طاقتیں، ادارے یا گروپ ہو سکتے ہیں۔

☆☆

حالات کے نشیب و فراز کا گہرا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ محترمہ کی دردناک موت کی سب سے پہلی ذمے داری امریکہ پر عائد ہوتی ہے۔ بش انتظامیہ نے پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن کو پاکستان جانے اور جنرل پرویز مشرف کو سیاسی مدد فراہم کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ برطانیہ کے ایک خبر رساں ادارے نے کیپٹل ہل ویو ویب سائٹ کے حوالے سے ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ بے نظیر کے قتل میں بش انتظامیہ ملوث ہے۔ دلیل اس کی یہ دی ہے کہ امریکی خفیہ اداروں نے اپنے صدر کو خبردار کیا تھا کہ اگر بے نظیر بھٹو پاکستان گئیں، تو وہ قتل کر دی جائیں گی، مگر صدر بش نے وارننگ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی وزیر خارجہ کنڈولیزا رائس کو بے نظیر سے ملاقات کے لیے لندن بھیجا جنہوں نے براہ راست یقین دہانی کرائی کہ پاکستان میں سی آئی اے انہیں مکمل تحفظ فراہم کرے گی، لیکن جب وہ پاکستان پہنچیں، تو سی آئی اے نے ان کی سکیورٹی میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور بے نظیر کی تشویش پر امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے بھی کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا۔ امریکی انتظامیہ کے اس بدلے ہوئے رویے نے اپوزیشن لیڈر بے نظیر بھٹو کو یہ احساس دلا دیا کہ اسے جمہوریت کے بجائے صرف اس بات میں دلچسپی ہے کہ جنرل مشرف حکومت کی گرتی ہوئی ساکھ اور اس کی سیاسی

ضعف کو سہارا دیا جائے، چنانچہ انہوں نے ایک موقع پر اعلان بھی کیا کہ میں کسی ڈیل کی پابند نہیں رہی۔ سی آئی اے کے ایک سابق عہدے دار نے کہا ہے کہ سکیورٹی کمیونٹی کے بعض حلقوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ بے نظیر کے قتل پر امریکی انتظامیہ نے خوشی کا اظہار کیا ہے، کیونکہ انہیں پاکستان کے اندر القاعدہ کے خلاف جنگ میں شدت لانے اور پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے حوالے سے آپریشن کرنے کا جواز مل گیا ہے۔ یہ خبر بھی آئی ہے کہ بے نظیر کی شہادت امریکی فوج کے زیر استعمال لیزر بم سے ہوئی ہے اور حال ہی میں ہوم سکیورٹی ویب سائٹ نے انکشاف کیا ہے کہ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر قبضہ کرنے، ملک میں بڑھتی ہوئی بے چینی اور حکومت کو لاحق خطرات پر قابو پانے کے لیے امریکی دستوں کو تیار اور مستعد رہنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔

قومی اور بین الاقوامی سطح پر یہ سوچ بھی ابھرتی جا رہی ہے کہ صدر پرویز مشرف اس قومی سانحے کے براہ راست ذمے دار ہیں، کیونکہ وہ فول پروف سکیورٹی فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ بے نظیر بھٹو نے تو انہیں اور ان کے ماتحت کارندوں کو اپنی 26 اکتوبر کی ای میل ہی میں نامزد کر دیا تھا جسے آصف علی زرداری اب ایک نزاعی بیان کی حیثیت دے رہے ہیں۔ اے پی ڈی ایم نے بھی صدر پرویز مشرف کو اپوزیشن کے عظیم سیاسی لیڈر کی موت کا ذمے دار قرار دیا ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ میں بھی ان پر انگلیاں اٹھائی جا رہی ہیں۔ عالمی تجزیہ نگار پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کو ایک ایسا دیو تصور کرنے لگے ہیں جو انسانوں کے جسم و روح قبض کر لیتا ہے اور مذاکرات پر یقین رکھنے والے سیاسی قائدین کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ نواب اکبر بگٹی اور بے نظیر بھٹو اس کھلی بربریت کی واضح مثالیں ہیں۔ بلاشبہ جنرل پرویز مشرف نے محترمہ کو سیاسی عمل میں شامل کرنے کے لیے مذاکرات کا ایک وسیع تانا بانا بنا تھا اور وہ ان کی درپردہ یقین دہانیوں کے سائے میں اپنے وطن لوٹی تھیں، مگر عوام کی طرف سے ان کے 18 اکتوبر کے والہانہ استقبال نے اسٹیبلشمنٹ میں تشویش کی لہر دوڑا دی تھی اور اپنے جلوس پر قاتلانہ حملے کے بعد بے نظیر بھٹو نے القاعدہ یا طالبان پر الزام دھرنے کے بجائے آئی ایس آئی کے بعض عناصر کی طرف واضح اشارہ کرتے ہوئے واقعات کی غیر ملکی ماہرین کے ذریعے تحقیقات کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ میاں نواز شریف اور پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن کے انتخابی جلسوں میں جوں جوں حاضرین کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، توں توں مفاد پرست طبقے اپنے حواس کھوتے جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں قائدین کے جلسوں پر 27 دسمبر کی سہ پہر اقتدار کے کاسہ لیسوں کی طرف سے جدید ترین آلات اور ٹیکنالوجی کے ذریعے حملے ہوئے جن میں بے نظیر موت کی آغوش میں چلی گئیں۔ اسٹیبلشمنٹ کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ سیاسی قیادتیں عوام کے مینڈیٹ کے ذریعے اقتدار میں آ کر اس کے تمام کس بل نکال دیں گی اور فوج کو اپنے آئینی فرائض کے دائرے تک محدود کر دیں گی، چنانچہ سب سے پہلے وہ طاقت ور سیاسی شخصیت راستے سے ہٹائی گئی جسے چاروں صوبوں اور خاص طور پر اندرون سندھ میں زبردست سیاسی حمایت حاصل تھی اور عالمی برادری میں بھی اس کے روابط نہایت وسیع اور گہرے تھے۔ اعلیٰ سطح کے حکام کے ملوث ہونے کے عمومی تاثر کو حکومت کے بعض انتہائی احمقانہ اقدامات سے تقویت ملی۔ جائے حادثہ کی فوری صفائی اور دس بارہ گھنٹوں کے اندر اندر وزارت داخلہ کا یہ اعلان کہ بیت اللہ محسود کے آدمی اس بہیمانہ قتل کے ذمے دار ہیں اور محترمہ کی موت سن روف کے کنڈے سے ٹکرانے سے واقع ہوئی ہے، جلتی پر تیل کا کام کر گیا۔ بڑی جلد بازی میں اٹھائے ہوئے یہ اقدامات حکومت کی اس نیت کو واضح طور پر عیاں کرتے تھے کہ وہ قتل کی واردات کے تمام نشانات اور ثبوت مٹا دینے اور

اپنی مجرمانہ غفلت اور اپنے مذموم عزائم پر پردہ ڈالنا چاہتی ہے۔ صدر پرویز مشرف سالہا سال سے بے نظیر کے بغیر پیپلز پارٹی کے ساتھ عہد و پیمان کرنے کے لیے کوشاں تھے اور اب انہیں اپنا گوہر مقصود ہاتھ آ گیا ہے۔

☆☆

بے نظیر صاحبہ کے قاتلوں کا سراغ لگانا ملک میں دہشت گردی کے خاتمے کے لیے بہت ضروری ہے اور اس کے لیے دیانت دارانہ کوشش کی جانی چاہیے۔ بہتر یہ ہوگا کہ اسے ایک سیاسی ایشو بنانے کے بجائے تفتیش کا ایک سائنٹفک راستہ اختیار کیا جائے۔ پیپلز پارٹی کو اعتماد میں لے کر ایک بااختیار عدالتی تحقیقاتی کمیشن قائم کیا جائے۔ اب تک سامنے آنے والی معلومات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قتل کا منصوبہ پیشہ وارانہ نشانہ بازوں اور جدید ترین ٹیکنالوجی کے ماہرین کے تعاون سے تیار ہوا ہے۔ روس کی فوجی خفیہ ایجنسی نے انکشاف کیا ہے کہ نشانہ باز تین تھے جنہوں نے محترمہ پر چھ فائر کیے۔ لیزر گن کی بات بھی سامنے آئی ہے جبکہ ہماری حکومت کا بار بار اصرار یہی ہے کہ یہ دہشت گردی بیت اللہ محسود کے تربیت یافتہ آدمیوں نے کی ہے۔ بیت اللہ محسود نے بی بی سی کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اس الزام کی شدت سے تردید کی ہے اور اس قتل کا الزام پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں پر عائد کیا ہے اور ایک مکمل اور غیر جانب دار تحقیقات کا مطالبہ کر ڈالا ہے۔ ہمارے حکمران مسلسل ایک ہی تاثر دیے جا رہے ہیں کہ بم دھماکے اور خودکش حملے کرنے والے مدرسوں میں تیار ہو رہے ہیں۔ پاکستان وفاق المدارس عربیہ کے سیکرٹری جنرل مولانا قاری حنیف جالندھری نے اس ضمن میں ایک بڑی مثبت اور کارآمد تجویز پیش کی ہے کہ اب تک جتنے بم دھماکے اور خودکش حملے ہوئے ہیں، ان کی تحقیقات کے لیے ایک بااختیار عدالتی کمیشن قائم کیا جائے جو مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر جامع سفارشات پیش کرے۔ ان کا چیلنج یہ ہے کہ ان خونیں واقعات کے پس پردہ مذہبی جتھوں کے بجائے حکمرانوں کے غلط سیاسی فیصلے کارفرما ہیں اور ان کے سدباب علماء کے مقابلے میں ارباب اختیار بہتر انداز میں کر سکتے ہیں۔

☆☆

بے نظیر کی شہادت سے ملک میں ایک ہولناک سیاسی خلا یک لخت پیدا ہو گیا ہے اور بین الاقوامی دنیا میں پاکستان کے تشخص پر سوالیہ نشانات لگتے جا رہے ہیں۔ بلوچستان اور قبائلی علاقوں کے بعد سندھ کا احساس محرومی ایک نئی جہت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جنرل پرویز مشرف کے آٹھ سالہ دور حکومت میں ذہنی طور پر ہمارا قومی شیرازہ بکھر چکا ہے اور ملکی سالمیت شدید خطرے میں پڑ گئی ہے۔ فوجی طاقت کا وحشیانہ استعمال، دستور کی چیر پھاڑ، ریاست کی سطح پر ظلم و تشدد کی یلغار، عدلیہ اور میڈیا پر انگیزیکٹو کے بار بار شب خون اور ہر قیمت پر امریکی مفادات کی تکمیل نے ریاست اور فوج پر سے عوام کا اعتماد ختم کر دیا ہے۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بے نظیر عام آدمی کی امیدوں اور امنگوں کی ترجمانی کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پاکستان آئی تھیں جنہیں ان شتر بے مہار قوتوں نے شہید کر دیا جو چالیس برسوں سے فقط سایوں کے خلاف شمشیر زنی کرتی آئی ہیں۔ اقتدار کے پجاری عوامی قیادت کے ابھرنے سے ہمیشہ خوف کھاتے رہے ہیں، انہوں نے ایک نڈر اور بہادر خاتون کو زیر کرنا چاہا، مگر وہ اپنی زندگی میں جس قدر و منزلت کی مالک تھیں، شہادت کے بعد عظیم تر اور پہلے سے کہیں زیادہ طاقت ور بن کر ابھری ہیں۔ ان کی شہادت نے پاکستان کو بکھرنے اور اس کی وحدت کو پارہ پارہ ہونے سے بچا لیا ہے اور تمام اہل وطن کو ایک مشترک غم اور ایک مشترک نصب العین کے رشتے میں پرو دیا ہے

۔ان کی شہادت کی خبر سنتے ہی خیبر سے کراچی تک اور کوئٹہ سے لاہور تک پورے ملک میں ایک شدید عوامی ردعمل پیدا ہوا اور لوگوں نے کامل یک جہتی اور گہرے شعور کا ثبوت دیا۔ سچی بات یہ ہے کہ بے نظیر کی شہادت ہماری شاہراہ زندگی پر تابندہ نقوش ثبت کر گئی ہے۔

(ماہنامہ ''اردو ڈائجسٹ'' جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

الوداع بینظیر

ارشاد احمد حقانی

شہید ذوالفقار علی بھٹو کی شہید بیٹی بے نظیر بھٹو جب دو ماہ نو دن پہلے وطن واپس آئیں تو ان کی سلامتی کے بارے میں سخت خدشات پائے جاتے تھے۔ دوسروں سے بڑھ کر خود انہیں ان خطرات کا احساس تھا لیکن انہوں نے اپریل 1979ء میں اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو سے جیل میں آخری ملاقات کے وقت جو وعدہ کیا تھا: ''بابا! میں آپ کے مشن کو آگے لے کر چلوں گی'' اس وعدے کی لاج رکھنے کے لیے انہوں نے ہر طرف سے ظاہر کیے جانے والے خطرات اور خدشات کو پس پشت ڈالتے ہوئے 8 جنوری 2008ء کے انتخابات کی مہم جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی پہلی ہی عوامی ریلی میں خوفناک بم دھماکے ہوئے جن میں ڈیڑھ سو کے قریب لوگ شہید اور کئی سو زخمی ہوئے جبکہ محترمہ خوش قسمتی سے محفوظ رہیں اس وقت بہت سے لوگوں نے جن میں ان کے دوست اور دشمن دونوں شامل تھے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اب محترمہ کے لیے اپنی پارٹی کی انتخابی مہم زور شور سے چلانا ممکن نہیں ہو سکے گا اور وہ اپنی جان اور ذات کو لاحق خطرات کی وجہ سے پبلک جلسے کر سکیں گی نہ ریلیوں کی قیادت کر سکیں گی لیکن انہوں نے ان اندازوں کو غلط ثابت کر دیا اور جمہوریت، قانون کی حکمرانی، عدل اجتماعی اور ملک کی ترقی کے لیے جو عزم انہوں نے کر رکھا تھا اس کی تکمیل کے لئے وہ بے دھڑک باہر نکل آئیں اور ملک کے چاروں صوبوں میں جلسوں اور ریلیوں سے خطاب کیا اور اپنا پیغام عوام تک پہنچایا۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے دل و دماغ کے کسی گوشے میں امید کی یہ کرن روشن ہونے لگی کہ یہ خدشات بے بنیاد ثابت ہوں گے اور بے نظیر الیکشن میں اپنی پارٹی کی قیادت کر سکیں گی لیکن 27 دسمبر کی شام روشنی کی یہ کرن بجھ گئی اور بے نظیر بھٹو اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بے نظیر بھٹو کے ناقدین اور مخالفین کی بھی کمی نہیں لیکن ان کے چاہنے والوں اور ان کے مداحوں کی تعداد ان کے ناقدین سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ ایک دلیر اور جری اور ایک بہادر خاتون تھیں اور اپنی شہادت سے صرف چند روز پہلے انہوں نے کہا تھا کہ گیدڑ کی طرح ڈر کر لمبی عمر حاصل کرنے کی بجائے شیر کی طرح سینہ تان کر آگے بڑھتے ہوئے جان دینا میرے لئے باعث فخر ہوگا۔ بے نظیر نے چار اپریل 1979ء کے روز اپنے باپ سے وعدہ کیا تھا وہ اس کی لاج رکھنے میں کامیاب رہیں۔ اس وقت کے ظالموں نے بینظیر اور اس کے باپ کو اس آخری ملاقات میں بھی ایک دوسرے کے گلے لگ جانے کی اجازت نہ دی اور سلاخوں کے پیچھے کھڑے باپ کو بینظیر سوجی ہوئی آنکھوں اور بہتے آنسوؤں کے ساتھ دیکھتی رہی۔ بے نظیر کی المناک شہادت پاکستان کی تاریخ کے بڑے المیوں میں سے ایک ہے۔ پاکستان پہلے ہی کچھ کم مشکلات اور مصائب، بے یقینی اور پر خطر حالات سے دوچار نہ تھا۔ بے نظیر بھٹو کی اچانک شہادت نے ان تمام خدشات اور بے یقینی کی حالت میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے، بے نظیر کو بجا طور پر چاروں صوبوں کی زنجیر کہا جاتا تھا آج وہ زنجیر ٹوٹ گئی ہے اور میرے عزیز وطن پاکستان کا وفاق کمزور تر ہو گیا ہے۔ بے نظیر نے اپنی شہادت سے

چند روز پہلے بلوچستان میں بلوچوں کو یقین دلایا تھا کہ میں اقتدار میں آ کر تمہارے تمام حقوق تمہیں لوٹا دوں گی۔ میں تمہیں اپنے صوبے کے وسائل کا مالک بنا دوں گی تمہیں پاکستان کے محترم اور باعزت اور برابر کے شہریوں کا مقام دوں گی جس سے مایوس بلوچوں کے دلوں میں امید کی ایک شمع روشن ہوئی تھی آج پاکستان کا ہر باشعور شہری غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسے بے نظیر کی شہادت کا جتنا دکھ ہے اتنی ہی فکر اس بات کی بھی ہے کہ وطن عزیز پر ان کی شہادت کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ بے نظیر اور اس کے باپ نے غریبوں کے لئے مادی حوالے سے شاید بہت کچھ نہ کیا ہو لیکن بھٹو خاندان سے ان کا رومانس قائم تھا۔ پاکستان کے لاکھوں کروڑوں مرد عورتیں اور جوان بینظیر پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لئے تیار تھے۔ وہ اس کی زندگی اور سلامتی کے لیے دعائیں مانگتے تھے لیکن قدرت کو شاید ابھی ان کا مزید امتحان مطلوب تھا۔ کل تک بلکہ چند گھنٹے پہلے تک پاکستان کے محروم اور پسماندہ دبے ہوئے اور مفلوک الحال عوام کو امید کی جھلک دکھانے والی بے نظیر بھٹو کی لحد اس وقت تیار ہو چکی ہے اور چند گھنٹوں کے بعد اس کا جنازہ پڑھا جائے گا اور اسے منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا جائے گا۔ ہائے! کل اس وقت کون یہ اندازہ کر سکتا تھا کون یہ کہہ سکتا تھا کون یہ سمجھ سکتا، کون یہ مان سکتا تھا کہ 24 گھنٹے نہیں گزریں گے اور بینظیر ان کے درمیان سے اٹھ جائے گی۔ وہ اقتدار میں آ کر اپنے کروڑوں پروانوں کے لئے کچھ کر سکتی یا نہ کر سکتی لیکن وہ ان کی امید تھی ان کا سہارا تھی انہیں اس سے عشق تھا انہیں اس سے پیار تھا وہ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں اس کے جلسوں میں آ رہے تھے لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ وہ بینظیر کا آخری دیدار کر رہے ہیں۔ دل اب بھی نہیں مانتا کہ بینظیر ہم میں نہیں رہیں۔ میرا قلم انہیں مرحوم اور شہید لکھتے ہوئے کانپتا ہے لیکن اللہ کی قضا اور رضا کے سامنے سب بے بس ہیں۔

راقم نے پہلی دفعہ بینظیر کو لندن کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اس وقت دیکھا جب وہ اپنے چھوٹے بھائی شاہنواز کی پراسرار موت پر پرسہ دینے کے لئے آنے والے ہزاروں پاکستانیوں اور جانثاروں سے ملنے کے لئے دو روز کے لئے لندن آئی تھیں۔ میں اس وقت اتفاق سے لندن میں تھا۔ میں ان کے فلیٹ پر گیا کمرہ چھوٹا تھا ہجوم بہت زیادہ تھا ہدایت یہ تھی کہ جو لوگ دعا مانگ لیں کمرے سے چلے جائیں تاکہ دوسرے لوگ ان کی جگہ آ سکیں۔ مجھے یہ اعتراف ہے کہ میں نے کسی نہ کسی طرح اس حکم، ہدایت کی خلاف ورزی کی اور میں اس چھوٹے سے کمرے کے ایک کونے میں تادیر دبک کر بیٹھا رہا۔ بینظیر زار و قطار رو رہی تھیں۔ وہ بہت نحیف و نزار اور کمزور نظر آ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ میں ایک متجسس مبصر کی حیثیت میں ان کی شخصیت کے پہلوؤں کا گہرائی میں جا کر جائزہ لینے کا خواہشمند تھا۔ میں جتنی دیر وہاں بیٹھا رہا ان کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا لیکن وہ آنکھوں کے اشاروں سے تعزیت کے لئے آنے والوں کا شکریہ ادا کرتی رہیں۔ میر مرتضیٰ بھٹو کو جب کراچی میں ان کے گھر کے باہر قتل کیا گیا تو دو دن کے بعد محترمہ وزیراعظم ہاؤس میں واپس آئیں۔ انسانوں کا ایک سمندر ان سے اظہار افسوس کے لئے وزیراعظم ہاؤس میں پہنچا ہوا تھا۔ یہاں بھی وہ ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں جو اگرچہ کافی بڑا تھا لیکن سب آنے والوں کو ملاقات کا موقع دینے کے لئے یہاں بھی یہی فیصلہ تھا کہ جو لوگ بی بی سے اظہار افسوس کر لیں وہ دوسروں کے لئے جگہ خالی کر دیں۔ میں جس گروہ کے ساتھ وزیراعظم کے اس کمرے میں گیا تھا جب وہ اظہار تعزیت کے بعد وہاں سے جانے لگا تو میں بھی اپنی نشست سے اٹھا اور باہر جانے کے دروازہ کا رخ کیا۔ میں ابھی ایک آدھ قدم ہی چلا تھا کہ بی بی کا پیغام آیا: "حقانی صاحب! آپ اور اعتزاز احسن ٹھہر جائیں۔ آپ کمرے سے نہ جائیں۔ مجھے آپ کی

موجودگی سے حوصلہ ملتا ہے۔'' اس پر جناب اعتزاز احسن اور میں ایک طرف رکھی ہوئی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جب لوگوں کا ہجوم تھما۔ کمرے میں کچھ خاموشی ہوئی تو بڑی دیر تک کسی نے خاموشی کی اس مہر کو نہ توڑا۔ غمزدہ لوگ اپنا دکھ دل میں لئے خاموش بیٹھے رہے پھر چند منٹ کے بعد محترمہ خود بولیں اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''حقانی صاحب! یہ سب کیا ہوا ہے کیسے ہوا ہے کیوں ہوا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی'' اس وقت بی بی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چہرے کے نقوش بدلے بدلے معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے گزشتہ دو دنوں میں شائع ہونے والی خبروں کی روشنی میں اپنی سوچ کے مطابق صورتحال کا مختصر تجزیہ پیش کیا۔ بی بی نے کچھ سوال کئے جن کا جواب میں نے بھی دیا اور دوسروں نے بھی۔ بی بی کا چہرہ معمول کے مقابلے پر بہت زیادہ بدلا ہوا تھا اس پر اس گہرے اور عمیق زخم کے اثرات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس مجلس میں شریک کوئی بھی آدمی قطعیت سے یہ کہنے کی پوزیشن میں نہ تھا کہ یہ حادثہ کس طرح رونما ہوا ہے۔

بی بی کی المناک اور اچانک شہادت ان بڑے صدمات میں سے ایک ہے جو پاکستان نے پچھلے 60 سال میں برداشت کئے ہیں۔ ملک ہمیشہ سے بڑھ کر داخلی عدم استحکام کی گرفت میں ہے۔ اہل پاکستان بالخصوص اہل سندھ و اہالیان لاڑکانہ سکتے کی حالت میں ہیں۔ ایسے وقت میں بینظیر کے مداحوں سے یہی درخواست کی جاسکتی ہے کہ وہ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور بینظیر سے اپنی محبت کا ثبوت اس طرح دیں کہ ملک کو مزید غیر مستحکم ہونے سے بچانے کی کوشش کریں نیز ان کے مشن ان کے کاز کے ساتھ اپنی وابستگی نہ صرف کمزور نہ ہونے دیں بلکہ اسے مضبوطی سے تھام لیں۔ انتخابات کا کیا ہوگا؟ کب ہوں گے؟ ہو بھی سکیں گے یا نہیں اور ان کا نتیجہ کیا ہوگا یہ بڑے بڑے سوالات ہیں جن کے دور رس اثرات اور نتائج ہیں لیکن وقت انہیں کسی نہ کسی طرح حل کرے گا لیکن بینظیر نہیں ہوں گی۔ ان کا کوئی بدل ابھی سامنے نہیں ہے ان کی پارٹی اس صدمے سے کس طرح عہدہ برآ ہوگی یہ بھی ابھی معلوم نہیں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس شر سے پاکستان کے لئے خیر برآمد کرے۔ میں یہ سطور حضور ﷺ کے سکھائی ہوئی دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں:

''اے میرے رب! تو مرحومہ کو بخش دے اور اس پر رحم کر۔ وہ اپنی زندگی میں جتنی نیکیاں کر سکی ہے ان کے اجر میں اضافہ فرما اور اس سے جو غلطیاں سرزد ہوئی ہوں ان سے درگزر فرما۔'' آمین۔ الوداع بی بی! الوداع محترمہ بے نظیر بھٹو!!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(روزنامہ ''جنگ'' 29 دسمبر 2007ء)

♥ ..... ♥ ..... ♥

کچھ سوکھے ہوئے آنسو

نذیر ناجی

مجھے شعور کی آنکھ کھولے 55 سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس دوران کیسے کیسے سانحے نہیں ہوئے ہوں گے؟ مجھے نہیں یاد کہ پوری پاکستانی قوم اور عالمی برادری کسی بھی ایک سانحے پر اتنے گہرے صدمے سے دوچار ہوئی ہو۔ بے نظیر بھٹو انسانی حیثیت سے بہت اوپر چلی گئی تھیں۔ سیاسی تقسیم کی دیواریں ان کے آگے ٹوٹ چکی تھیں۔ ملکوں کی سرحدیں ان کے سامنا سرنگوں ہو چکی تھیں اور قوموں کے فاصلے ان کی ذات کے لئے مٹ چکے تھے۔ تیسری دنیا میں اور کسی خاتون کو یہ سربلندی نصیب نہیں ہوئی۔ اندرا گاندھی ہم سے پانچ گنا بڑے ملک کی لیڈر اور وزیراعظم تھیں۔ انہیں بھی گولیوں کا شکار بنایا گیا تھا۔ ان کی موت بھی ایک بڑا سانحہ تھی۔ لیکن اس سانحہ پر بھارت تین دن کے لئے اس طرح سوگ میں نہیں ڈوبا جیسے بے نظیر کے لئے پاکستان اور نہ ہی عالمی میڈیا میں مسلسل کئی دنوں تک اس سانحہ کی خبر اس طرح چھائی رہی جیسے بی بی کی خبر..... یہ بینظیر کی عظمت کا ایک ایسا اعتراف تھا جو غیر معمولی شخصیتوں کے حصے میں آتا ہے۔ پاکستان میں یہ سانحہ بجلی کی طرح گرا اور پورا ملک سکتے کی حالت میں آ گیا۔ کسی نے ہڑتال کی اپیل نہیں کی۔ کسی نے سوگ منانے کا اعلان نہیں کیا۔ کسی نے ماتمی تقریب نہیں کی لیکن گلی گلی صف ماتم تھی اور گھر گھر بین ہو رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر شہر، ہر گلی اور ہر گھر میں کسی اپنے کی موت ہوئی ہو۔ شہادت بھٹو صاحب کو بھی نصیب ہوئی تھی لیکن بے نظیر کی شہادت بینظیر تھی۔

بھٹو صاحب کی شخصیت میں تیزی اور طراری کے ساتھ ساتھ جارحانہ انداز بھی تھا۔ وہ اپنی بے پناہ ذہانت کا اظہار ایسے انداز میں کرتے کہ دوسرے مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکتے اور بھٹو صاحب اس کیفیت سے خوب لطف اندوز ہوتے۔ انہیں دوسرے کا ذہن پڑھنے کا بھی کمال حاصل تھا۔ مخاطب ابھی ابتدائیہ بھی مکمل نہ کرتا کہ بھٹو صاحب خود بتا دیتے کہ وہ کیا کہنے آیا ہے اور ان کا قیافہ عموماً درست ہوتا۔ یہی خوبیاں بے نظیر میں بھی تھیں۔ انہیں اپنی ذہنی سبقت سے لطف اندوز ہونا اچھا لگتا۔ نوعمری میں وہ بھی اپنے عظیم والد کی طرح سب سے پہلے کوئی نیا نکتہ پیش کر کے فاتحانہ انداز میں لطف اندوز ہوا کرتیں۔ 1977ء کا واقعہ ہے بھٹو صاحب جیل میں تھے۔ بیگم نصرت بھٹو نے راولپنڈی میں سید اصغر علی شاہ کے گھر ایک پریس کانفرنس بلا رکھی تھی۔ وہ اپنے انداز میں ضیاء الحق پر تنقید کر رہی تھیں۔ بینظیر انہیں ٹوک کر اپنی بات کرنے لگیں۔ کبھی کہتیں یہ کشمیر کو بیچ دے گا اور کبھی الزام لگاتیں کہ یہ اپنے اقتدار کی خاطر پاکستان کا سودا کر دے گا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بیگم بھٹو کو یہ مداخلت اچھی نہیں لگ رہی تھی لیکن وہ بے نظیر کے سامنے بزرگانہ برتری دکھانے سے گریز کیا کرتی تھیں۔ بھٹو صاحب بینظیر کو اپنا پہلا بیٹا کہتے تھے۔ یہ پہلا بیٹا بہت ہی لاڈلا اور سر چڑھا تھا۔ بھٹو صاحب کے مقدمے اور اس کے بعد اپنی قید کے دوران بینظیر کی شخصیت کا جارحانہ عنصر ہمیشہ نمایاں رہا۔ وہ حکومت اور ضیاء الحق پر سخت سے سخت تنقید کیا کرتیں۔ پارٹی کے سینئر لیڈر بے نظیر کے اس انداز پر خوش نہیں تھے لیکن ان کے سامنے بولنا مہنگا کام ہوتا۔ جس کسی نے ان پر بزرگی جھاڑنے کی کوشش کی اسے گھر بیٹھنا پڑا۔ سیاسی مخالفین پر وہ عقاب کی طرح جھپٹتیں۔ 1988ء، 1990ء، 1993ء اور 1997ء کی انتخابی مہمات میں بے نظیر

نے اپنے سیاسی مخالفین پر جو حملے کئے ان کے بعض جملے سن کر بی بی کے اپنے حامی بھی حیرت میں ڈوب جاتے لیکن وہ اپنے اس جارحانہ انداز کو پسند کرتی تھیں۔1986ء میں ایک پریس کانفرنس کے دوران وہ مجھ پر بھی برس پڑیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ بعد میں افسوس کا اظہار کریں گی لیکن کئی سال تک ایسا نہ ہوا اور جب ہوا تو یہ میرے لئے ہی نہیں پاکستان بھر سے آئے ہوئے صحافیوں اور دانشوروں کے لئے حیرت انگیز تھا۔ محترمہ پاکستان کی وزیراعظم تھیں۔ ہم ان کے ڈنر پر مدعو تھے جب وہ ہال میں داخل ہوئیں تو اپنی روایاتی بلند آواز میں پوچھا ''ناجی صاحب کہاں ہیں؟'' میں دور کی ایک میز پر بیٹھا تھا۔ حسین حقانی سیکرٹری اطلاعات تھے، انہوں نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے نشاندہی کی۔ تو بی بی نے وہیں سے مخاطب ہو کر مجھے مرکزی میز پر بلایا۔ ان کے سامنے ایک کرسی خالی پڑی تھی۔ مجھے اس پر بیٹھنے کی دعوت دی اور پھر بتایا کہ ''یہ کرسی آصف صاحب کے لئے رکھی تھی جس پر آپ بیٹھے ہیں'' یہ خصوصی عزت افزائی کا ایک ایسا انداز تھا جس کی اہمیت وہی سمجھ سکتا ہے جو بھٹو خاندان کے مزاج سے واقف ہو۔ اس کے بعد بی بی نے مجھے تقریر نویسی کی دعوت دی۔ یہ غیر معمولی مہربانی اس تلخ کلامی کی تلافی کے لئے تھی جس کا مجھے 1986ء میں ہدف بننا پڑا تھا لیکن تلافی کے اس انداز سے میری وہ عزت افزائی ہوئی جو میرے پیشے سے تعلق رکھنے والوں کو کم ملتی تھی۔

یہ ذاتی واقعہ برسبیل تذکرہ آ گیا۔ درحقیقت میں اس طویل سفر کا چند جملوں میں احاطہ کرنا چاہتا ہوں جو بے نظیر بھٹو نے پنکی سے بی بی بننے تک طے کیا۔ میرا خیال ہے کہ بی بی کے جارحانہ انداز میں نرمی اس وقت پیدا ہونا شروع ہوئی جب انہیں ماں بننے کا اعزاز ملا۔ مامتا محض اولاد کے لئے نہیں ہوتی یہ ایک جذبہ ہوتا ہے جو اپنے بچے سے شروع ہو کر جب پھیلنے لگتا ہے تو پوری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ جس بی بی کی شہادت پر بلاتفریق ہر خیال کے لوگ دکھ میں ڈوبے ہیں وہ قوم کے لئے ایک ماں اور بہن کی محبت کی علامت بن چکی تھیں۔ گزشتہ چند سال سے بے نظیر کی جارحیت پر مامتا غالب آنے لگی تھی۔ اپنے سیاسی مخالفین پر جس طرح کی وہ تنقید ماضی میں کیا کرتی تھیں وہ ماند پڑنے لگی تھی اور آپ نے دیکھا کہ ان کے بدترین سیاسی مخالفین بھی اب ان کے ساتھ کام کرنے کے امکان پر گھبرانا چھوڑ چکے تھے خصوصاً نواز شریف کے ساتھ باہمی تعاون کا جو رستہ استوار ہوا وہ بے نظیر کی اس تبدیلی کا سب سے بڑا ثبوت ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا۔ آخر میں لڑاکو پنکی کے اندر جنم لینے والی مامتا کا قصہ خود بے نظیر کی زبانی سن لیجئے۔ وہ 18 اکتوبر کے سانحے کے حوالے سے اپنا مشاہدہ بیان کر رہی تھیں۔ انہی کے الفاظ میں سنئے ''میں نے ٹرک کے اوپر کھڑے ہوئے دیکھا کہ ایک شخص پارٹی کے پرچم میں لپٹے ہوئے بچے کو میری طرف بڑھا رہا ہے اور ہجوم میں وہ آگے نہیں نکل پا رہا تھا۔ میرے اندر کی مامتا جاگی اور میں نے ہاتھ کے اشارے سے کارکنوں کو کہا کہ وہ اس بچے کو مجھ تک پہنچائیں۔ لیکن کارکن جوش و خروش کے عالم میں تھے۔ کسی نے اس بچے کی طرف توجہ نہیں دی اور مجھے افسوس رہا کہ میں بچے کو گود میں لے کر باپ کی خواہش پوری نہ کر سکی۔'' جس بچے کو بے نظیر گود میں لینے کے لئے بیتاب تھیں وہ ایک بم تھا۔ جسے ایک بچے کے پتلے میں چھپا کر رکھا گیا تھا تاکہ اسے بے نظیر تک پہنچا کر اڑا دیا جائے۔ اس وقت بے نظیر کو مامتا کے جذبے کا تقدس بچا گیا۔

(روزنامہ ''جنگ'' یکم جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

یہ رستہ کسی پر بند نہیں

نذیر ناجی

شہادت ذوالفقار علی بھٹو نے پیش کی۔ خون بے نظیر بھٹو نے بہایا اور پیپلز پارٹی کی قیادت کے فیصلے ارباب غلام رحیم، ممتاز بھٹو اور بعض دانشور کرنا چاہتے ہیں۔ سب کی دلیل ایک ہے اور وہ ہے بھٹو خاندان کا ورثہ۔ گویا پیپلز پارٹی کوئی عمارت، زرعی زمین یا بنک میں جمع شدہ دولت ہے جو بھٹو قبیلے کے بزرگوں کی طرف سے منتقل ہوتی ہوئی ذوالفقار علی بھٹو کو ملی تھی جس پر بے نظیر نے ناجائز قبضہ جمایا اور اب بلاول نے باپ کی مدد سے اسے ہتھیا لیا۔ جب بھٹو صاحب کے بعد بے نظیر نے پارٹی کی قیادت سنبھالی تھی اس وقت بھی یہی باتیں کی گئی تھیں۔ اس وقت کے سارے ممتاز بھٹو اور سارے ارباب رحیم روایتی وراثت کے اصولوں کی بات کر کے کہا کرتے تھے کہ باپ کی وراثت بیٹی کو نہیں بیٹے کو ملتی ہے۔ یہ لوگ بھول جاتے تھے کہ پیپلز پارٹی بھٹو خاندان کا نہیں ذوالفقار علی بھٹو کا ورثہ ہے اور یہ دولت یا جائیداد نہیں سیاسی طاقت ہے جسے ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں عوام نے تخلیق کیا۔ یہ بھٹو کی ایجاد بھی نہیں تھی جیسے پیٹنٹ کرایا جا سکے۔ یہ سوچوں، خیالوں، آدرشوں اور محبتوں کا ایک مجموعہ ہے جس میں لوگ اپنی مرضی اور خواہش سے شامل ہوتے ہیں اور کیونکہ ان سوچوں اور خیالوں کو ذوالفقار علی بھٹو نے کاشت کیا اور اپنے خون سے سینچ کر اسے تن آور درخت میں بدلا اس لئے عوام اس پارٹی کو بھٹو کے نام سے پہچانتے ہیں اور اسی نام کے تحت اپنی سیاسی شناخت برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ خاندان کی جائیداد میں سے جس کا جو حصہ بنتا تھا وہ لے چکا۔ کئی تو اس سے زیادہ بھی لے چکے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ممتاز بھٹو کو جن وزارتوں سے نوازا وہ بھٹو خاندان کے ورثے میں نہیں آتی تھیں۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی جدوجہد کے ثمرات تھے جو ذوالفقار علی بھٹو نے ممتاز بھٹو کو تحفے میں دیئے تھے۔ ممتاز بھٹو کی اپنی سیاسی حیثیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت کے بعد وہ ان کی یتیم بیٹی کا مقابلہ بھی نہ کر پائے۔ وہ دو مرتبہ ملک کی وزیراعظم بنیں اور ممتاز بھٹو ایک صوبائی وزارت کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ صرف نگرانی کی ایک وزارت حاصل کی جو انتظامیہ کی مہربانی سے ملا کرتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے جب بے نظیر کو اپنا جانشین بنایا تو اس کی پہلی قیمت اسے قید اور جلاوطنی کی صورت میں ادا کرنا پڑی۔ اس کے نوجوان اور جذباتی بھائیوں کو دھوکے سے انتہا پسندی کی راہ پر لگایا گیا۔ اس میں بے نظیر کو ملوث کرنے کی کوشش کی گئی۔ سازشوں کے کھیل میں اسے اپنے دو بھائیوں کو قبروں میں دفنا کر زندگی بھر کے لئے آنسوؤں میں ڈوبنا پڑا۔ پارٹی کے کئی سینئر لیڈروں نے بھٹو کی پارٹی بیچ کر مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ سب سے لڑتے ہوئے اپنے باپ کی پارٹی کو بچاتی رہی۔ بھائیوں کی موت کے صدمات اور شوہر کی طویل قید اور جلاوطنی کے شدید عذاب سے گزرنے کے بعد بے نظیر اپنے باپ کی جماعت کو اس مقام تک لائی کہ آج پوری دنیا اسے پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تسلیم کرتی ہے۔ ورثے کی باتیں کرنے والے یہ بتائیں کہ بے نظیر نے 27 سال کی طویل جدوجہد سے جس جماعت کو اس مقام تک پہنچایا اس میں بھٹو

خاندان کے دوسرے لوگوں نے حصہ کیا ڈالا تھا؟ اس کے برعکس پیپلز پارٹی کو نقصان پہنچانے کے لئے بھٹو خاندان میں کس کس نے اپنی خدمات پیش کی تھیں؟ اور کس کس نے بے نظیر کے سیاسی سفر میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لئے بھٹو خاندان کا نام دشمنوں کے سپرد کیا تھا؟ ذوالفقار علی بھٹو کا عوام کے ساتھ امید اور محبت کا جو رشتہ تھا یہ اسی کے سپرد ہو سکتا تھا جو بھٹو کی فکر اور مشن کا امین بن سکے۔ بھٹو نے اس کے لئے بے نظیر کو چنا تھا اور بے نظیر نے اپنے باپ کی جماعت کو پہلے سے زیادہ مقبول اور منظم کر کے نہ صرف امین ہونے کا حق ادا کیا بلکہ اپنا خون بہا کر ثابت کر دیا کہ وہ قربانی کی روایات میں بھی باپ کی جانشین بیٹی ہے۔ بھٹو کی جانشینی سر کا سودا ہے۔ یہ سودا ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ بات بھٹو کو بھی معلوم تھی۔ بے نظیر کو بھی معلوم تھی اور اب آصف زرداری کو بھی معلوم ہے جس نے اپنا اکلوتا بیٹا شہیدوں کی روایات کو آگے بڑھانے کے لئے بھٹو بنا کر اپنی جماعت کے سامنے پیش کر دیا۔

غریبوں، محروموں اور مظلوموں کی سیاست موت کا کھیل ہے جو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آنا چاہے اسے بھٹو بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ لغاریوں کا بیٹا ہو، جتوئیوں کا بیٹا ہو، سیدوں کا بیٹا ہو، اربابوں کا بیٹا ہو یا زرداریوں کا بیٹا ہو۔ جو چاہے بھٹو بن سکتا ہے۔ شرط صرف ایک ہے کہ اپنے خون کا نذرانہ پیش کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو یہ رستہ کسی پر بند نہیں جو چاہے بھٹو بن جائے۔

سیاسی روایات اور حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو برصغیر کے عوام ایک خصوصی مزاج کے حامل ہیں اور اس کی جڑیں ہماری طویل تاریخ میں دور تک پہنچی ہوئی ہیں۔ بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے اور کانگریس وہاں کی سب سے بڑی پارٹی لیکن یہ پارٹی نہرو خاندان کی رسی میں بندھی ہو تو اکٹھی رہتی ہے ورنہ بکھرنے لگتی ہے۔ اندرا گاندھی کی بہو سونیا نے خاندان کے دونوں بیٹوں کی موت کے بعد کانگریس کی قیادت سے الگ رہنے کا فیصلہ کیا۔ پارٹی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر اقتدار کے کھیل سے باہر ہو گئی اور وہ سوچ پسپا ہونے لگی جو کانگریس کا ورثہ تھی۔ کانگریسی لیڈروں کو مجبور ہو کر سونیا سے پارٹی کی قیادت سنبھالنے کی درخواست کرنا پڑی اور چند روز پہلے پارٹی کے اصرار پر ہی نوجوان راہول گاندھی کو مستقبل کی قیادت کے لئے نامزد کیا گیا۔ سری لنکا میں بندرانائیکے خاندان عوام کی جمہوری خواہشات کی علامت ہے۔ بنگلہ دیش میں جمہوری نظام کا انحصار دو بیواؤں پر ہے۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں سیاسی وراثت برصغیر کی طرح منتقل نہیں ہوتی لیکن خاندان کے ایک فرد کی خدمات سے دوسرے فرد کو فائدہ ضرور پہنچتا ہے۔ موجودہ صدر بش ہوں یا آئندہ کی صدارتی امیدوار ہیلری کلنٹن دونوں ہی سیاست اور خاندان کے رشتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں بھٹو خاندان سے پہلے سرحد کے خوانین، بلوچستان کے سردار، جنوبی پنجاب کے جاگیردار اور سندھ کے وڈیرے سب وراثتی سیاست کرتے آ رہے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا حلقہ اثر محدود رہا لیکن بھٹو خاندان کے بعد قومی سطح پر دو نئے خاندان سیاست میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ ان میں ایک شریف خاندان ہے اور دوسرا چودھریوں کا خاندان، سب کی اپنی اپنی سیاست ہے، اپنی اپنی سوچ ہے لیکن پاکستان کے مخصوص حالات میں سیاست پر خاندان کی چھاپ سے کسی کو مفر نہیں۔ یہ ہمارے خطے کی ایک سماجی حقیقت ہے۔ بلاول بھٹو زرداری اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ اس نے کسی کی خاندانی جاگیر یا جائیداد پر حق نہیں جتایا وہ تو اپنے نانا اور اپنی ماں کی روایت آگے بڑھانے کے لئے نکلا ہے۔ اس کے نانا نے موت کا راستہ خود منتخب کیا تھا۔ اس کی ماں جان بوجھ کر موت کی راہ پر چلی اور وہ اپنے نوجوان ارادے اور باپ کے سہارے نانا اور ماں کی راہ پر چل نکلا ہے۔ عوام اور وطن کے لئے ہم خود تو جان دینے سے گھبراتے ہیں لیکن جو اس کا حوصلہ کرتا ہے اس پر سنگ زنی کرنے سے نہیں چوکتے۔

(روزنامہ ''جنگ'' 2 جنوری 2008ء)

وہ وقت تو نہیں آیا

جاوید چودھری

یہ 1976ء کا سن تھا اور امریکی وزیر کارجہ ہنری کسنجر پاکستان کے دورے پر تھا، وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی، امریکہ چاہتا تھا ذوالفقار علی بھٹو ایٹمی پروگرام ترک کر دیں، ہنری کسنجر امریکی صدر کا پیغام بھٹو کو پہنچانے آیا تھا، بھٹو صاحب نے بڑے سکون سے کسنجر کی بات سنی اور اس کے بعد ہنری کسنجر سے مخاطب ہوئے "آپ میرے دوست ہیں، آپ مشورہ دیجئے مجھے کیا کرنا چاہیے" ہنری کسنجر ذرا سا مسکرایا اور نرم آواز میں بولا "مسٹر پرائم منسٹر سفارت اور اقتدار کے کھیل میں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا، میں اس وقت محض ایک پیغام رساں ہوں، آپ کو اپنے کسی مشیر سے مشورہ کرنا چاہیے" بھٹو صاحب مسکرائے اور خوبصورت لہجے میں جواب دیا "میں اس کے باوجود آپ کو اپنا دوست سمجھتا ہوں چنانچہ آپ سے مشورے کی درخواست کرتا ہوں" ہنری کسنجر نے قہقہہ لگایا اور بھٹو صاحب کی طرف دیکھ کر بولا "آپ واقعی ایک شاطر انسان ہیں" بھٹو صاحب نے خاموشی سے اپنی نظریں اس پر جما دیں، ہنری کسنجر نے تھوڑی دیر توقف کیا اور اپنے لہجے میں شائستگی بھر کر بولا "میں بنیادی طور پر آپ کو مشورہ نہیں بلکہ وارننگ دینے آیا ہوں، امریکہ کو پاکستان کے ایٹمی پروگرام سے بے شمار خدشات لاحق ہیں لہٰذا آپ کے پاس میری بات ماننے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں" بھٹو صاحب نے مسکرا کر پوچھا "فرض کرو میں انکار کر دیتا ہوں تو!" ہنری کسنجر کے چہرے پر سنجیدگی آ گئی، اس نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور ایک، ایک لفظ چبا کر بولا "پھر ہم تمہیں عبرتناک مثال بنا دیں گے" بھٹو صاحب کا رنگ سرخ ہو گیا، وہ کھڑے ہوئے، انہوں نے ہنری کسنجر کی طرف ہاتھ بڑھایا اور بولے "پاکستان امریکی صدر کے بغیر بھی چل سکتا ہے، اب تم لوگوں کو اس خطے میں اپنے لئے نیا حلیف تلاش کرنا پڑے گا" بھٹو صاحب مڑے اور باہر نکل گئے۔ (روزنامہ "ایکسپریس" 15 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

شہید بے نظیر بھٹو

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

بہت کم عورتیں ہوں گی جن کے نام کے ساتھ شہید کا لفظ لگتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آنسوؤں کی بے بسی میں ڈوبتے ہوئے کیسے یہ بات لکھ رہا ہوں کہ وہ ایک خوش قسمت عورت تھی بلکہ ہے۔ مقتل کے لئے یہ اعزاز تو ہے کہ قاتل نہیں۔ مظلوم کے لئے یہ اعزاز کیا کم ہے کہ وہ ظالم نہیں۔ پاکستان میں بڑے بڑے ظلم ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں مگر یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ یہ ظلم بھٹو کے عدالتی قتل سے کم ظلم نہیں۔ یہ المناک، دردناک، شرمناک اور خطرناک ہے۔ امر ہونے کے لئے مرنا ضروری ہے۔ اس کی زندگی میں بھی مجھے پتہ تھا کہ وہ بڑی عورت ہے۔ مرنے کے بعد ان لوگوں کو بھی پتہ چل گیا ہے جو اسے نہیں مانتے تھے۔ بھٹو بھی ایک متنازعہ لیڈر تھا۔ محبوب ہونے کے لیے متنازعہ ہونا شاید ضروری ہے مگر اب اس کے دوست دشمن ایک طرح سے اس کے مداح ہیں۔ شہید بے نظیر بھٹو اپنے والد شہید ذوالفقار علی بھٹو کی سچی بیٹی تھی۔ وہ جو صرف بیٹے بیٹیاں ہوتی ہیں انہیں سمجھایا نہیں جا سکتا کہ سچی بیٹی ہونا کیا ہوتا ہے۔ اس کے لیے اب یہ کہنا کافی ہے کہ جیسے بے نظیر بھٹو، ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی تھی۔ بھٹو وزیراعظم ہوا تو بے نظیر بھٹو بھی وزیراعظم ہوئی۔ بھٹو شہید ہوا تو بھٹو کی بیٹی بھی شہید ہوئی۔ پھانسی کا پھندہ بھٹو کی گردن میں ڈالا گیا، اب بے نظیر بھٹو کی بھی گردن میں گولی لگی۔ وہ لہو جو تختہ دار پر لٹکے ہوئے بھٹو کے بدن میں جذب ہو گیا تھا، وہی لہو بے نظیر بھٹو کے بدن سے چھلک کر ایک سیل رواں کی طرح بہہ نکلا۔ یہ ہوتا ہے خون کا رشتہ۔ اس نے اپنا آخری خطاب جنے بھٹو سے آغاز کیا۔ اس کا انجام کیا نکلا۔ یہ انجام اختتام نہیں ہے۔ یہ آغاز کا ایک راز ہوتا ہے اور یہ راز ہے کہ اس ملک میں سے بھٹو کا کردار ختم نہیں کیا جا سکتا۔ بے نظیر بھٹو بھی مزید اردو بولتی تھی۔ یہ اردو بھٹو کی اردو سے ملتی جلتی بھی تھی اور مختلف بھی تھی۔ یہ نعرہ وہ لوگوں کے ساتھ مل کر لگاتی تھی۔ کل بھی بھٹو زندہ تھا، آج بھی بھٹو زندہ ہے۔ مجھے حبیب جالب یاد آتا ہے۔ ع

ہر گھر سے بھٹو نکلے گا، تم کتنے بھٹو مارو گے

میں سیاست کی طرف نہیں جانا چاہتا مگر مجھے کوئی چیز اس طرف کھینچتی ہے۔ کوئی بلا کے لایا تھا۔ بے نظیر بھٹو کو جلاوطنی کی جنت سے ہم وطنی کی ہمت کر طرف۔ وہ کیوں آئی تھی، یہ تو میں بھی چاہتا تھا کہ وہ آ جائے۔ نواز شریف کے لئے بھی میری یہی خواہش تھی۔ مگر ہمیشہ آزمائش تو خواہش ہی بنتی ہے۔ ایک ٹیلی فونک خطاب کا انتظام منور انجم نے کیا تھا پریس کلب میں، زیر اہتمام سجاد بخاری اور عبدالقدیر خاموش۔ بے نظیر بھٹو بول رہی تھیں۔ انہیں کسی نے کہہ دیا کہ اجمل نیازی بھی موجود ہے۔ انہوں نے بے ساختہ پن کے والہانہ پن سے میری پذیرائی کی۔ مجھے ان کی محبت کا یہ انداز کبھی نہیں بھولے گا۔ بھٹو اور بھٹو کی بیٹی کے لیے میرا کلمہ خیر ایک خوشبو کی طرح میرے دل میں کھو گیا۔ انہوں نے کہا کہ کوئی سوال کرو، میں نے ان سے بھی کہا کہ مجھے سوال کرنا نہیں آتا۔ ایک آرزو آپ کی جھولی میں ڈال رہا ہوں۔ آپ آ جائیے، نئے سرے سے آئیے اور نیا زمانہ لے کے

آیئے۔ یہاں کے غریب اور غیور لوگ آپ کے منتظر ہیں اور مضطرب بھی ہیں۔

اب میں روتا ہوں کہ کاش وہ نہ آتیں۔ شاید یہ وطن اس قابل ہی نہیں۔ میں کئی لوگوں کے اس اعتراض کا جواب دے چکا ہوں کہ نواز شریف یہاں سے چلے گئے تھے تو انہوں نے اچھا کیا۔ بے نظیر بھٹو کی میت کے پاس دھاڑیں مار مار کے روتے ہوئے نواز شریف کو لوگوں نے دعائیں دیں اور کہا کہ آپ بھی احتیاط کریں۔ ظالم آپ کو بھی زیادہ دیر برداشت نہیں کریں گے۔

وہ دہشت گردی کو جمہوری عمل سے ختم کرنے آئی تھی مگر دہشت گردی کا شکار ہوئی۔ یہ دہشت گرد کون ہیں؟ دہشت گردی ہے کیا؟ اس کے اسباب کیا ہیں اور اس کے مقاصد کیا ہیں؟ امریکہ میں نائن الیون کے بعد دہشت گردی کا ایک بھی واقعہ نہیں ہوا۔ ہمارے ہاں تو دہشت گردی کا سیلاب آ گیا ہے۔ یہ خون کا سیلاب ہے اور اس میں نجانے کیا کیا ڈوبتا جاتا ہے۔ بے نظیر بھٹو نے بے بی سے بی بی تک اور پھر محترمہ تک ایک سفر کیا تھا اور وہ اس منزل کی طرف ایک رہنما کی طرح چل رہی تھیں۔ بی بی بھی لیڈر کے معنوں میں آتا ہے جس میں محبت بہت ہے اور محترمہ بھی لیڈر کے معنوں میں آتا ہے جس میں عزت بہت ہے۔ محبت اور عزت ایک ہی جذبہ ہے، محبوب سے زیادہ محترم کون ہے۔ وہ لیڈر تھیں اس لئے ان کے لئے محبوب لیڈر کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ وہ عورت تھیں مگر تمام تر والہانہ پن کے باوجود ان کے لئے ''محبوبہ'' کا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا اور یہ ان کی شخصیت کے جلال و جمال کی وجہ سے تھا۔ وہ جب بھی خطاب کرتیں، تو کہتیں کہ تمہاری یہ بہن تمہارے ساتھ ہے تمہیں ڈر کس کا ہے۔ ہمارے ہاں ریت روایت کا تقاضا ہے کہ ہم بہن کا احترام ماں کی طرح کرتے ہیں۔ تو کیا بہنوں کے ساتھ یہ کچھ کیا جاتا ہے جو ہم نے اپنی عظیم بہن محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ کیا۔ مجھے لگتا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے لئے بہن کا لفظ بھی لیڈر کے ہم معنی تھا۔

مجھے یاد ہے کہ بہت پہلے جب وہ دوسری بار وزارت عظمیٰ سے ہٹائی گئیں تو وہ اسلام آباد ائرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ ان کے بچے ناہید خان کے ساتھ موجود تھے۔ وہاں کسی نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ میں اور برادرم توفیق بٹ ان کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ وہ بچوں کی بجائے سیدھی ہماری طرف آئی اور پھر ہمارا شکریہ ادا کیا۔ ابھی چند ہفتے پہلے جب وہ لاہور میں تھیں تو سینیٹر لطیف کھوسہ کے گھر میں ہم چند کالم نگاروں کو بلا بھیجا۔ کھانے کی میز پر میں ان کے بالکل سامنے تھا۔ وہ بہت ریلیکس تھیں۔ کشادہ اور شگفتہ بے ساختہ باتیں کرتی رہیں۔ کراچی کے استقبال اور بم دھماکے کی بات ہوئی تو وہ دردمندی اور دانشمندی سے بات کرتی رہیں۔ شاید میں یہ بات ان کی زندگی میں نہ کر سکتا جبکہ اس میں ایک معصوم اور پاکیزہ ارادہ ہے۔ وہ دلیر بھی تھی اور دلبر بھی تھی۔ دونوں میں ایک نقطے کا فرق ہے اور یہ نقطہ روشنی کے دائرے کی طرح اس کے اردگرد رہتا تھا۔ اس خاتون لیڈر سے بہت اختلاف لوگوں کو تھے مگر قاتل نے سب کو اس کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ زندہ تر ہو گئی۔ کوئی اور مثال نہیں کہ کسی کے لئے پورا ملک سوگ میں ہے۔ جو عزت اسے اب ملی ہے، کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ وہ بیش بہا آسائش بھری زندگی چھوڑ کے آئی۔ اس ملک کے عوام کو جمہوری منزل کی طرف لے جانے کے لئے اور اگر وہ وزیراعظم بننے بھی آئی تھی تو اسے معلوم تھا کہ اس بدنصیب ملک کا وزیراعظم ہونا کوئی اعزاز تو نہیں۔ وہ کس کے بہکاوے میں آ گئی۔ کس نے وطن بلا کے اس کے لئے سارے راستوں پر جال پھیلا دیئے۔ افغان صدر حامد کرزئی بے نظیر بھٹو سے کیوں آ کے ملا۔ امریکہ اس ملک کے سب اعلیٰ لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا۔ بے نظیر بھٹو بھی امریکہ کے لئے

پاکستانی جنگ میں شہید ہوئی۔ اسے بہت عرصہ پہلے میری موجودگی میں شاہ محمود قریشی اور فرزانہ راجہ سے ایڈیشنل ایم اے نیازی نے کہا تھا کہ بی بی وطن آئی تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

نہ بھولے گا اُسے صدیوں زمانہ
یہاں جو حادثہ کل ہو گیا ہے

(روزنامہ ''نوائے وقت'' 29 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

بھٹو کی بیٹی بھی گئی!

عرفان صدیقی

اپنے باپ کے پھانسی گھاٹ سے کوئی دو کلومیٹر دور، بھٹو کی بیٹی بھی قتل کر دی گئی۔

میں نے کچھ عرصہ قبل اس عہد کو ''عہد خوں رنگ'' کا نام دیا تھا۔ لہو پینے والا یہ عفریت آٹھ برس سے دندنا رہا ہے۔ بلوچستان سے وزیرستان تک کی وادیاں اور گھاٹیاں قتل گاہیں بنا دی گئیں۔ کبھی کسی خفیہ مقام سے آنے والا میزائل نیک محمد نامی خونریز دہشت گرد کے پرخچے اڑا گیا۔ کبھی نواب اکبر بگٹی کسی پہاڑ کی کھوہ میں پراسرار دھماکے کی نذر ہو گیا۔ کبھی ڈمہ ڈولہ کی مٹی گارے والی بستی کے بوریا نشین، خاک و خون میں نہلا دیئے گئے۔ کبھی باجوڑ مدرسے کے، تہجد کے نماز میں مصروف طلبہ کے چیتھڑے اڑ گئے، کبھی لال مسجد کے در و دیوار لہو میں رنگ دیئے گئے، کبھی جامعہ حفصہ کی عفت مآب بیٹیاں فاسفورس کی بھٹیوں میں بھسم کر دی گئیں۔

بے نظیر بھٹو کا قتل اس عہد خوں رنگ کا وہ المیہ ہے جس نے ہر پاکستانی کا دل چھلنی کر دیا ہے۔ ہر محب وطن کو خون کے آنسو رلا دیا ہے۔ یہ کس نے کیا؟ قاتل کون ہے؟ کس نے گولیوں کی بوچھاڑ کی؟ کس نے خودکش حملہ کیا؟ شاید اس کا سراغ کبھی نہ لگایا جا سکے لیکن قاتل صرف ایک ہے۔ وہ عہد خوں رنگ، جس نے پورے ملک کو قتل گاہ بنا کے رکھ دیا ہے۔ جس نے آئین اور جمہوریت ہی کو نہیں، تمام اخلاقیات و اقدار کو بھی پامال کر دیا ہے۔ جس نے سارے ملک کو درندوں کی چراگاہ بنا کے رکھ دیا ہے، جس نے خونخواری اور درندگی کو بھی ''عوامی طاقت کے مظاہرے'' کا نام دے دیا ہے، جس نے طاقت کی زبان کو رواج دیا، جس نے طاقت کو آئین و قانون سے بالاتر بنا دیا، جس نے طاقت کو بالاتر اصول حکمرانی کی شکل دے دی، جس نے طاقت کے زور پر آئین و جمہوریت کو قتل کیا۔ طاقت کے زور پر ہی عدلیہ کا سر قلم کیا۔ طاقت کے زور پر ہی اپنے جواز کا عدالتی فتویٰ لیا۔ طاقت کے زور پر ہی اپنے حریفوں کو کچلا اور طاقت ہی کے زور پر اپنی بادشاہت کا سکہ جمایا۔

بھٹو پھانسی چڑھ گیا۔

شاہنواز بھٹو قتل ہو گیا۔

مرتضیٰ بھٹو کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔

اور بھٹو کے لہو کی ایک اور نشانی بے نظیر کو بھی نابود کر دیا گیا۔

یہ اس دن ہوا جب نواز شریف کے استقبالی جلوس پر ایک گھر سے براہ راست فائرنگ کر کے نصف درجن سے زائد کارکنوں کو قتل کر دیا گیا۔ سارا میڈیا دیکھ رہا تھا کہ گولیاں برسانے والے کہاں سے آئے؟ کون تھے؟ انہوں نے براہ راست نشانہ لے کر گولیاں چلائیں۔ پنجاب پولیس

کھڑی تماشا دیکھتی رہی اس لئے کہ گولیاں برسانے والے "ق" کے تعلق دار تھے اور گولیوں کا نشانہ بننے والے نواز شریف کے ہمنوا۔ تب نواز شریف کا کارواں وہاں پہنچنے ہی والا تھا۔ کچھ بعید نہ تھا کہ قاتل اسی دھڑلے کے ساتھ نواز شریف کو بھی نشانہ بناتے اور پولیس تماشا کرتی رہتی۔

لگ بھگ ایک عشرہ پاکستان سے باہر گزارنے کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو 18 اکتوبر کو اپنے وطن پہنچیں تو بھی ان کا جلوس خوں آشام دھماکے کا نشانہ بنا۔ دو سو کے لگ بھگ افراد جاں بحق ہو گئے۔ تب بھٹو کی بیٹی بچ گئی لیکن شاید "دست قاتل" اس کے تعاقب میں رہا۔ بے نظیر بھٹو نے تحفظ کے کئی سامان کئے۔ بلٹ پروف گاڑیوں کا اہتمام کیا۔ سیکورٹی کے حصار قائم کئے لیکن قاتل مافیا کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ سالہا سال بعد وطن واپس آنے والی بے نظیر صرف دو ماہ نو دن زندہ رہنے دی گئی۔

27 دسمبر کا دن، ایک ناسور کی طرح پاکستان کے جسد سیاست میں زہر بوتا رہے گا۔ ابھی تک قوم بھٹو کی پھانسی کے المیے سے نہیں سنبھل سکی تھی۔ تازہ سانحے نے تقسیم کی ایسی لکیر ڈالی ہے کہ سندھ آنے والے کئی سالوں تک لہو روتا رہے گا۔ ایک بات طے نظر آتی ہے کہ مشرف بندوبست، آزادانہ، منصفانہ اور شفاف انتخابات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مسلم لیگ (ق) آمریت کی گود میں پلنے والا ایسا عفریت بن چکی ہے جو عوامی تائید سے کلیتاً محروم ہے لیکن جسے نہ صرف مشرف بلکہ تمام ایجنسیوں کی سرپرستی حاصل ہے اور جس نے تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ ایک بار پھر اقتدار پر قبضہ جما کے دم لے گی۔ کوئی بتائے کہ جب 2002ء کے انتخابات میں سب سے زیادہ ووٹ لینے والی پارٹی کی سربراہ دو بار ملک کی وزیر اعظم رہنے والی خاتون اور پاکستان کی مقبول رہنما کو اس بیدردی کے ساتھ قتل کر دیا جائے اور تمام بین الاقوامی سروے رپورٹس کے تحت پاکستان کے مقبول ترین رہنما نواز شریف کے جلوس پر وحشیانہ فائرنگ کر کے کئی کارکنوں کو قتل کر دیا جائے تو کون سے انتخابات؟ کس طرح کی عوامی رائے؟ کیسا پرامن انتقال اقتدار؟ چنگل گاڑے ہوا مافیا طے کر چکا ہے کہ کسی بے نظیر، کسی نواز شریف کو سر نہیں اٹھانے دیا جائے گا۔ عوام کی ترجمانی کرنے والے کسی رہنما کو عوام کی نمائندگی نہیں کرنے دی جائے گی۔ یہاں وہی زندہ رہیں گے، وہی جلسے جلوس کریں گے، وہی وزیر اعلیٰ اور وہی وزیر اعظم بنیں گے، جو ملک پر قابض مافیا کے ہاتھ پر بیعت کہہ چکے ہیں۔ جو باوردی جرنیل کو دس دس بار منتخب کرنے کا اعلان کریں گے اور جو اونچے ایوانوں کی چاکری کو اپنے لئے سرمایہ اعزاز سمجھتے ہیں۔

بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد انکی پارٹی کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا وہ ان حالات میں بھی الیکشن لڑے گی؟ میرے خیال میں ایسا سوچنا بھی پرلے درجے کی خود فریبی ہوگی۔ بے نظیر کو منظر سے ہٹا دینے کے بعد "مافیا" پیپلز پارٹی کو لقمہ تر کی طرح ہڑپ کر جائے گا۔ کم از کم اب جنوری 2008ء کے انتخابات، پیپلز پارٹی کے لئے نہیں ہیں۔ نواز شریف مسلسل کہتے رہے ہیں کہ اگر بے نظیر بھٹو انتخابات کا بائیکاٹ کر دیں تو ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر وہ بھی بائیکاٹ کر دیں گے۔ اگر پی پی پی اور مسلم لیگ (ن) دونوں انتخابات سے باہر ہو جاتی ہیں تو مقامی اور بین الاقوامی طور پر انتخابات کی کوئی ساکھ نہیں رہے گی۔ مولانا فضل الرحمٰن کو بھی اب اپنی خودسری سے باز آ جانا چاہیے۔ اے این پی بھی یہیں رک جائے۔ انتخابات اب بے معنی ہو کے رہ گئے ہیں۔ تمام جماعتوں کو فوری طور پر اک جگہ جمع ہو کر کوئی بڑا فیصلہ کرنا چاہیے۔ اگر اب مسلم لیگ (ق) اور ایم کیو ایم کو اپنے حال پر چھوڑ کر ساری جماعتیں یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ صدر پرویز مشرف کی موجودگی میں انتخابات میں حصہ نہیں لیا جائے تو منظر بدلنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

فوج کی حکمرانی، جب بھی آئی، قوم کو عذاب اور اضطراب دے گئی۔ پرویز مشرف کچھ بھی کہتے رہیں، ان کا آٹھ سالہ عہد پاکستان کے وقار، پاکستان کی سلامتی، پاکستان کی یکجہتی اور پاکستان کے استحکام کو پارہ پارہ کر چکا ہے۔ انہوں نے صرف امریکی مقاصد کی آبیاری کی اور اپنے ذاتی اقتدار کو توانا بنایا۔ یہاں تک کہ انہوں نے 12 مئی 2007ء کو اپنے حامیوں کی طرف سے معصوم افراد کے بہیمانہ قتل کو بھی ''عوامی قوت کا مظاہرہ'' قرار دیا اور یوں اس تشدد کو تھپکی دی۔ اب حل ایک ہی ہے کہ موجودہ غیر جمہوری اور نام کا حکومتی ڈھانچہ رخصت ہو۔ چیئرمین سینٹ آئین کے مطابق صدارتی منصب سنبھال کر اتفاق رائے کی حکومت قائم کریں اور پھر ایک نئے سفر کا آغاز کیا جائے۔

آج، کسی وقت بھٹو کی بیٹی، گڑھی خدا بخش میں اپنے باپ کے پہلو دفن کر دی جائے گی۔ ایک بار پھر ثابت ہو گیا کہ یہ ملک عوام کے مقبول و محبوب رہنماؤں کے لئے نہیں، وردی اور بوٹوں کے پجاریوں کے لئے بنا ہے۔ کیا ہماری آنکھیں کبھی وہ دن بھی دیکھیں گی کہ جب ملک کے وجود کو چاٹنے والا یہ مافیا بھی کسی گہری قبر میں دفن ہو جائے گا؟

(روزنامہ ''نوائے وقت'' 28 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

الوداع گلاب پوش بی بی۔الوداع

کشور ناہید

وہ گہرا اور کھلتا ہوا سبز رنگ اور رائل بلیو کو بہت پسند کرتی تھی۔ جب اس نے سب سے کم عمری میں پاکستان کی وزیراعظم کی حیثیت سے حلف لیا تو اس وقت بھی اس نے پسندیدہ رنگ پہنا ہوا تھا۔ دوسری دفعہ جب وزیراعظم بنی تو بھی اپنے پسند کے رنگ میں ملبوس تھی۔ اسے گلاب کی خوشبو پسند تھی۔ داتا صاحب جانا اسے پسند تھا، جب اس کو کسی شداد نے گولیاں ماریں اس وقت بھی وہ سبز پوش تھی گلے میں گلاب کے پھولوں کا ہار تھا بازو پر ہر موقع پر سینکڑوں لوگ اس کو امام ضامن باندھتے تھے۔ اس کے سر سے دوپٹہ ڈھلک جاتا تو احتیاط سے پھر سر پہ ڈھک لیتی تھی بہت لوگ کہتے تھے بی بی بڑے بدشکل رنگ اور کپڑے پہنتی ہے مگر وہ تو طبیعتاً قلندر تھی۔ مجھے یاد ہے جب مسز کلنٹن آئی تھیں۔ تب بھی اس نے نیلے رنگ کی قمیض، سفید دوپٹہ اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھی۔ جب موت نے اس کے دروازے پر دستک دی اس وقت بھی وہ سفید دوپٹہ، سفید شلوار اور ہرے رنگ کی چولے میں جمہوریت کی دیوانی، خوش تھی، ہنس رہی تھی یونہی ہنستے قہر آلود ہاتھوں نے اس کی شہ رگ میں ایسے دو گولیاں ماریں کہ وہی ہنسی، مرتے وقت بھی اس کے چہرے پر مرتسم تھی۔ جب وہ پہلی دفعہ وزیراعظم بنی اور اس سے دو سال پہلے جگہ جگہ جلسہ کرتی پھری۔ اس کے سر پہ دوپٹے کو پورے یورپ نے نئے اور خوبصورت فیشن کے طور پر قبول کیا۔ میں اس سال وینس میں تھی ہم بہت سے سیاح کشتی میں سیر کے لئے جا رہے تھے میرا دوپٹہ دیکھ کر سب نے پوچھا تم کس ملک سے ہو۔ جب میں نے بتایا کہ ''میں پاکستان سے ہوں، بے نظیر کے ملک سے ہوں۔'' ساری عورتوں نے آگے بڑھ کر میرے دوپٹے کو بے نظیر کے دوپٹہ اوڑھنے کے انداز میں اوڑھایا۔ پھر باقی عورتوں نے مغلر کی شکل کے دوپٹوں کو میرے ساتھ اپنے سروں پر لیا۔ یہ تھی مقبولیت عورت کی جس کو متشددانہ طریقے پر کسی شقی القلب نے دو گولیاں شہ رگ پہ اور ایک گولی ماتھے پہ یہ یقین کرنے کے لئے ماریں کہ وہ جری خاتون بچ نہ جائے۔

جب وہ پہلی دفعہ وزیراعظم بنی تو چونکہ بہت کم عمر تھی۔ اس لئے اس کو مشورہ دینے والے، کبھی بتاتے تھے کہ اس سوٹ کے ساتھ یہ عینک پہنیں، اس سوٹ کے ساتھ یہ بیگ لیں، اس شام یہ لہنگا پہنیں اور اس شام غرارہ پہنیں۔ کبھی کبھی غیر ملکی عشائیہ میں اس نے لہنگا پہنا بھی تو بھی وہی سبز رنگ اس کا لباس تھا۔ جب وہ پہلی دفعہ وزیراعظم بنی تو چند مصری اور دیگر مفتیوں نے فتویٰ دیا کہ عورت وزیراعظم نہیں ہو سکتی ہے۔ کچھ نے یہ بھی شوشہ چھوڑا کہ عورت کو سلامی دینا مردانگی کے خلاف ہے، اس زمانے میں فاطمہ وینسی نے قرآن اور خلفاء کے حوالے سے ثابت کیا کہ خاتون، پہلے بھی سربراہ مملکت رہی ہے اور بے نظیر کا وزیراعظم ہونا بالکل قانون اور اسلامی فقہ کے مطابق ہے۔ آج سے پندرہ برس پہلے اس خاتون کو علم تھا کہ ہر روز اس کو دھمکیاں ملتی تھیں کہ تم ماردی جاؤ گی وہ خاتون پھر بلٹ پروف واسکٹ پہننے لگی تھیں وہ جیکٹ، اکثر قمیض کے ہم رنگ ہوتی تھی، پر شلوار اور

دوپٹہ وہی سفید ہوتے تھے کیا خبر تھی کہ یہی سفید رنگ اس کا آخری ملبوس بنے گا۔ اس پر ہر لباس پھبتا تھا مجھے یاد ہے جب وہ شملہ معاہدے کے لئے بھٹو صاحب کے ساتھ گئی تھیں اس دن شاید پہلی مرتبہ ساڑھی پہنی تھی۔ سلیولیس بلاؤز، کٹے ہوئے بکھرے بال ایسے جیسے نوجوان لڑکی کے ہو سکتے ہیں۔ معصوم مسکراہٹ اور باپ کی پسندیدہ بیٹی، ہر جگہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

باپ کو یہ بیٹی اتنی پسند تھی کہ آخری ملاقات کے دوران پنڈی کوٹھری میں باپ اور بیٹی پلنگ پر لیٹے، کانوں میں باتیں، کئی گھنٹے تک کرتے رہے تھے۔ وہ ساری باپ کی ہدایتیں، اس خاتون نے اپنا زیور بنالی تھیں۔ لہجہ میں اس قدر شفاف، اور بیان میں اس قدر واضح کہ سننے والے کو قائل کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جب وہ پہلی مرتبہ وزیراعظم بنی تو سارے سینئر پارٹی رہنماؤں کو اس نے انکل تو کہا مگر جب انہوں نے اسے بچہ سمجھ کر اپنے مشوروں سے نوازنا شروع کیا تو وہ سمجھ گئی کہ اب تو اپنی ہی عقل پر اعتماد کرنا پڑے گا۔ اس کے اعتماد نے، اس کے اپنے ہی بنائے ہوئے صدر کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ اس کو بی بی کا یہ رنگ اچھا نہیں لگا آخر اس نے بے وفائی اس ڈھٹائی کے ساتھ کی کہ بی بی کی حکومت کو ہی برطرف کر دیا۔ ہم لوگ جو بھٹو صاحب کے چاہنے والے تھے، وہ بھٹو صاحب کی بیٹی کے ہاتھ میں تسبیح دیکھ کر، جز بز ہوتے تھے۔ جب وہ مزاروں پر حاضری دینے جاتی، صدق دل سے دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتی تھی۔ ہم جیسے لبرل لوگ، اس سے ناراض ہو جاتے، مگر وہ یہ سب کچھ مصنوعی طریقے پر نہیں کرتی تھی۔ اس کے اندر کوئی پیر طریقت بیٹھا تھا وہ اچھی بھلی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی موت نے اس کے کان میں کہا ارے کھڑی ہو، ونڈو کھولو اور کھڑی ہو کر، استقبال کرو میرا۔ وہ جو روحانیت میں لپٹی تسبیح پکڑے کھڑی ہوئی تو موت نے دو گولیوں کی شکل میں اس کی شہ رگ کو اور ایک گولی کی شکل میں اس کے دماغ کو کھا گئی جس کی تعریف میں سکیورٹی کونسل کی تاریخ میں پہلی مرتبہ تعزیتی ریفرنس ہوا۔ سی این این اور بی بی سی نے پورے چوبیس گھنٹے مسلسل پروگرام اس بی بی کے لئے نشر کرتے رہے جو دنیا بھر میں بہت بڑا دماغ تھیں اس کو یاسر عرفات بھی پیار کرتے تھے۔ النیہان نے وہ محبت دی کہ جسے پناہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔ بی بی کو ہر دوسرے مہینے لیکچر دینے کے لئے امریکہ، یورپ اور برطانیہ میں بلایا جاتا تھا اب ہے ہمارے پاس کوئی ایسا، جس کو یوں بلایا جائے جس پر ہم فخر کر سکیں۔

مگر اسلامی ممالک کو عورت کی لیڈری پسند ہی نہیں ہے یہ ساری خلیجی ممالک اس کو برداشت کرتے تھے۔ یہ ممالک محترمہ فاطمہ جناح رحمۃ اللہ علیہ کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ فاطمہ جناح رحمۃ اللہ علیہ بہت پراسرار طریقے سے مار دیا گیا تھا اب یہی حال کرنا تھا۔ بی بی کا۔ بھٹو صاحب نے تو لکھا دیا تھا: "if I am assasinated" بی بی نے بھی آنے سے پہلے بتا دیا تھا کہ اس کو مارنے کے منصوبے ہیں۔ اس نے تو نام بھی دے دیئے تھے کہ مروانے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ کوئی ہے جو ان کا نام لے، کوئی ہے جو اس المیے کی ذمہ داری لے۔ محرم سے پہلے ہی عزاداری کا ماحول دے کر جانے والی، پلٹ کے تو دیکھ، جیسا تیرے باپ کا ماتم گھر گھر تھا، لوگ ایک دوسرے سے رو کر تعزیت کر رہے تھے، تو نے بھی باپ کی طرح ہماری قوم کو بے بس، بن لیڈر، یتیم چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں گلاب پسند تھے۔ اب ہمیشہ تمہاری لحد پر گلاب کھلا کریں گے۔

(روزنامہ "جنگ" 29 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

شہید کو گلاب پسند ہیں، آؤ باغ کی حفاظت کریں!

ڈاکٹر عامر لیاقت حسین

اے دختر مشرق کے چاہنے والو! دیکھو کہ اسے موت نہیں آئی کیونکہ شہید کبھی مرا نہیں کرتے۔ وہ ہمارے درمیان ہی موجود ہے، مگر ہمیں اس کے ہونے کا شعور نہیں۔ انتہا پسندوں نے تو بہت چاہا کہ اس کی آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے مگر وہ بے نظیر تھی اسی لئے کروڑوں لبجوں میں سما گئی...... اب ایک بے نظیر نہیں، ان گنت، لاتعداد اور نہ ختم ہونے والی بے نظیر ہر اگتے سورج کے ساتھ انتہا پسندوں کی ناکامی کے شب و روز کی گواہی دے گی...... ! ہم جانتے ہیں کہ جسم کی موت، کوئی موت نہیں ہوتی، راہ حق کو روشن رکھتے چراغ کبھی بجھا نہیں کرتے پھر یہ اندھیرے کیوں؟ وہ تو چاہتی تھی کہ پاکستان اجالوں کی سرزمین بن جائے، نفرت اور عدم برداشت کے کانٹے صاف کرتے کرتے وہ کچھ دیر کے لئے اوجھل ہی تو ہوئی ہے، پھر یہ شور کیسا؟ وہ کون ہیں جو تمہارے غم کی آڑ میں بے نظیر کے پاکستان کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر بے نظیر کی روح تڑپ رہی ہے اس نے اپنے وطن کے زخموں پر تو اس وقت بھی مرہم رکھا جب اس کے باپ کو پھانسی دیکر شہید کر دیا گیا...... ! شاہنواز اور مرتضٰی جیسے ویروں کی شہادت پر بھی ہماری بے نظیر نے صبر کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ہم اتنی جلدی اس کا پیغام بھول گئے، اس کے آخری الفاظ ''میرے پاکستان کو شدید خطرات لاحق ہیں'' کیا ہم سے احساس ذمہ داری کا تقاضا نہیں کر رہے...... ! غم کا پہاڑ تو عاشقان بھٹو پر ٹوٹا ہے لہٰذا بھٹو کے چاہنے والے بھٹو کے پاکستان پر قیامت توڑنے والوں کو معاف نہیں کر سکتے! وہ کہتی تھی کہ مجھے گلاب کی خوشبو بہت پسند ہے، اچھی لگتی ہے، آج پاپا کی پنکی، پاپا کے پاس گلابوں کی خوشبو میں رچ بس کر مِلنے گئی ہے تم سے یہ وعدہ لے کر کہ تم اس کے لئے اس کے گلابوں کے چمن کی ہمیشہ حفاظت کرو گے! اگر گلاب یونہی جلتے رہے تو وہ پاپا کے پاس سکون سے کیسے رہے گی، اسے داتا دربار اور سہون شریف پر حاضری سے روحانی سکون ملتا تھا، وہ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اور شہباز قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی دیوانی تھی، ان کے پیغام امن و محبت کی داعی تھی اسی لئے'' بے قاعدہ لوگوں'' کو اس کا یہ انداز ایک آنکھ نہ بھاتا تھا تو آج بھی ایسوں کو اس کی جسمانی موت کا فائدہ نہ اٹھانے دو۔ آگ لگانے والے تو مسلسل آگ لگا رہے ہیں، احتجاج کے نام پر وطن کے سینے میں گولیوں کی فصل بو رہے ہیں۔ بلاول، بختاور اور آصفہ کے پاکستان کی گلیاں بے گناہوں کے لہو سے دھو رہے ہیں تو کیا ان کی ماں تڑپتی نہ ہوگی...... ! تم سب کو داتا دربار اور سہون والے فقیر کا واسطہ! خاکم بدہن اگر پاکستان نہ رہا تو بھٹو کے نام لیوا کہاں جائیں گے؟ ہماری بی بی پہلے ہی سے بہت دکھی تھی اب پاپا کی پنکی کو اور دکھ نہ دو، ساری عمر تکلیفیں سہیں، شوہر اور بچوں سے دوری کا کرب برداشت کیا، بھائیوں کی نعشوں پر خون کے آنسو بہائے، باپ کی موت کا صدمہ سینے میں شیر کا جگر رکھ کر سہا' اب اس کے ملک کو برباد کر کے اس کی روح کو تکلیف نہ دو...... ! املاک کی تباہی اس کی تباہی ہے، کسی غریب کی موٹر سائیکل کا غصے کی آگ میں بھسم ہو جانا اس کے افکار کو جلا رہا ہے۔ خدارا ہوش میں آؤ اور بے نظیر کے پاکستان کو بچاؤ...... ! تمہیں یاد ہے نا کہ وہ نفرت کو ابدی نیند سلانے کے لئے ہمیشہ جاگتی رہتی تھی، سو وہ آج بھی جاگ رہی ہے، اس کے نظریے کے سفر میں کبھی رات نہیں آئی اور وہ چاہتی ہے کہ ہم

بھی جاگتے رہیں ان کو سلانے کے لئے جنہیں خوشیوں سے دمکتا ہمارا چہرہ کھٹکتا ہے۔ یہ قاتل پھر آزاد ہو گئے ہیں تمہیں اور مجھے زندگی سے آزاد کرنے کے لئے۔ ارض پاک کو دوبارہ خون سے نہلانے کی سازش کی جا رہی ہے، اپنی سماعتوں کو مجتمع کر کے شہید کی پکار سنو! اپنے دل کی فریاد پر کان دھرو! مرنے والا اپنے سینے کی خرخراہٹ نہیں سنتا لیکن اس کے بستر کے قریب بیٹھنے والے ضرور سنتے ہیں۔ ذبح شدہ پرندہ اضطراری طور پر پھڑ پھڑاتا ہے اور نہیں جانتا کہ پھڑ پھڑا رہا ہے لیکن دیکھنے والے جانتے ہیں۔ آج ہم سب دیکھ رہے ہیں 18 اکتوبر سے! ...... نہیں! ...... اس سے بھی پہلے سے نعشوں کو گرتا ہوا، انسانیت کو مرتا ہوا، دن کی وہ کون سی گھڑی ہے جس میں ہماری روحیں درد سے بے چین ہو کر آہیں نہیں بھرتیں، سال کا وہ کون سا دن ہے جس میں ہمارے دل پیاروں کی یاد میں نالہ و ماتم نہیں کرتے، سب جانتے ہیں کہ ہم یاس اور ناامیدی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہیں بلکہ یوں لکھوں تو زیادہ مناسب ہوگا کہ ظلم کرنے والوں کی شیطنیت کے گھیرے میں ہیں، آج زندگی کی وہ کون سی شے ہے کہ جس کی طرف ہم اشارہ کر کے یہ کہہ سکیں کہ "یہ ہماری ہے" اب تو اپنی زندگی کے بارے میں بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ "یہ ہماری ہے" بہادروں کی طرح جینے والی شیرنی کی طرح ایک ہی جست میں یوں اوجھل ہو جائے گی شاید کسی نے نہ سوچا تھا مگر اب یہ تو سوچو کہ جذبات کے جھونپڑوں میں ہم دردی کے شگافوں سے داخل ہونے والا یہ سیلاب کہاں سے آ رہا ہے جو بے نظیر کے بسائے ہوئے گھروں کو بہا لے جانے کے لئے بپھرا جا رہا ہے۔ اس دیس میں شام بوکھلائی اور بے گناہوں کے لہو میں نہائی ہوئی آتی ہے، دانے دنکے کی کھوج میں اپنے آشیانوں سے روز صبح نکلنے والے جانے شام کو گھر پہنچ سکیں گے یا نہیں بس ایک یہی دھڑکا سا لگا رہتا ہے جیسے جیسے رات تاریک ہو جاتی ہے فائرنگ کی آواز اور تیز ہو جاتی ہے۔ گلیوں میں کھمبے بجنے لگتے ہیں اور معصوم بچے سہم کر اپنی ماؤں کے پیچھے چھپنے لگتے ہیں۔ پھر گھر کے کسی کونے سے آواز آتی ہے "بیٹا اندر ہی رہنا! باہر نہ جانا، باہر گولیاں چل رہی ہیں" اور اس کے کچھ دیر بعد بارود اور لہو کی بو میں بین کرتی جوان بہنوں کی چیخ و پکار، کہنے تو چتی سہاگنوں کا ماتم اور عالم سکوت میں خلا کو گھورتی ماؤں کے سوا فلک کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے بعد دیر تلک سکتہ اور حفاظت کا نیا دستہ "خبر" بن کر تعزیت کے لئے آنے والوں کا بہانہ بن جاتا ہے۔ اب یہاں تمدن کی مہک ہے اور نہ معاشرتی تہذیب ہر چیز بے ترتیب ہو چکی ہے، ماضی سے رابطے کا کوئی تصور نہیں اور مستقبل کی کسی کو فکر نہیں۔ بے نظیر اسی فضا کا خاتمہ چاہتی ہے، وہ تمہارے چہروں پر خوف نہیں، لبوں پر مسکراہٹ دیکھنے کی متمنی ہے، سنسناتی ہوئی گولیوں اور دہشت گردوں کی ٹولیوں کے سامنے وہ ایک ڈٹا ہوا پہاڑ ہے، تو کسی دہشت گرد کو اجازت نہ دو کہ وہ اس نظریاتی پہاڑ پر اپنی شکست خوردہ اور جھنجلاتی ہوئی ضرب بھی لگائے ......! اسے "دھمکی" سمجھو گے تو دہشت گردوں سے ہار جاؤ گے وہ "بے" "تم جیت جاؤ گے دعا کے لئے اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ بارگاہ ایزدی میں ملتجی ہیں کہ "اے اللہ پاکستان کی حفاظت فرما" ......! یہ اس کی اکیلی نہیں ہم سب کی طرف سے دعا ہے، آیئے کہ اس کے ہاتھوں کے ساتھ ہم بھی اپنے ہاتھ اٹھا دیں اور جس کسی کے ہاتھ میں بھی ہتھیار ہیں، اسے بے نظیر کی خاطر ہمیشہ کیلئے گرا دیں، اسے انتہا پسندی تو نہ کھا سکی ...... البتہ بے نظیر نے انتہا پسندی کو شکست ضرور دی!!!

(روزنامہ "جنگ" 30 دسمبر 2007ء)

♥ ...... ♥ ...... ♥

بی بی ہم شرمندہ ہیں

اصغر ندیم سید

دنیا کے ہر ملک کے ہر شہر میں بے نظیر بھٹو شہید کے لئے بچوں، بڑوں اور بوڑھوں نے شمعیں جلائی ہیں، پھولوں کے ڈھیر تصویروں کے سامنے پیش کئے ہیں، ممبئی کے ایک آرٹسٹ نے سمندر کی ریت پر محترمہ کا پورٹریٹ بنایا ہے۔ پوری دنیا کے اخبارات کی شہ سرخیاں محترمہ کی شہادت کی خبر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ تمام چینل محترمہ کی زندگی کے سفر کی مختصر کہانی بیان کر رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میری نسل کی جوانی ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت کے سائے میں گزری ہے۔ اب باقی کی زندگی بے نظیر بھٹو کی شہادت میں بھیگے پاکستان میں گزرے گی۔ پاکستان کی سیاست بھٹو خاندان سے شدید محبت اور شدید نفرت میں تقسیم چلی آئی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ جنہوں نے اپنی سیاست کی بنیاد بھٹو خاندان سے نفرت پہ استوار کر رکھی ہے اب ان کا کیا ہوگا؟ اب وہ کس نعرے پر الیکشن میں اتریں گے۔ اس لئے کہ محترمہ کی شہادت نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں پورے پاکستان کی لیڈر تھیں اور پورے پاکستان کے غریب لوگوں کے دلوں میں بستی تھیں۔ کوئی ایسا لیڈر اب موجود نہیں ہے۔ عوام سے محبت کے رشتے کا دوپٹہ اوڑھے کتنے دکھوں کو چھپائے بے باکی سے مسائل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھیں۔ اگر ان دکھوں کا حساب کیا جائے تو ایک ایک دکھ ایک ایک پہاڑ کے برابر ہے۔ لڑکپن اور جوانی کی دہلیز پر باپ کی خون سے لتھڑی لاش کو وصول کیا۔ اٹھارہ مہینے قید تنہائی میں باپ کے ساتھ ہونے والے ظلم کو برداشت کیا۔ باپ سے آخری ملاقات کا حوصلا اپنے اندر جمع کیا اور پھر دنیا کی تمام خواتین کے لئے رول ماڈل بننے کا سفر طے کیا۔ پاکستان کی روایتی سیاست جو ایجنسیوں اور اسٹیبلشمنٹ کی ڈوری میں بندھی تھی اس میں کیسے کیسے ہتھکنڈوں میں الجھ کر اپنے لئے راستہ بنانے میں لگی رہیں۔ آج بھی آخری دم تک آخری تقریر میں سیاست کو اسٹیبلشمنٹ کے تسلط سے آزاد کرنے کے لئے جدوجہد کی بات کرتے ہوئے شہادت قبول کر لی۔ پاکستان سے جلاوطنی کے دو تجربوں کے بعد دو مرتبہ واپس آئیں۔ ضیاء الحق کے دور میں لاہور اتریں تو ائیر پورٹ سے مینار پاکستان تک سر ہی سر دکھائی دیتے تھے اور کراچی اتریں تو ویسا ہی منظر تھا۔ اگرچہ کراچی ایم کیو ایم کا مرکز ہے لیکن کراچی کے باسی بے نظیر بھٹو کے لئے اس لئے والہانہ جذبہ رکھتے تھے کہ وہ غریبوں، بیروزگاروں اور محروم طبقات کی بات کرتی تھیں۔ اس وقت سے آخری لمحے تک وہ عجلت میں دکھائی دیں۔ شہادت سے تین دن پہلے محکمہ داخلہ نے بیان بھی جاری کیا کہ آنے والے دو تین دنوں میں بڑی شخصیات کو خطرہ ہے۔ بڑی شخصیات میں بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف ہی ایسے رہنما تھے جو عوام میں کھلے بندوں گھوم رہے تھے۔ وہ کہہ چکی تھیں کہ پاکستان آئیں گی تو شاید وہ زندہ نہ بچ سکیں۔ آنے سے پہلے انہوں نے روزنامہ جنگ میں ایک مضمون میں لکھا کہ میری خواہش تھی کہ بچوں کو ساتھ لے کر اپنے میاں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کا پروگرام بناؤں۔ ایک عام شہری کی طرح آزادی سے کسی ساحل کے کنارے کسی خاموش شہر میں اپنی پسند کی کتابیں خریدوں۔ زندگی کے کچھ اور

ذائقے محسوس کروں۔ لیکن مجھے پاکستان آنا ہے کہ اب پارٹی کو اور لوگوں کو میری ضرورت ہے۔ اس مضمون میں بے نظیر کے اندر کی ماں، بیوی اور خاتون جذبوں میں ہمکتی ہوئی کچھ دیر کے لئے باہر آ گئی۔ لیکن پھر واپس اپنے رول کے اندر چلی گئیں۔ اپنے شہید باپ سے آخری ملاقات میں جو ڈیوٹی اپنے ذمہ لے کر آئیں اس نے سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والی دھان پان لڑکی کو مسلسل اضطراب اور بے چینی کی زندگی میں مبتلا رکھا۔ دنیا کی پہلے نمبر کی یونیورسٹی ہارورڈ یونیورسٹی اور چوتھے نمبر پر آنے والی آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم پانے کے بعد جب پاکستان آئیں تو بھٹو صاحب کی حکومت تھی۔ فیض احمد فیض صاحب ملک میں تہذیب وثقافت اور فنون لطیفہ کے اداروں کی بنیادیں استوار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسے میں پی ٹی وی پر تہذیبی مسائل پر لیکچرز اور گفتگو کے پروگرام میں بے نظیر بھٹو شہید نے شرکت بھی کی اور اپنے انٹلیکچوئل کیریئر کے آغاز کا عندیہ بھی دیا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر شپ کی آفر کو قبول کر لیں۔ بعد میں انہوں نے امریکہ کی یونیورسٹیوں میں باقاعدہ لیکچر بھی دیئے اور چاہتی تھیں کہ اس حیثیت کو جاری رکھیں۔ پاکستانی سیاست ہر مارشل لا میں کوئی نہ کوئی نئی شکل اختیار کرتی رہی ہے جو سیاست دانوں کی کردار کشی کے لئے نئے سے نئے الفاظ گڑھتی رہی ہے۔ مختلف قسم کے مافیا غیر جمہوری ادوار میں اپنا رستہ بناتے رہے ہیں اور ان کی کوشش یہی رہی ہے کہ پاکستان میں سیاستدانوں کو عوام میں جڑیں بنانے کا موقع نہ مل سکے۔ بے نظیر بھٹو ان سازشوں کا پہلے دن ہی سے شکار ہوئیں مگر ان کی بہادری دیکھیں کہ وہ کیچڑ اور دلدل میں سنبھل کر چلتی رہیں۔ وہ چاہتیں تو آسودہ زندگی گزارنے کے سینکڑوں راستے ان کے پاس موجود تھے۔ وہ بین الاقوامی سطح کی سیاسی تجزیہ نگار تھیں۔ وہ عالمی سیاست پر ایک رائٹر کی حیثیت سے نام اور دولت کما سکتی تھیں۔ وہ چاہتیں تو ساری زندگی بچوں کے ساتھ ایک محفوظ اور آرام دہ زندگی کسی بھی جدید ملک کے جدید شہر میں گزار سکتی تھیں لیکن ہر دور میں انہوں نے دکھ سہنے کی روایت جاری رکھی۔ یہ بھی کسی نے نہیں دیکھا ہوگا کہ منتخب وزیر اعظم کی آنکھوں کے سامنے اس کے بھائی کو شہید کر دیا جائے۔ بے بسی کا اس سے شدید منظر کیا ہوگا۔ اس صدمے کے بعد بھی وہ پاکستانی سیاست کے کانٹے چننے میں لگی رہیں۔ محروم طبقوں کی نظر ہمیشہ ان پر جمی رہی۔ یہ ایک طرح کی فیملی تھی، خواب تھا، خواہش تھی کہ غریبوں اور بیروزگاروں کو ایک آس سی بی بی سے لگی رہتی تھی۔ تمام تر الزامات کے باوجود لوگ ان کی طرف دیکھتے رہے۔ اس بات کو اگر ہماری اسٹیبلشمنٹ اور ان سے نفرت کی بنیاد پر سیاست کرنے والے سمجھ سکیں تو پاکستان کو اس شہادت میں راستہ مل سکتا ہے اور یہ پاکستانی سیاست کی آخری شہادت ثابت ہو سکتی ہے لیکن ماضی یہ بتا رہا ہے کہ ہم اپنی غلطیوں سے سیکھنے کی بجائے مزید غلطیاں کرنے پر مجبور ہیں۔ اس وقت بی بی پاکستانی سیاستدانوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر گئی ہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی ادارہ یا کوئی سازش ان سیاستدانوں کو پھر سے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر دے اور پھر سے علاقائی، لسانی یا طبقاتی بنیادوں پر سیاست تقسیم ہو جائے بی بی کے دیئے ہوئے اس موقع کو ضائع نہ کیا جائے اور میاں محمد نواز شریف، اسفندیار ولی، قاضی حسین احمد، عمران خان، الطاف حسین اور فضل الرحمن کی کوششوں پر پانی پھیرنے والے عناصر پر نگاہ رکھی جائے۔ اب پاکستان کی نجات اور مستقبل کو صرف ایک ہی راستہ جاتا ہے جو بے نظیر بھٹو کی شہادت سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ راستہ چاروں صوبوں کو متحد رکھ سکتا ہے۔ اگر سیاستدانوں نے اس راستے کو چھوڑ دیا تو غیر جمہوری عناصر سب کو اکیلا اکیلا کر کے دلدل میں دھکیل دیں گے۔ امر واقع یہ ہے کہ بی بی کے نام پر ملک کے عوام کو اکٹھا رکھا جا سکتا ہے۔ گلگت سے گوادر تک اور زیارت سے آزاد کشمیر تک پھیلا ہوا سوگ طاقت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے اور اس طاقت کو ملک کی سلامتی

کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یہ موقع ضائع ہوگیا تو پھر کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ نفرت کی سیاست کرنے والوں کے لئے بی بی کا یہ پیغام ہے کہ آج کے بعد اس ملک میں نفرت کی سیاست کو ہمیشہ کے لئے دفن کرنا ہوگا اور اس الیکشن مہم کے دوران ان پر جس پارٹی نے سنگین الزام لگائے بی بی نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لئے کہ نفرت کو نفرت سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ نفرت کو محبت سے ختم کیا جاتا ہے۔ بی بی ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے آپ کی قدر نہیں کی۔ آپ کے اصولوں کے لئے معاشرے میں ماحول پیدا نہیں کیا۔ بی بی ہم شرمندہ ہیں کہ ہم نے ضیاء الحق کے کلاشنکوف کلچر کا ڈٹ کر مقابلہ نہیں کیا۔ ہم شرمندہ ہیں کہ ہم ملک کو فرقوں، طبقوں اور تعصبات میں تقسیم کرتے رہے۔ ہم مفادات کے کلچر کے مافیا کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتے رہے۔ بی بی ہم جانتے ہیں آپ نے تین بچوں کی پرورش سے وقت چرا کر ہمیں دیا۔ ہر خاتون کی بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا ایک گھر ہو اور ایک چار دیواری میں اس کی خوشیاں پلتی رہیں۔ لیکن آپ کا تو کوئی ایک گھر نہیں تھا۔ معلوم نہیں آپ کتنے گھروں میں تقسیم تھیں اور اب تو ہر گھر آپ کا گھر ہے۔ ہر گھر بھٹو ہاؤس اور بلاول ہاؤس ہے۔ ہر دل آپ کا گھر ہے۔ بی بی ہم شرمند ہیں کہ ہمارے اندر آپ جیسا حوصلہ کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بے حوصلہ لوگوں نے معلوم نہیں کس قسم کی محرومیوں کا کیتھارسس کیا ہے کہ اتنی گاڑیاں، اتنے بینک اور اتنے لوگوں کی جائیداد کو آگ لگادی۔ بی بی آپ سے حوصلہ سیکھنے کا موقع ملا ہے تو پتہ نہیں اس موقع سے ہم کچھ سیکھ سکتے ہیں یا نہیں۔ بی بی آپ سے ہم شرمندہ ہیں کہ آپ جیسا دل نہیں رکھتے جو دشمن کو معاف کرنے کی وسعت رکھتا ہو۔ ہم شرمندہ ہیں۔

(روزنامہ "جنگ" یکم جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

الوداع

فاطمہ بھٹو

اپنی مرحومہ پھوپھی سے میرے تعلقات کی نوعیت کافی پیچیدہ تھی۔ یہ بہر طور ایک حقیقت ہے ایک افسوسناک حقیقت!!! یہ بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ گزشتہ پندرہ برس کے دوران ہم نے دوستوں یا رشتے داروں کی طرح ایک دوسرے سے قطعاً کوئی سلوک نہیں کیا۔ یہ پندرہ برس کا عرصہ ہم نے ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہ کر بسر کیا تھا تاہم اس ہفتے میں نے بھی انہیں باندازِ دگر یاد کرنے کی کوشش کی اور خواہش کی ہے۔ میں انہیں ایک مختلف طریقے سے یاد کرنا چاہتی ہوں کیونکہ مجھے ایسا ہی کرنا ہوگا۔

یہ ملک جو میرا وطن ہے اور جس پر میرا ایمان غیر متزلزل ہے میں اس ایمان کو کبھی کھونا نہیں چاہوں گی۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ انہیں بغیر کسی سبب اور وجہ کے قتل کیا گیا ہے۔ تشدد اپنی خالص شکل میں کس قدر سفاک اور ناقابل معافی ہوتا ہے۔ میں اب بھی اس صورت حال کو ذہنی طور پر تسلیم کرنے سے قاصر ہوں۔ بہر صورت مجھے اپنی مرحومہ پھوپھی کو الوداع تو کہنا ہی ہوگا۔ ایک ایسا الوداعیہ جسے اشکوں سے تحریر کیا گیا ہے، جس میں شدید غم و غصہ بھی شامل ہے لیکن جو ایک ایسے مقام سے پیش کیا جا رہا ہے، جو بے حد دور افتادہ ہے اور جسے حافظے اور معذرت خواہی کے جذبے کے ساتھ خلط ملط بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایسی جگہ ہے جہاں کسی اور وقت ہم سب محفوظ تصور کیے جا سکتے تھے۔

جب میں ننھی منی سی بچی تھی تو اپنی پھوپھی کو بڑی بوا (سندھی زبان میں وڈی بوا) کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھی جو سندھی افراد اپنے والد کی بڑی بہن کو کہتے ہیں۔ جب مجھے یہ خبر ملی کہ میری بڑی بوا کو کچھ ہو گیا ہے تو مجھے بڑا تعجب ہوا کیونکہ یہ ایک ایسا تاثر تھا جو میں نے اس سے پہلے اتنی طویل مدت کے دوران کبھی نہیں سنا تھا چنانچہ ٹیلی ویژن پر جب میں نے یہ خبر سنی تو مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی اور کے بارے میں یہ خبر سن رہی ہوں۔ مجھے وقتاً ایک ایک کر کے سب ہی واقعات یاد آنے لگے۔ ہم دونوں مل جل کر بچوں کی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ ہمیں ایک ہی طرح کی مٹھائیاں بھی پسند تھیں۔ خشک میوہ اور پھل بھی ہمیں ایک جیسے ہی پسند تھے۔ ہم دونوں کے کان میں تکلیف کی نوعیت بھی مشترک تھی جس کے نتیجے میں ہم دونوں کئی برس تک شدید اذیت میں مبتلا رہے۔ بہر طور اس سے قبل میں نے ایسا مضمون نہیں لکھا جسے تحریر کرنا مجھے تقریباً ناممکن سا لگ رہا ہو۔ اس کے باوجود ہم ایک دوسرے سے کافی مختلف تھیں۔ لوگ ہمیں ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں غالباً وہ جبلی طور پر ایسا کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں لیکن میرے لئے یہ بے حد دشوار ہے کہ میں بیک وقت دو ایسے افراد کے بارے میں لکھ سکوں جن میں سے ایک کے لئے مجھے صیغۂ ماضی اور دوسرے کے لئے صیغۂ حال استعمال کرنا پڑے۔ بالخصوص اس وقت جب ایک فرد کی شخصیت دوسرے کو حیرت زدہ ہو کر یہ سوچنے پر مجبور کر دے کہ واقعی زمانۂ حال یا زمانۂ ماضی کا کوئی کوئی حقیقی وجود ہے بھی یا نہیں؟؟؟

مجھے اپنی مرحومہ پھوپھی کی سیاست سے کبھی اتفاق نہیں رہا۔ جی ہاں۔ کبھی نہیں، مجھے ان لوگوں سے بھی قطعاً کوئی اتفاق نہ تھا، جو انہیں ہر وقت گھیرے رہتے تھے۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر مجھے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ واقعات اور حالات کی جو تعبیر اور تفسیر وہ بیان کرتی تھیں اس سے بھی مجھے کوئی اتفاق نہیں رہا۔ تاہم یہ باتیں اور اختلافات ان کی زندگی تک تھے لیکن اب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں رہیں۔ موت ہمیں سکون اور اطمینان کے ساتھ سوچنے کا پیغام دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا لمحہ ہوتا ہے، جو ہمیں ٹھنڈے دل کے ساتھ چیزوں پر غور کرنے کا موقع دیتا ہے۔ موت ہمیں بتاتی ہے کہ بس!!! بہت ہو چکا۔ ہم آپس میں کافی لڑ بھڑ چکے اب ہم مزید پاگل پن کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ میں اپنے خاندان کے ساتھ ہونے والے المناک واقعات کا سوگ منا رہی ہوں۔ میرا دل بلاول، بختاور اور آصفہ کے لئے رو رہا ہے۔ میں ان کے رنج و غم میں برابر کی شریک ہوں کیونکہ وہ میرے مرحوم والد کی حقیقی بہن تھیں۔ انہیں بھی میں اپنے والدین جیسا ہی سمجھتی تھی۔ میں ایسے تجربے سے گزر چکی ہوں، جب کوئی سمندر کی لہروں میں گم ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے جہاں صرف خوف اور بے بسی ہی اس کے ساتھ ہوتے ہیں مجھے اس جانکاہ صدمے کا بڑا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ میں پارٹی کے کارکنوں کے لئے بھی افسردہ ہوں جو اس المناک حادثے میں اپنے پیاروں سے محروم ہو چکے ہیں۔

جب کوئی اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کے عزیز، رشتے دار اور احباب سب ہی مساجد، گرجا گھروں اور مندروں میں جمع ہو کر اس کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں اور رنج و امید سے بھرے حمدیہ کلمات ادا کرتے ہیں۔ ابھی تک کوئی ایسی حمد نہیں لکھی گئی جو غم و غصے یا احساس محرومی کو ظاہر کرتی ہو۔ یہ لمحات بھی بالآخر بیت جائیں گے۔ وقت بہت بڑا مرہم ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب ہمیں کیسی حمد گانا ہوگی؟؟ ایک ایسی حمد جس میں اداسی اور افسردگی کے بعد سورج نمودار ہوتا ہے۔ ہر رات کے بعد صبح ضرور آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم کس چیز کے لئے پرامید ہو سکتے ہیں؟؟ صبح کو بیدار کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ میں اپنے قارئین کے ساتھ ہمیشہ نہایت دیانتدار رہی ہوں۔ میں نے ان سے کبھی اپنے دل کی بات نہیں چھپائی۔ اس کا اظہار میں نے شروع ہی میں ان سے کر دیا تھا۔ میں پوری ایمانداری اور سچائی سے اس بات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں کہ میرا نقصان کم نہیں ہوا۔ میں اب تک صدمے کی حالت سے باہر نہیں آ سکی۔ میں صدمے کی حالت میں ہوں کیوں کہ اب تک میں نے اپنے جتنے پیاروں کو مٹی میں دفن ہوتے دیکھا ہے ان سب کی ہلاکت غیر قدرتی طریقوں سے ہوئی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی قدرتی موت نہیں مرا۔ میرے چار انتہائی قریبی اور نزدیکی عزیز رشتے دار جنہیں مٹی کے سپرد کیا گیا، سب کے سب وحشیانہ اور سفاکانہ قتل کا نشانہ بنے ہیں۔ میں اپنے دادا ذوالفقار علی بھٹو کے قتل کے پانچ برس بعد پیدا ہوئی تھی۔ میں نے اپنے دادا کی شہادت کے بعد پیدا ہونے والے خلاء میں جنم لیا تھا چنانچہ اپنے مرحوم والد میر مرتضیٰ علی بھٹو کے نزدیک میں ان کے لئے نئی زندگی کی نوید تھی۔ میں اپنے مرحوم دادا دادی کی تقاریر سن کر بڑی ہوئی اور ان کے ویڈیو کیسٹ بھی میں نے دیکھے ہیں۔ جب میرے دادا کو شہید کیا تھا تو میرے والد ابھی نوجوان ہی تھے اور یہ صدمہ ان کے آخری سانس تک، ان کے ساتھ ہی رہا تھا۔ وہ اپنے والد کی جدائی کے غم سے کبھی آزاد نہ ہو سکے تھے۔ جب میرے چچا شاہنواز بھٹو کا پیرس میں قتل ہوا تو میں فقط تین برس کی تھی۔ مجھے یاد ہے اس موقع پر میری بڑی بوا نے میرے ساتھ بیٹھ کر مجھے کہانیاں سنائی تھیں۔ خاندان کے دیگر افراد اس سانحے کے بارے میں پولیس سے گفت و شنید میں مصروف تھے۔ چودہ برس کی عمر کو پہنچی تو یوں سمجھ لیں میری زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میں اپنے قلب اور اپنی روح سے محروم ہو چکی تھی۔ میرے پیارے والد میر مرتضیٰ علی بھٹو کو بھی قتل کر دیا

تھا۔اس لمحے کے بعد سے میں صرف اور محض اپنی شخصیت اور وجود کا ایک سایہ بن کر رہ گئی ہوں اور اب جب میری عمر پچیس برس ہے تو میری بڑا ابو کو مجھ سے چھین لیا گیا۔ بہر حال یہ مضمون میری ذات کے بارے میں نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کی یاد میں لکھا گیا ہے جو مجھ سے بچھڑ چکے ہیں۔ یہ ہمارے آبائی قبرستان گڑھی خدا بخش کے بارے میں ہے جو لمحہ بہ لمحہ قبروں سے بھرتا چلا جارہا ہے۔ میری دعا ہے کہ کاش یہ آخری میت ہو اور ہمیں آئندہ کسی کو اتنی جلد الوداع نہ کہنا پڑے۔الوداع بڑی بوا.....الوداع.....!

(روزنامہ "جنگ" 2 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

مٹھی بھر مٹی اور مٹھی بھر غم!!

بشریٰ اعجاز

چلو چلو لیاقت باغ چلو! چلو چلو لیڈر کو دیکھنے چلو! وہی پرانا شوق وہی دیرینہ خواب۔ پراہٹ وے مینوں لیڈر دیکھن دے..... مگر لیڈر، ہاتھ ہلاتی، وکٹری کے نشان بناتی، اپنے چاہنے والوں کی محبتوں، عقیدتوں پر انہیں سراہتی، دیکھتے ہی دیکھتے خود خواب ہوگئی۔ اور اس کے چاہنے والے پکارتے رہ گئے، پراہٹ وے مینوں لیڈر دیکھن دے..... مگر اب ان آوازوں میں جوش نہیں، شوق نہیں، غم کی نمکینی تھی، درد کی خراش تھی، اب لیڈر کہاں تھی؟ سفید دوپٹے سے سفید کفن کا چولا پہننے تک کے سفر میں کہیں گم ہو چکی تھی، دیکھنے والے دیکھ رہے تھے، لیڈر شپ کا خواب کرچی کرچی ہو کر کچی مٹی کی تازہ ڈھیری میں سما گیا تھا، جسے ڈھونڈ نکالنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔

باب العلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کیا خوب کہا تھا ''میں اس دار دنیا کی حالت کیا بیان کروں کہ جس کی ابتدا رنج اور انتہا فنا ہو۔ دیکھو یہ دنیا جھلک دکھا کر منہ موڑ لینے والی ہے۔ یہ دنیا ہی کے مناسب حال ہے کہ صبح کو کسی کو دوست بن کر اس کا بدلہ چکائے اور شام کو یوں ہو جائے کہ گویا کوئی جان پہچان ہی نہ تھی۔'' 27 دسمبر کا دن بلاشبہ دنیا کے ایسے ہی تضادات سے بھرپور تھا، ایک انتہائی عجیب دن! جس کا پہلا حصہ نئی امیدوں، حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا تھا، شادمانیوں سے عبارت تھا اور شام اتنی ہی افسردہ اور ہلاکت خیز تھی جب عالمی سطح پر کیے جانے والے ایک سروے کے مطابق دنیا کی دوسرے نمبر پر طاقتور سمجھی جانے والی عورت کو ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں شہید کر دیا گیا۔ یوں کہ خیر مقدمی نعرے بینر، پوسٹر اور لاکھوں دلوں کی دھڑکنیں حیران و ششدر دیکھتی رہ گئیں یقین کسی کو بھی نہیں آ رہا تھا۔ سانحہ تھا ہی اتنا اچانک، شدید اور اندوہناک، جس میں چلو چلو لیاقت باغ چلو کی جوش آفرینی، ماتمی آوازوں میں ڈھل کر رہ گئی اور بھٹو خاندان کا چوتھا جنازہ جمہوریت کے نام پر اٹھایا اور دفنا دیا گیا! انتخابات سے صرف دس روز پہلے ملک کی مقبول ترین پارٹی کی لیڈر کو گڑھی خدا بخش میں، عوامی لیڈر کے پہلو میں جب لحد میں اتارا گیا تو کون سی ایسی آنکھ تھی جو اشکبار نہ تھی، کون سا ایسا دل تھا جو سوگوار نہ تھا، بھٹو کے مزار کے اردگرد فضا میں بین گونجتے تھے، زمین سے غم کا غبار اٹھتا تھا اور قبروں کی ویرانی پکار پکار کر کہتی تھی وہ دیکھو! دریا سے کہرہ اٹھا، غبار تاروں کا اتر رہا ہے، کھنڈروں کے دھندلکوں میں، الم کے سارے مغنی پکارتے ہیں کہ وقت نے صرف غم دیا ہے!

واقعی وقت نے صرف غم دیا ہے! بھٹو کی پھانسی اور بھٹو کی بیٹی کا خودکش بم دھماکے میں اچانک مارا جانا، غم کا ایسا تسلسل ہے جس میں بھٹو خاندان کے جنازے، غیر فطری موتیں اور ان اموات سے جڑے ہوئے، بینظیر کی اچانک موت سے کچھ اس قدر تازہ ہوئے کہ جب دختر مشرق کو خاک میں اتارا جا رہا تھا تو سب کو یہ نقصان اتنا ذاتی سا لگ رہا تھا کہ بھٹو اور اس کی بیٹی سے نظریاتی اختلافات، سیاسی مخالفتیں اور ان کی پالیسیوں

سے اتفاق نہ کرنے والے بھی اس کا دکھ برابر محسوس کر رہے تھے! یہ بات صرف سیاسیات کے طالب علم ہی نہیں عام آدمی بھی بخوبی جانتا ہے کہ اچھا لیڈر صدیوں میں پیدا ہوتا ہے اور بھٹو بلاشبہ لیڈر تھا، ایسا لیڈر جس کی جڑیں زمین میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جو عوام کا نبض شناس تھا، جس نے زمین زادوں کے پامال حقوق کی بات کی، ان کی شرف کی بات کی اور فیوڈلز اور پرانے یونینسٹوں کی بنائی ہوئی مفاداتی سیاست کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ بیوروکریسی، وڈیرہ شاہی اور استحصال پسندوں کے جبر و استبداد کے شکار، محروموں کو دل سے لگانے کی بات کی، اور ایسی قبولیت عام حاصل کی جس نے ایک سندھی لیڈر کو وفاق کی اکائی کی علامت بنا دیا۔ اس حقیقت سے بھٹو کے مخالفین بھی انکار نہیں کر سکتے کہ وہ اس دھرتی کا ایسا لیڈر تھا جو وادیٔ سندھ سے اٹھا اور پانچ دریاؤں کی دھرتی کو مسخر کر کے جس نے اپنی مقبولیت کے جھنڈے کوہستانی علاقوں میں جا گاڑے! بینظیر اسی عوامی لیڈر کی بیٹی تھی۔ بے حد مضبوط شخصیت کی مالک، ایک جری عورت، جس نے میل ڈومینیٹنگ سوسائٹی اور اس کے وارثوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، مولویوں کے فتوؤں اور عورتوں سے امتیازی سلوک جیسے رویوں کو مردانہ وار چیلنج کیا اور نہ صرف اپنے باپ کا سیاسی ورثہ سنبھالا بلکہ کسی حد تک اس خواب کو بھی محفوظ رکھا جو لیڈر کے متعلق تھا اور اس کے چاہنے والوں کی آنکھوں میں ہمکتا تھا۔ اڈیالہ جیل کا پھانسی گھاٹ، C-130 اور گڑھی خدا بخش، طویل نظر بندی اور آمریت، کتنی کٹھنائیاں تھیں جن کا مقابلہ اس دھان پان سے لڑکی نے کیا جسے بھٹو پیار سے پنکی کہتے تھے، جس نے آکسفورڈ اور کیمبرج سے جو حاصل کیا اسے یہاں کے زمینی حقائق سے کچھ علاقہ نہ تھا، سو یہاں اس نے جمہوریت کے مخالفوں اور آمریت سے جو لڑائی بھی لڑی اس کے لئے اس نے مدد اپنے اندر سے حاصل کی یا پھر وہ تلخ تجربے اس کے رہنما تھے جو زندگی نے اسے دیئے تھے۔

بینظیر کی پالیسیوں سے لاکھ انکار کے باوجود اس کی سیاسی فراست، فہم اور صلاحیتوں سے انکار ممکن نہیں۔ جس کی وجہ سے اسے عالمی سطح پر ایک زبردست لیڈر کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ سکیورٹی کونسل میں اس کے لئے تعزیتی ریفرنس ہوا، من موہن سنگھ نے اسے خراج تحسین پیش کیا، بی بی سی اور سی این این جیسے مغربی نشریاتی اداروں نے اس سانحے کی مکمل کوریج پیش کی اور دنیا بھر کے سیاسی رہنماؤں نے اس کی شہادت پر تعزیت کے پیغامات بھیجے! راولپنڈی سے اس کا سندھی اجرت میں لپٹا ہوا تابوت جب نوڈیرو پہنچا تو پاکستان کی سڑکوں پر ہو کا عالم تھا۔ ماتم کناں لوگوں کا ایک ہجوم تھا، لوگ ٹی وی سکرینوں کے سامنے دم بخود بیٹھے تھے اور اک شاندار مگر جدوجہد سے بھرپور زندگی گزار کر شاندار رخصتی سے ہمکنار ہونے والی لیڈر کی شہادت کا المیہ! لوگوں کے دلوں پر لکھا دکھائی دیتا تھا۔ خودکش دھماکے، طالبان کی دھمکیاں اور سیاسی مخالفین کے منصوبے جن کی نشاندہی بینظیر نے 18 اکتوبر سے پہلے کر دی تھی جیسے خطرات کے باوجود انتخابی مہم کو جلسوں، ریلیوں اور جلوسوں کے ذریعے چلانے کے پیچھے عوام سے براہ راست رابطے کے علاوہ اور کیا مقصد ہو سکتا تھا۔ جس سے محترمہ کے بھی خیر خواہوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی عوامی رابطے کے لئے ٹیلی فونک خطاب، ٹیلی ویژن اور اشتہاری مہموں کے ذرائع کے استعمال پر زور دیا مگر بھٹو کی بیٹی نے ان تمام ذرائع کو مسترد کر دیا اور کہا "ہمیں ہاتھ پاؤں باندھ کر الیکشن میں حصہ لینے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ میں عوام کو منظم کروں گی" عوام کی تنظیم اور ان سے رابطہ 27 دسمبر کے المیے کا باعث بنا، جس نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا۔ لیاقت باغ میں بھٹو کی بیٹی کا پانچواں جلسہ آخری ثابت ہوا۔

اور ہلاکت ایک ایسا سوال جس نے نہ صرف پاکستان میں جمہوریت کے مستقبل کو سوالیہ نشان بنا دیا ہے بلکہ امن عامہ کے معاملات کو بھی!

جس میں آج ہر زبان پر یہی خدشہ رکھا نظر آتا ہے کہ اگر اس ملک میں ایک انتہائی اہم شخصیت کو دن دہاڑے ہزاروں لوگوں کی موجودگی اور سکیورٹی کے باوجود قتل کیا جا سکتا ہے تو پھر عام آدمی کا تحفظ اک مذاق کے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ پی پی رہنما جو چاروں صوبوں کے درمیان اک زنجیر کی علامت تھی کی شہادت انتخابات کے عمل کو پٹڑی سے اتارنے کی کوشش ہے یا سیاست کو لگنے والا ایک بڑا دھچکا جو بھی ہے اس کے اثرات تو آہستہ آہستہ سامنے آئیں گے مگر ایک بات طے ہے، پاکستان عالمی سطح پر تسلیم شدہ ایک بڑی لیڈر سے محروم ہو گیا ہے اور یہ ملک و قوم کا اک بڑا نقصان ہے۔ جس کی تکلیف سبھی محسوس کر رہے ہیں۔ بھٹو کی شہادت پر بہ زبان خاموشی ماتم کرنے والے اب سر عام عزاداری کر رہے ہیں۔ ملک بھر میں اس سانحے کے بعد آگ لگی ہوئی ہے۔ زمیں بھی تحیر زدہ ہے اور اہل زمین بھی! اک مہذب، شائستہ اور منفرد شخصیت کی حامل لیڈر مری نہیں، ماردی گئی ہے، مگر اس کی موت جو بلاشبہ شہادت ہے کیا واقعی اس کی موت ثابت ہوگی؟ کیا 4 اپریل 1979ء کو بھٹو کو دار پر چڑھانے والے، حقیقت میں اسے مار سکے؟ اگر بھٹو زندہ ہے تو پھر بھٹو کی بیٹی بھی یقیناً زندہ رہے گی! پی پی پی اس وقت پھر اک کڑے امتحان سے گزر رہی ہے۔ 1979ء میں تو بھٹو کے بعد بھٹو کی بہادر بیٹی تھی اب کون ہوگا؟ الم کی اس گھڑی میں سوال بہت سے ہیں اور جواب؟؟ سر دست اک ادھورا نوحہ دہرانا پڑ رہا ہے!!

الم کے ساتھی، سیاہ کپڑوں میں
بے دلی کے علم اٹھائے یوں نوحہ زن ہیں
یہ وقت کرب و بلا ہے آؤ۔ جھکاؤ سر اور بہاؤ آنسو
یہ وادیٔ محن ہے
جنازے واپس گھروں کو آئے!!

(روزنامہ ''جنگ'' 2 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

بے نظیر حقیقی معنوں میں چاروں صوبوں کی زنجیر تھی

سلطان صدیقی

21 دسمبر عیدالضحیٰ کی صبح شیر پاؤ کے عیدگاہ میں ہونے والے خودکش بم دھماکے میں ہلاک و زخمی ہونیوالوں کی لاشیں ابھی سنبھالیں نہیں گئیں تھیں کہ ملکی تاریخ میں انتہائی اہمیت کے حامل لیاقت باغ میں فائرنگ اور خودکش دھماکہ کے واقعے میں بیس سے زیادہ افراد سمیت دو بار کی سابق وزیراعظم اور پی پی پی (پی) کی سربراہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کا المناک اور اندوہناک سانحہ بھی رونما ہوا۔ بے نظیر بھٹو ملک کے کروڑوں عوام کے دلوں کی دھڑکن، غریب عوام کے جذبوں اور ولولوں کی ترجمان مظلوموں کی آواز، وفاق پاکستان کی علامت اور چاروں صوبوں کی زنجیر تھی۔ ان کی شہادت عالمی سطح پر جاری دہشت گردی کا تسلسل بھی قرار دی جارہی ہے اور چھوٹے صوبوں کے لیڈروں کے ساتھ ہونے والے سلوک کا حصہ بھی، ملک میں جاری انتہا پسندی اور دہشت گردی سے بھی اس کے ڈانڈے ملائے جارہے ہیں اور گردوپیش کی صورت حال سے بھی۔ اصل حقیقت کیا ہے اور اس سانحے سے متعلق کی جانے والی تحقیقات کے نتیجے میں کیا حقائق سامنے آتے ہیں۔ یہ تو وقت بتائے گا۔ ان کے بہیمانہ اور المناک شہادت کے خلاف ملک بھر کی طرح صوبہ سرحد اور ملحقہ قبائلی علاقوں میں بھی غم و غصے اور رنج و افسوس کا یکساں اظہار کیا گیا اور صوبائی دارالحکومت پشاور میں توڑ پھوڑ کے واقعات بھی ہوئے۔

جماعت اسلامی پاکستان کے امیر قاضی حسین احمد کی اپیل پر جماعت اسلامی کے ورکروں اور راہنماؤں اور اے این پی کے سربراہ اسفندیار ولی خان کی اپیل پر اے این پی کے ورکروں اور راہنماؤں، مسلم لیگ (ن) کے سربراہ سابق وزیراعظم میاں نواز شریف کی اپیل پر مسلم لیگ (ن) کے راہنماؤں و کارکنوں اور اے پی ڈی ایم کے مرکزی کنوینئر محمود خان اچکزئی اور مرکزی راہنماؤں ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ، میر حاصل بزنجو وغیرہ کی اپیل پر اے پی ڈی ایم کی جماعتوں سمیت جے یو آئی (ف) کے ورکروں و راہنماؤں نے پی پی پی (پی) کے ورکروں و راہنماؤں کے ہمراہ تین روزہ سوگ مناتے ہوئے مشترکہ احتجاج بھی کیا۔ قرآن خوانی و فاتحہ خوانی کی تقریبات منعقد کیں اور غائبانہ نماز جنازہ ادا کیئے۔ شاید اب تک کی اسلامی تاریخ میں محترمہ بے نظیر بھٹو عالم اسلام کی واحد شخصیت ہیں جن کی غائبانہ نماز جنازہ تین روز تک ہزاروں جگہوں میں ادا کی گئیں اور ہر جگہ ان میں ہزاروں اور سینکڑوں لوگوں نے شرکت کی۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو سے سیاسی اختلافات کے باوجود کوئی بھی ذی شعور انسان محترمہ کی قائدانہ صلاحیتوں، ملک و قوم کے ساتھ محبت، جمہوریت کے لئے کی جانی والی کاوشوں اور مظلوم کی آواز اٹھانے کے لئے ان کی کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور انہیں اس انداز میں منظر سے ہٹانے کے اقدام کو عوامی سطح پر قبول نہیں کیا جارہا۔

محترمہ بے نظیر بھٹو صوبہ سندھ سے تعلق رکھنے والی پاکستان کی تیسری سابق وزیراعظم ہیں جن کی لاش راولپنڈی سے کراچی/ سندھ روانہ کی

گئی ہے۔ 1951ء میں ملک کے پہلے وزیراعظم نواب زادہ لیاقت علی خان کو ایک جلسے کے دوران اسی لیاقت باغ میں سٹیج پر گولیاں چلا کر شہید کیا گیا تھا اور اس کی لاش کراچی بھجوائی گئی تھی۔ بعدازاں ایک متنازعہ قتل کیس میں پی پی پی کے بانی چیئرمین ملک کے ایٹمی پروگرام کے بانی، سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو راولپنڈی جیل میں پھانسی چڑھا کر اس کی لاش نوڈیرو سندھ بھجوائی گئی اور اب 27 دسمبر 2007ء کو لیاقت باغ ہی کے گیٹ کے باہر سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی دختر و سیاسی وارث سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی شہادت کا سانحہ ہوا اور ان کی لاش نوڈیرو سندھ بھجوائی گئی۔

ملک کی 60 سالہ تاریخ میں چھوٹے صوبوں کو پسماندہ رکھنے، انہیں حقوق نہ دینے اور چھوٹی قوموں کو محکوم رکھنے کے تاریخی پس منظر اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے دو عشروں سے زیادہ پر مشتمل سیاسی کیریئر جس میں ہر موقع پر انہوں نے ملک میں آمریت کے خلاف جمہوری اداروں کے استحکام اور غریب لوگوں و مزدور کاروں اور عوام کے حقوق کے لئے آواز اٹھائے رکھی، کے تناظر میں ملک بھر بالخصوص چھوٹے صوبوں اور خاص کر سندھ میں اس سانحے پر ہونے والا ردعمل اور اشتعال فطری امر تھا۔ تاہم پنجاب میں موجود جماعت اسلامی اور مسلم لیگ (ن) کی مرکزی قیادت کی جانب سے فوری طور پر سوگ منانے کے اعلانات، سابق وزیراعظم میاں نواز شریف کی جانب سے فوری طور پر انتخابات کے بائیکاٹ کے اعلان اور محترمہ کی لاش کے ساتھ سندھ جانے کے عندیہ سمیت بعدازاں مسلم لیگ (ن) اے پی ڈی ایم، جماعت اسلامی اور اے این پی کی قیادت کی جانب سے نوڈیرو جا کر تعزیت کے اظہار اور محترمہ کی قبر پر حاضری و دعائے مغفرت اور پھولوں کی چادر چڑھانے کے واقعات نے وفاق کو لاحق بعض خطرات کا راستہ روک دیا ہے اور ویسے بھی محترمہ بے نظیر بھٹو جو ملک کی علیحدگی کے نعروں کے خلاف ایک دیوار تھی اور جو جذبات خود وفاق کی علامت تھی، ان کی موت نے بھی تمام سیاسی جمہوری قوتوں اور ڈکٹیٹرشپ مخالف جماعتوں کو ایک دوسرے کے مزید قریب لانے کا موقع دیا ہے۔

پیپلز پارٹی کی قیادت نے محترمہ کے صاحبزادے بلاول بھٹو زرداری کو چیئرمین، محترمہ کے شوہر آصف علی زرداری کو قائم مقام چیئرمین اور مخدوم امین فہیم کو پارٹی کی کامیابی کی صورت میں وزارت اعظمیٰ کے لئے نامزد کر کے انتخابات میں حصہ لینے کا درست اور بروقت فیصلہ کرتے ہوئے نہ صرف پارٹی کو منتشر ہونے سے بچایا ہے بلکہ عوام کو بھی یہ پیغام دیا ہے کہ محترمہ جو چاروں صوبوں کی زنجیر تھی اور جن کی پارٹی پورے ملک کی نمائندہ تھی۔ اب کی بار بھی وہ وہی کردار ادا کرے گی اور ملکی سالمیت و بقا کے لئے کردار ادا کرے گی۔ اگرچہ الیکشن کمیشن آف پاکستان نے عام انتخابات 8 جنوری سے موخر کرتے ہوئے 18 فروری کو منعقد کرانے کا اعلان کر دیا ہے۔

الیکشن مہم کے تسلسل اور بے نظیر بھٹو کی شہادت کے واقعے کے مابعد اثرات کے قرائن و شواہد بتا رہے ہیں کہ پی پی پی (پی) ملکی سطح پر بھی اور صوبہ سرحد کی سطح پر بھی بھرپور کامیابی حاصل کرے گی اور خاموش ووٹروں کی بڑی تعداد جس نے اپنے انداز میں بے نظیر بھٹو کے المناک موت کے غم کو سہا اور برداشت کیا ہے وہ الیکشن کا دن بھی اپنے انداز سے گزاریں گے اور خاموشی سے آ کر یا مختلف جماعتوں کے بینرز تلے اور گروہ بندیوں کے تحت آ کر بے نظیر بھٹو سے اپنی ہمدردی کا اظہار ان کے نامزد کردہ امیدواروں کو کامیاب کر کے کریں گے۔ دیکھئے الیکشن کے نتائج اس حوالے سے کیا پیغام لے کر آتے ہیں!

جہاں تک محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات کا تعلق ہے۔ پیپلز لائرز فورم نے اس سلسلے میں وزارت داخلہ کا مؤقف مسترد کرتے ہوئے

مطالبہ کیا ہے کہ محترمہ کے قتل کی تحقیقات لبنان کے صدر رفیق حریری کی تحقیقات کی طرز پر کی جائیں۔ یہ مطالبہ فورم کے ایک اجلاس میں کیا گیا جو ہائی کورٹ بار روم میں منعقد ہوا۔ جس سے فورم کے صوبائی چیف آرگنائزر سابق سپیکر سرحد اسمبلی بیرسٹر مسعود کوثر سمیت دیگر وکلاء نے خطاب کیا۔ مقررین نے کہا کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی زندگی میں جو وصیت نامہ لکھا تھا اس میں انہوں نے اپنے قاتلوں کی نشاندہی کی تھی انہوں نے مطالبہ کیا کہ ان افراد کو گرفتار کیا جائے جن کی نشاندہی بے نظیر بھٹو نے اپنی زندگی میں کی تھی۔ مقررین نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ معزول چیف جسٹس مسٹر جسٹس افتخار محمد چوہدری کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی ٹریبونل قائم کیا جائے۔

(روزنامہ "جنگ" 3 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

بینظیر کی سیاسی فہم وفراست.....ایک زمانہ ان کا قائل تھا

شفیع موسیٰ منصوری

ہیرے کو جوہری سے بہتر بھلا اور کون جان سکتا ہے۔ بھٹو ایسا جوہری تھا، جس نے سب سے پہلے اس ہیرے کو پہچانا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بیٹوں کے مقابلے میں بیٹی کو اپنا سیاسی جاں نشیں مقرر کیا اور پیش گوئی کی کہ وہ نہ صرف ایک بڑی سیاسی لیڈر بنے گی بلکہ اپنے سیاسی مخالفوں کو عبرت ناک شکست سے بھی دوچار کرے گی۔ آنے والے وقت نے بھٹو کی جہاں دیگر سیاسی پیش گوئیوں کو سچ ثابت کیا، وہاں اس پیش گوئی نے بھی حقیقت کا روپ دھارا اور بے نظیر بھٹو آسمان سیاست کا ایک ایسا درخشاں ستارہ بنیں جس کی روشنی کوئی ماند نہ کر سکا۔

بے نظیر بھٹو کو نہ صرف ملکی سطح پر بڑی سیاسی لیڈر کے طور پر تسلیم کیا گیا بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی وہ ایک سیاسی مدبر کے طور پر پہچانی گئیں۔ دنیا میں فرد ہمیشہ اپنے ملک سے پہچانا جاتا ہے لیکن بھٹو خاندان کو یہ اعزاز حاصل رہا کہ ان کا خاندان پاکستان کی پہچان بنا۔ بے نظیر بھٹو کی مدبرانہ سیاست اور عالمی امور پر ان کی گہری نظر کا ایک زمانہ قائل تھا۔ مختلف عالمی امور پر امریکہ اور یورپ کی مشہور و معروف یونیورسٹیاں انہیں لیکچر دینے کے لئے مدعو کرتی رہیں۔ محترمہ کے ایک لیکچر کے عوض ہزاروں ڈالر فیس ادا کی جاتی تھی۔ ان کے سامعین میں دانش ور، صحافی، انسانی حقوق کے علم بردار اور طالب علم بھی شامل ہوتے تھے۔ بے نظیر بھٹو کو دو بار پاکستان کی وزیراعظم بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اگر زندگی نے ان سے وفا کی ہوتی تو حالات ان کے تیسری بار وزیراعظم بننے کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔

بے نظیر بھٹو کی زندگی حوادث زمانہ سے بھری ہوئی تھی۔ اگر ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو کب کا شکستہ دل کے ساتھ سیاست سے کنارہ کش ہو چکا ہوتا۔ انہوں نے اپنی سیاسی فہم وفراست اور مدبرانہ قیادت سے اس بات کو سچ ثابت کیا کہ بھٹو کی نگاہ انتخاب کبھی غلط نہیں ہو سکی۔ بے نظیر بھٹو کا پورا خاندان بکھر گیا مگر اس کے باوجود وہ پاکستان کے لیے ایک ایسی زنجیر ثابت ہوئیں جس نے چاروں صوبوں کو باہمی طور پر جوڑے رکھا۔ اس زنجیر کے ٹوٹنے کے بعد وفاق کے مستقبل پر ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن چکا ہے۔ بے نظیر بھٹو کو ان کے والد کی طرح کبھی بھی اسٹیبلشمنٹ اور فوج نے صدق دل سے قبول نہیں کیا۔ بھٹو خاندان کے ساتھ عوام کی محبت اور عقیدت دیکھتے ہوئے ان قوتوں کو مجبوراً انہیں دو بار وزیراعظم کے طور پر قبول کرنا پڑا، لیکن ان کے صبر کا پیمانہ جلد ہی لبریز ہو گیا اور انہوں نے پہلی حکومت کو نو ماہ میں اور دوسری حکومت کو ڈھائی سال کے مختصر عرصے میں ختم کر دیا۔ اس مختصر مدت میں بھی انہیں چین سے حکومت نہ کرنے دی گئی اور سازشوں کے جال چاروں طرف تان دیے گئے۔ ان سازشوں میں اپنے پرائے سبھی لوگ شامل تھے۔

1977ء تک ان کی زندگی آسودگی میں گزری، اس کے بعد مشکلات اور دشواریوں کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جو ان کی موت پر

منتج ہوا۔ جنرل ضیاء نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹا تو اس کے بعد بے نظیر بھٹو کی زندگی میں کئی چیزیں الٹ پلٹ گئیں۔ 24 سالہ لڑکی کے نازک کاندھوں پر فوجی آمروں نے اپنے بھاری بوٹوں کا وزن رکھ دیا۔ 3 اپریل 1979ء کی صبح بھٹو سے بے نظیر کی آخری ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں بیٹی نے باپ کے سامنے ان کے مشن کو جاری رکھنے کا عہد کیا۔ سلاخوں کے پیچھے قید بے بس مگر غیر متزلزل ارادوں کے مالک باپ نے اپنی بیٹی میں ایک نئی عورت کو جنم لیتے دیکھا تو موت کو گلے لگانا ان کے لئے اور زیادہ آسان ہو گیا۔ شاید اسی لئے پھانسی کے تختے پر کھڑے بھٹو کی زبان سے معذرت خواہانہ الفاظ کی بجائے "دفنش اِٹ" کے الفاظ ادا ہوئے۔

سایہ دار درخت کے گرنے کی جگہ ایک اور پودے نے جڑ پکڑلی۔ ذوالفقار علی بھٹو کو بہ خوبی اس بات کا ادراک تھا کہ ان کی بیٹی باصلاحیت اور ذہین ہے لیکن پاکستانی معاشرہ ذہنی طور پر اتنا بالغ نہیں ہوا کہ وہ اس ذہانت کی قدر کر سکے۔ کسی نے اس تناظر میں کیا خوب کہا، "بھٹو بونوں کے دیس میں پیدا ہو گیا تھا۔" ذوالفقار علی بھٹو نے بے نظیر کے نام اپنے آخری خط میں اس بات کی نشاندہی کرتے ہوئے ان الفاظ میں ذکر کیا، "تمہاری صلاحیت اور ذہانت تمہیں اعلیٰ ترین مقام تک پہنچائے گی۔ لیکن ہم ایک ایسے معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں ذہانت اور صلاحیت ایک نقص شمار ہوتی ہے اور دم گھونٹنے والی معمولی قسم کی ذہانت ایک اثاثہ شمار کی جاتی ہے۔ تمہارے والد (بھٹو)، قائداعظم اور شاید سہروردی کے سوا اس ملک میں حکومت شعبدہ بازوں اور کپتانوں نے کی ہے۔ شاید اس صورت حال میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔ اگر حالات تبدیل نہیں ہوتے تو پھر تبدیل کرنے کے لئے کچھ نہیں بچے گا۔ یا تو اقتدار عوام کو حاصل ہو گا یا پھر ہر شے تباہ و برباد ہو جائے گی۔" پھر واقعی ہر شے تباہ و برباد ہو گئی۔ معمولی ذہانت نے اعلیٰ ذہانت پر قبضہ کر لیا اور بونے خاموش تماشائی بنے یہ سب کچھ ہوتا دیکھتے رہے۔

بے نظیر بھٹو نے اپنے باپ کے آدرشوں کی رہنمائی میں سیاست کا آغاز کیا۔ بھٹو خدا کے بعد کلی طور پر عوام پر بھروسا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو بھی یہی سبق سکھایا اور کہا کہ جس طرح اللہ کی جنت ماؤں کے قدموں تلے ہوتی ہے، اسی طرح سیاست کی جنت عوام کے قدموں تلے ہے۔ بھٹو اپنی بیٹی کو تخت دینا چاہتے تھے لیکن سلاخوں کے پیچھے سے وہ اپنا ہاتھ تک نہیں نکال سکتے تھے اس لئے انہوں نے عوام کا ہاتھ تخت کے طور پر انہیں دیا۔ چار اپریل 1979ء کو منتخب وزیراعظم، چیئرمین، بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ اس پھانسی کے بعد بے نظیر بھٹو کی سیاسی فہم و فراست کا امتحان شروع ہوا۔ ایک باب بند ہوا تو دوسرا کھل گیا۔ بے نظیر بھٹو کو بہت بڑے سیاسی فیصلے کرنا پڑے۔ ان فیصلوں میں اگرچہ پارٹی کے دیگر سینئر عہدیداران کی آراء بھی شامل ہوتیں، تاہم ان سب میں محترمہ کا سیاسی تدبر اور فہم و فراست جھلکتا رہا۔ بھٹو کی وفات کے بعد پارٹی کے بہت سے سینئر رہنما استقامت کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں جنرل ضیاء سے مفاہمت کرنے کی باتیں کی جانے لگیں۔ بے نظیر بھٹو نے ان عناصر سے پارٹی کو پاک کرنے کا فیصلہ کیا اور بہت سے سینئر رہنما پارٹی سے نکال دیئے گئے۔

اگرچہ ان حضرات کے پارٹی سے نکالے جانے کے فیصلے کو بہت سے افراد نے ناپسند کیا اور اسے محترمہ کی ناسمجھی اور ناتجربہ کاری سے تعبیر کیا، تاہم بعد کے واقعات نے بے نظیر کے سیاسی فہم و فراست پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی۔ جن لوگوں کو پارٹی سے نکالا گیا تھا وہ اسٹیبلشمنٹ کا حصہ بن کر پارٹی کو نقصان پہنچانے کے لئے کھل کر سامنے آ گئے۔ نظریاتی اختلافات کی بناء پر بھی بہت سے سینئر رہنما از خود پارٹی سے کنارہ کش ہوئے لیکن

وہ پارٹی سے الگ ہو کر سیاست کے بازار میں اپنا سکہ نہ چلا سکے اور وقت کی گرد نے ان کی شخصیت کو دھندلا کر رکھ دیا۔

ضیاء دور کے پہلے بلدیاتی انتخابات میں گمان یہ کیا جا رہا تھا کہ بے نظیر بھٹو جذبات میں آ کر ان کا بائیکاٹ کر دیں گے، تاہم ان خدشات کے برعکس انہوں نے فوجی آمر کے لیے میدان خالی دینے سے انکار کر دیا اور بھرپور طریقے سے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا۔ بلدیاتی انتخابات میں عوام دوست کے نام سے پیپلز پارٹی کے امیدوار کامیاب ہوئے۔ 1985ء میں غیر جماعتی انتخابات کا بائیکاٹ چوں کہ ایم آر ڈی کے پلیٹ فورم سے ہوا تھا، اس لیے بطور ایک ممبر کے پیپلز پارٹی کو بھی بائیکاٹ کرنا پڑا۔ بے نظیر بھٹو کی سیاسی پالیسیوں کے ناقدین ان کے پہلے دور حکومت پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے اسٹیبلشمنٹ اور فوج کی طرف سے دیئے جانے والے مشروط اقتدار کو قبول کیا۔ اگر ملکی اور عالمی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اس چیز کا تجزیہ کیا جائے تو محترمہ کا یہ فیصلہ ہمیں درست اور حقیقت پر مبنی نظر آئے گا۔ بے نظیر کی پہلی حکومت کے بارے میں آئن ٹالبوٹ کہتے ہیں: "بے نظیر بھٹو کی لیڈر شپ کا تنقیدی جائزہ لیتے وقت ان مشکلات کو پیش نظر رکھنا چاہیے، جن کا انہیں سامنا تھا۔ ان مشکلات میں سب سے اہم ضیاء دور کے بعد کی فوج اور خفیہ ایجنسیوں کی سیاست میں محفوظ اور گہری وابستگی تھی۔"

محترمہ کو اس بات کا اچھی طرح ادراک تھا کہ فوج اور اسٹیبلشمنٹ میں موجود ضیاء باقیات انہیں کسی بھی صورت وزیر اعظم دیکھنا نہیں چاہتی۔ ان باقیات نے انتخابات سے پہلے اور دوران انتخاب کوشش کی کہ پیپلز پارٹی دو تہائی اکثریت کی بجائے صرف سادہ اکثریت سے کامیاب ہو، تاکہ وہ آٹھویں ترمیم ختم نہ کر سکے اور آٹھویں ترمیم کا استعمال کرنے والے صدر غلام اسحٰق خان کو بدستور صدر رکھا گیا، جو فوج اور اسٹیبلشمنٹ کے نمائندے تھے۔ بے نظیر بھٹو اچھی طرح جانتی تھی کہ آرٹیکل 58(2)(b) کو ختم کیے بغیر وہ اپنی پالیسیوں پر آزادانہ طور پر عمل درآمد نہیں کروا سکتیں۔ ان کی کوشش تھی کہ حزب اختلاف اس ترمیم کو ختم کرانے میں ان کا ساتھ دے مگر حزب اختلاف خود اسٹیبلشمنٹ کی پیداوار تھی۔ چنانچہ بجائے اس کے آٹھویں ترمیم ختم کرنے میں وہ بے نظیر بھٹو کے ہاتھ مضبوط کرتی، ان کی طرف سے اکتوبر 1989ء میں بے نظیر حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد پیش کر دی گئی۔ تاہم کروڑوں روپے خرچ کرنے کے باوجود حزب اختلاف کو ناکامی کو منہ دیکھنا پڑا۔ اگرچہ بے نظیر نے اپنی سیاسی فہم و فراست اور ذہانت سے تحریک عدم اعتماد کو ناکام بنا دیا لیکن وہ 16 اگست 1990ء کو غلام اسحٰق خان کی طرف سے چلائی جانے والی 50(2)(b) کی تلوار سے اپنی گردن نہ بچا سکیں اور 9 ماہ کی مختصر مدت میں ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا۔

یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت کے خاتمے میں فوج، اسٹیبلشمنٹ کے علاوہ اسامہ بن لادن کے 10 ملین ڈالر کا بھی نمایاں ہاتھ تھا، جس نے آٹھویں ترمیم کو متحرک کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ اقتدار میں نو وارد اس باہمت خاتون نے ان سازشوں کے باوجود اپنی پوری توجہ عوام کی بھلائی اور خارجہ پالیسی پر مرکوز رکھی۔ بے نظیر بھٹو یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ جب تک بھارت سے بہتر تعلقات استوار نہیں ہوں گے تب تک پاکستان کی فوج انہیں دفاعی اخراجات میں کمی کرنے نہیں دے گی اور بغیر دفاعی اخراجات کم کیے عوامی مفادات کی پالیسیوں پر عمل درآمد کرانا مشکل تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے پہلے دور حکومت میں ہی بھارت سے بہتر تعلقات استوار کرنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے بھارت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی کو پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ راجیو گاندھی دسمبر 1988ء اور جولائی 1989ء میں

پاکستان تشریف لائے۔ بے نظیر اور راجیو دونوں نوجوان اور نئی نسل کے نمائندہ اور سیاسی رہنما تھے۔ دونوں رہنما پرانی دشمنیوں کو بھلا کر نئے دور کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح دونوں ممالک نے ایک دوسرے کی ایٹمی تنصیبات پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ کیا اور سیاچین گلیشیر کے بارے میں بھارت نے مثبت ردعمل کا اظہار کیا۔ پاکستان اور بھٹو خاندان کے مشترکہ دشمنوں سے یہ خیر سگالی دیکھی نہ گئی اور خفیہ ایجنسیوں نے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ بے نظیر بھٹو اعتماد کے قابل نہیں رہیں۔ ایجنسیوں کی پیداوار سیاسی جماعتیں بے نظیر بھٹو کو تواتر کے ساتھ سیکیورٹی رسک کہنے لگیں۔

عالمی سیاست پر بے نظیر بھٹو کی گہری نظر تھی۔ راجیو گاندھی کے قتل پر انہوں نے عالمی میڈیا کو بیان دیتے ہوئے کہا، ''راجیو گاندھی نیو ورلڈ آرڈر کا پہلا شکار ہے۔'' پاکستان میں بھٹو خاندان اور بھارت میں نہرو خاندان سام راجی قوتوں کے مفادات کی راہ میں رکاوٹ سمجھے جاتے ہیں۔ امریکہ کے صدر بش سینئر کی طرف سے نیو ورلڈ آرڈر جاری ہوا جس کا مقصد تیسری دنیا کے وسائل پر قبضہ جمانا تھا۔ راجیو گاندھی کی حکومت بھارت میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کی لوٹ کھسوٹ کی راہ میں اہم رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ وقت نے بے نظیر بھٹو کی اس بات کو سچ ثابت کیا۔ راجیو گاندھی کی حکومت کے خاتمے کے بعد بڑی تیزی سے ملٹی نیشنل کمپنیوں نے اپنا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ بے نظیر بھٹو نے اپنی دوسری ٹرم کے دوران اپنا رویہ محتاط رکھا اور سول ملٹری بیوروکریسی سے الجھنے سے بچتی رہیں۔ انہوں نے اپنی پوری توجہ معاشی اور سماجی مسائل پر مرکوز رکھی اور عالمی سطح پر پاکستان کو نہ صرف دہشت گرد ریاست ڈیکلیئر ہونے کے خطرے سے باہر نکالا بلکہ پاکستان کے میزائل پروگرام کی بنیاد بھی رکھی۔ امریکہ نے پاکستان پر عائد پابندیاں نرم کر دیں۔ براؤن ترمیم منظور ہوئی، جس کے تحت پاکستان کو امریکہ کی جانب سے مالی اور فوجی امداد ملنا شروع ہو گئی۔ بے نظیر بھٹو نے امریکہ میں پاکستان کے منجمد اثاثے واگزار کروائے اور 1995ء میں امریکہ کا کامیاب دورہ کیا جس کے باعث پاکستان کو 368 ملین ڈالر کا امریکہ اسلحہ خریدنے کی اجازت مل گئی، جس پر 1990ء میں پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

30 ستمبر 1996ء کو بے نظیر کے بھائی اور ذوالفقار علی بھٹو کے بڑے صاحب زادے میر مرتضیٰ بھٹو کو 70 کلفٹن کے سامنے پراسرار انداز میں قتل کر دیا گیا۔ بے نظیر نے اپنے بھائی کے قتل کو اپنی حکومت کے خلاف سازش قرار دیا جس میں ایم آئی اور صدر فاروق لغاری کے ملوث ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ 5 نومبر 1996ء کو صدر فاروق لغاری نے بے نظیر حکومت پر کرپشن اور آئین کی خلاف ورزی کے جھوٹے الزامات لگا کر ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ بے نظیر کے مخالفین ان کی کرپشن اور ناتجربہ کاری کے زمرے میں دلیل دیتے ہوئے فاروق لغاری کو گھر کی گواہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ حالانکہ سابق صدر فاروق لغاری کے لگائے جانے والے کرپشن کے الزامات بے نظیر کی موت تک کسی بھی عدالت میں ثابت نہیں ہو سکے۔ ان الزامات کی نوعیت ایسی ہی تھی جیسا کہ بھٹو کو قتل کے جھوٹے مقدمہ میں پھانسی کا دیا جانا۔ رہی فاروق احمد لغاری پر اعتماد کے معاملے میں دھوکا کھانے کی بات ہے تو ہمیں پاکستان میں موجود خفیہ ایجنسیوں کے کردار کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، جن کا نیٹ ورک اس قدر مضبوط ہے کہ اچھے سے اچھا سیاست داں بھی ساتھیوں کے معاملے میں دھوکا کھا جاتا ہے۔ بھٹو جیسے ذہین سیاست دان نے بھی نہ جانے کتنے سانپ اپنی آستینوں میں پال رکھے تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ عالمی سیاست میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات قومی سیاست پر بھی پڑتے ہیں۔ نائن الیون کے واقعے نے عالمی

سیاست پر بڑے دور رس اثرات مرتب کیے اور اس کے اثرات بہت سے ممالک کی اندرونی سیاست پر محسوس کیے جانے لگے۔ اس واقعے کے اثرات بالواسطہ طور پر پاکستانی ایسٹ پر اثر انداز ہوئے اور جنرل مشرف کی غیر قانونی حکومت کو قانونی جواز فراہم کر گئے۔ بے نظیر بھٹو نے جنرل مشرف کی حکومت کا تمام عرصہ خود اختیار کردہ جلاوطنی میں گزارا لیکن اس کے باوجود ان کی نظریں پاکستان کی خارجہ اور داخلی سیاست پر مرکوز رہیں۔ جنرل مشرف کا دورۂ آگرہ ناکام ترین دورہ ثابت ہوا۔ اس دورے میں جنرل مشرف نے جلد بازی کا مظاہرہ کیا اور کسی سمجھوتے پر پہنچے بغیر پاکستان واپس آ گئے۔ بے نظیر بھٹو نے اس دورے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا، "اگر جنرل مشرف کو اچھا مشورہ دیا جاتا تو وہ مزید ایک روز وہاں قیام کرتے اور بھارت کے صبر کا اپنے تحمل کے ساتھ موازنہ کرتے۔ دوسروں کو تھکا دینا ایک ابتدائی ڈپلومیٹک حربہ ہے۔ اس کے برعکس جنرل مشرف طیش میں آ کر خود واپس چلے آئے۔" بے نظیر کے اس بیان کی صداقت بعد میں ظاہر ہوئی اور جنرل مشرف کے اس دورے کی ناکامی ان کی جلد بازی کا نتیجہ ثابت ہوئی۔ واضح رہے کہ سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو اور بھارت کی سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے درمیان ہونے والا شملہ معاہدہ مذاکرات ختم ہونے کے عین آخری وقت پر طے پایا تھا۔ چونکہ بھٹو ایک عوامی رہنما اور سیاست داں تھے اس لیے وہ سفارت کاری کے فن سے بہ خوبی آشنا تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ مراحل کتنے صبر آزما ہوتے ہیں۔ ایک جنرل سفارت کاری کے آداب اور سیاسی داؤ پیچ سے نابلد ہوتا ہے، اس لیے آگرہ مذاکرات سے جنرل مشرف کو خالی ہاتھ واپس آنا پڑا۔

بے نظیر بھٹو انتہا پسندی کا مقابلہ کرنے کے لیے جمہوریت کو ناگزیر قرار دیتی تھیں۔ انہوں نے متعدد مواقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کوئی فوجی آمر کسی بھی طرح انتہا پسندی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انتہا پسندی صرف جمہوری طریقے سے سیاسی جماعتیں ہی ختم کر سکتی ہیں۔ بے نظیر بھٹو کے بقول، "پاکستان میں بھی بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ انتہا پسندی کو شکست دے سکتے ہیں۔ ایک ایسی فوجی حکومت (جنرل مشرف کی حکومت) پر انحصار کرنا جسے شدت پسندوں کی حمایت حاصل ہو، ایسے ہی ہے جیسے کسی آتش زن کو آگ بجھانے کی ذمے داری سونپ دی جائے۔" بے نظیر بھٹو کی یہ سیاسی سوچ کس حد تک درست تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنرل مشرف چونکہ خود چور دروازے سے اقتدار میں آئے ہیں اس لیے عوام ان سے نالاں ہیں۔

فوجی آمر میں سیاسی تدبر کی کمی ہوتی ہے اس لیے وہ ڈائیلاگ کی بجائے بندوق کی گولی پر زیادہ بھروسا کرتا ہے، جس سے مسائل سلجھنے کی بجائے اور زیادہ الجھ جاتے ہیں۔ جنرل مشرف نہ صرف انتہا پسندی کے خلاف لڑی جانے والی اس جنگ میں ہار چکے ہیں بلکہ ان کی انتہا پسندانہ کارروائیں نے مزاحمت کے نئے محاذ کھول دیئے ہیں، جنہیں بند کرنا ان کے بس سے باہر نظر آتا ہے۔ وزیرستان میں انتہا پسندوں سے لڑتے لڑتے انہوں نے بلوچستان کا محاذ بھی کھول دیا۔ بے نظیر بھٹو نے اپنی وفات سے چند روز پہلے کہا تھا کہ پیپلز پارٹی اقتدار میں آنے کے بعد بلوچستان کی محرومیاں پہلی فرصت میں دور کرے گے اور بلوچستان کے وسائل سے بلوچوں کو استفادہ کا حق دیا جائے گا۔ ان کی وفات کے بعد بلوچستان کا مسئلہ اور بھیانک شکل میں سامنے آ سکتا ہے۔ بے نظیر بھٹو کے بہت سے سیاسی بیانات ایسے تھے جو اپنے اندر گہرائی رکھتے تھے۔ ان کے مخالفین ان بیانات کو توڑ مروڑ کر پیش کر کے عوام کو گمراہ کرتے رہے۔ اس نیک کام میں ہمارا وہ نام نہاد اور حکومتی وظیفے پر پلنے والا دانش ور طبقہ بھی پیش پیش رہا جو اگرچہ

ان بیانات کی گہرائی کو اچھی طرح سمجھتا تھا مگر نمک حلالی کے جنوں میں ان بیانات کو غلط معنی پہنانے پر کمربستہ رہا۔ ان بیانات میں محترمہ کا ایک اہم بیان ''اقتدار میں آنے کے بعد مغرب کو ڈاکٹر قدیر تک رسائی دینا'' بھی شامل تھا۔ اس بیان پر ان کے مخالفین نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھالیا کہ بے نظیر پاکستان کے ایٹمی سائنس داں کو مغرب کے حوالے کرنے کی بات کر رہی ہے۔ حالانکہ بے نظیر بھٹو کے اس بیان کا اصل مقصد ڈاکٹر قدیر کو ایجنسیوں کی قید سے چھڑا کر مغربی میڈیا کے سامنے پیش کرنا تھا تاکہ وہ اپنی بے گناہی ثابت کر سکیں اور اپنے دامن پر لگے جھوٹے الزامات کے داغ دھو سکیں۔ جنرل مشرف کی وردی اتارنے کے پیچھے بھی ان کے سیاسی تدبر کا بڑا ہاتھ ہے۔ اپنی موت سے چند سال پہلے ہی انہوں نے کہہ رکھا تھا کہ جنرل مشرف کو ایک روز میرے پاس آنا پڑے گا۔ اپنی جلاوطنی کے دوران بھی انہوں نے پاکستان کی سیاست پر جمود طاری نہ ہونے دیا اور اے آر ڈی کی بنیاد رکھی۔

بے نظیر بھٹو کی مذہبی سیاسی جماعتوں سے بے زاری اور بے اعتمادی ذاتی عناد پر نہیں تھی، بلکہ وہ ان کی منافقانہ پالیسیوں کا اچھی طرح ادراک رکھتی تھیں۔ بے نظیر انہیں فوج کی بی ٹیم کے نام سے پکارا کرتی تھی۔ جس کا ثبوت اس وقت سامنے آیا جب پاکستانی عوام نے سترہویں ترمیم میں انہیں فوجی آمر کا ساتھ دیتے ہوئے دیکھا اور فوجی آمریت میں ایک صوبے میں حکومت اور دوسرے صوبے میں شراکت اقتدار کے مزے لوٹتے دیکھا۔ وزیرستان اور لال مسجد کے واقعات پر بھی یہ مذہبی جماعتیں استعفے دینے سے گریزاں رہیں۔

بے نظیر بھٹو کی سیاست ہر قسم کی منافقت سے پاک تھی۔ وہ سیاست میں جلد بازی کی قائل کبھی نہیں رہیں۔ وہ ہر چیز کو عالمی سیاست اور ملکی حالات کے تناظر میں دیکھنے کی قائل تھیں۔ جنرل مشرف سے قومی مفاہمت سے فائدہ بھی انہی لوگوں نے اٹھایا۔ بے نظیر بھٹو کی اس مفاہمت کی پالیسی سے انتخابات کی راہیں ہموار ہوئیں، نواز شریف کو پاکستان آنا نصیب ہوا اور جنرل مشرف وردی اتارنے پر مجبور ہوئے۔ قومی مفاہمت سے صرف پیپلز پارٹی پر بنائے جانے والے جھوٹے مقدمات ہی ختم نہیں ہوتے تھے بلکہ اس کا فائدہ دیگر سیاسی جماعتوں کو بھی پہنچا۔ چیف جسٹس کی بحالی کی تحریک میں اگرچہ وکلاء برادری کا بہت بڑا ہاتھ تھا لیکن ان وکلاء کی رہنمائی کرنا انہیں ایک منظم انداز میں متحرک کرنا جلسوں اور احتجاجی ریلیوں کا انعقاد کرنا ایک سیاسی جماعت ہی کے بس کا روگ تھا اور وہ سیاسی جماعت بلاشبہ پیپلز پارٹی ہی تھی۔ اس تحریک میں پیپلز پارٹی سے وابستہ وکیلوں اور رہنماؤں کے کردار کو کسی بھی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بے نظیر بھٹو نے آخری دم تک جنرل مشرف کو وردی میں قبول نہ کیا۔ صدارتی انتخابات کے موقع پر پیپلز پارٹی کے اراکین بائیکاٹ کرتے ہوئے ایوان سے باہر چلے گئے۔ جنرل مشرف نے سیاسی مذہبی جماعتوں کے ذریعے بے نظیر بھٹو کو دھوکا دینے کی بہت کوششیں کیں۔ یہ مذہبی جماعتیں انہیں اکساتی رہیں کہ وہ اسمبلیوں سے استعفے دے دیں۔ پیپلز پارٹی نے اپنے استعفے صوبہ سرحد اور بلوچستان کی حکومتوں سے علیحدگی سے مشروط کر کے انہیں الجھن میں ڈالے رکھا۔ بے نظیر بھٹو کی یہ خواہش تھی کہ آمریت کے خلاف اس جنگ میں مذہبی جماعتوں کو دور رکھا جائے لیکن نواز شریف ان کی باتوں کی تہ تک نہ پہنچ سکے اور انہوں نے جذبات میں آکر اے آر ڈی کے مقابلے میں اے پی ایم ڈی کی بنیاد رکھی دی۔ بعد ازاں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ انہوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کے بعد اس میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا جس کی وجہ سے انہیں اے پی ڈی ایم سے

جدا ہونا پڑا۔

بے نظیر کی سیاسی فہم و فراست کے طفیل ایک فوجی آمر بغیر کسی خونیں انقلاب کے انتخابات کے لیے راضی ہوا۔ اس موقع پر مذہبی جماعتوں نے اپنا آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے جنرل مشرف کے خلاف بڑی مزاحمتی تحریک چلانے کا اعلان کرتے ہوئے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ ان مذہبی جماعتوں کا مقصد انتخابی عمل کو سبوتاژ کرتے ہوئے ملک کے حالت کو مزید خراب کرنا تھا تاکہ سیاسی حالت خراب کر کے ملک کو ایک بار پھر مارشل لاء کی طرف دھکیلا جا سکے۔ ان عاقبت نااندیشوں کے ارادوں کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ اور ان عناصر کے ارادے عوام سے بھی چھپے نہیں رہے اس لیے عوام ان کے جھانسے میں آنے کے بجائے پوری طرح انتخابی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اس عالم مین 27 دسمبر کو راولپنڈی میں وہ قومی سانحہ رونما ہو گیا، جس نے برسوں کی محنت پر پانی پھیر دیا۔ دہشت گردوں کی فائرنگ کا نشانہ بن کر کروڑوں سوگواروں کو روتا چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔

تعصب اور دشمنی کی عینک اتار کر کوئی بھی مؤرخ پاکستان کی سیاسی تاریخ لکھنے بیٹھے گا تو اسے بے نظیر بھٹو کو سیاست کے اونچے مقام پر فائز کیے بغیر چھٹکارا نہیں ہوگا۔ وگرنہ پاکستان میں بونوں کی کمی کبھی نہیں رہی۔ یہ کہنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کی جانی چاہیے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی طرح بے نظیر بھٹو کی شخصیت بھی ایک کرشماتی شخصیت میں ڈھل چکی ہے۔

(روزنامہ ''سنڈے ایکسپریس'' 6 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

کیا محترمہ بینظیر بھٹو کسی ناول کا موضوع بن سکتی ہیں؟

نسیم شاہد

محترمہ بے نظیر بھٹو شہادت کا رتبہ پانے کے بعد ایک افسانوی کردار کی شکل اختیار کر گئی ہیں۔ ان کی موت ایک ایسی خبر تھی، جو ہر دل میں نشتر بن کر اتر گئی اور اس کی کسک بہت دنوں تک پیچھا کرتی رہی۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا محترمہ بے نظیر بھٹو کسی بڑے ناول کا موضوع بن سکتی ہیں؟ میں اس پر جتنا غور کرتا ہوں، اتنا ہی لگتا ہے کہ محترمہ کی زندگی کو اگر افسانوی رنگ دیا جائے، تو ایک ایسا ناول منصہ شہود پر آ سکتا ہے، جو پاکستانی عورت کی حالت زار کا آئینہ دار بھی ہو اور معاشرے کی تلخ و شیریں کیفیات کا عکاس بھی۔ جس میں دکھ بھی ہو اور خوشی بھی، جدوجہد بھی ہو اور اس جدوجہد کا ثمر بھی۔ جس میں عالمی ریشہ دوانیوں کا احوال بھی ہو اور ملکی سیاست کی منافقتوں کا بیان بھی۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شخصیت ایک دیومالائی رنگ اختیار کر لے گی۔ ان کی ظاہری خوبصورتی ایک ایسا ہیولا ہے کہ جو دیکھنے والی آنکھ کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ان کے خوبصورت نین نقش، روشن اور چمکتی آنکھیں، باوقار مسکراہٹ اور کھلا کھلا چہرہ، انہیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق ثابت کرتا ہے۔ اب اس عظیم اور بے نظیر سراپے کے ساتھ شہادت کا سابقہ بھی موجود ہے۔ ظاہر ہے جب ظاہری و باطنی خوبصورتی یکجا ہو جائے، تو غیر معمولی شخصیت جنم لیتی ہے۔ ہمارے ہاں شخصیات پر ناول نگاری کا کچھ اتنا رجحان نہیں رہا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تخلیق کار کسی بھی شخصیت کو اون (Own) کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی شخصیت غیر متنازعہ نہیں ہوتی اس کے چاہنے والے ہوتے ہیں تو نفرت کرنے والے بھی ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ تاہم ہر بڑی شخصیت ایسی نہیں ہوتی، جسے کسی تخلیقی کتاب کا موضوع بنایا جائے۔ سوانح عمری تو ہر بڑی شخصیت کی چھپتی ہے، لیکن بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں، جن کی زندگی افسانوی انداز سے گزرتی ہے اور ان کی موت بھی ڈرامائی ہوتی ہے، محترمہ بے نظیر بھٹو ایک ایسی ہی شخصیت ہیں، ان کی زندگی پر جتنا غور کیا جائے، اس کی اتنی ہی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔

انہوں نے اپنے عظیم والد کے ہمراہ زندگی کے بہت سے پیچ و خم دیکھے۔ بڑے بڑے لوگوں سے ملیں۔ دنیا کا رنگ ڈھنگ بدل دینے والے عالمی رہنماؤں کو قریب سے دیکھا، ان کی باتیں سنیں اور ان کے دست شفقت کو اپنے سر پر محسوس کیا۔ ابھی وہ طالبہ تھیں کہ ایک ایسے سانحے سے دوچار ہوئیں، جو بڑے بڑوں کے حوصلے پست کر دیتا ہے۔ ان کے عظیم باپ کو ایک ایسے مقدمے میں ملوث کر کے جیل کی کال کوٹھری میں ڈالا گیا، جس کی بنیاد ہی مشکوک تھی۔ پھر وہ دن بھی آیا، جب انہوں نے اپنی ماں کے ہمراہ اپنے باپ سے آخری ملاقات کی۔ پھانسی پانے والوں سے ان کے عزیز و اقارب کی آخری ملاقات کیسی قیامت ڈھاتی ہے، اس کا اندازہ صرف وہی کر سکتے ہیں، جو بدقسمتی سے اس اذیت ناک صورتحال سے

گزرے ہوں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اس صدمے سے بھی کڑے دل کے ساتھ گذریں۔ اور وہ لمحے بھی دیکھے جب بوٹوں اور بندوقوں کے سخت پہرے میں ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو کو خاموشی سے دفن کر دیا گیا۔ بظاہر یہ سارے واقعات افسانوی لگتے ہیں، مگر یہ حقیقت بن کر محترمہ کی زندگی میں نمودار ہوئے۔ پھر ایک اور سانحہ بھی رونما ہوا، جب ان کا ایک پیارا بھائی پردیس میں زندگی کی بازی ہار گیا۔

غم و آلام کا تسلسل اس وقت منقطع ہوا، جب ان کی 1987ء میں آصف علی زرداری سے شادی ہوئی۔ یہ واقعہ بذات خود ایک افسانوی رنگ لئے ہوئے ہے۔ کہاں آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی بے نظیر بھٹو اور کہاں کراچی میں بسنے والا آصف علی زرداری، مگر وہ مشرقی بیٹیوں کی طرح اپنے نئے سفر پر روانہ ہوئیں۔ شادی کے ایک سال بعد وہ اقتدار میں آئیں مگر سب خوشیاں عارضی ثابت ہوتی رہیں۔ صرف ڈیڑھ برس کے بعد اقتدار چھن گیا اور آزمائشیں مقدر بن گئیں، لیکن ان کا سفر جاری رہا۔ وہ دوبارہ اقتدار میں آئیں، یہ خوشی بھی اپنے ساتھ دکھ لے کر آئی، ان کے بھائی کو ان کے عہد حکمرانی میں کراچی شہر کی کلفٹن جیسی بارونق سڑک پر قتل کر دیا گیا۔ ستم ظریفی یہ کہ الزام لگانے والوں نے ان پر اپنے ہی بھائی کے قتل کی سازش کا الزام بھی دھر دیا۔ غم اور دکھ کی یہ گھڑیاں اس وقت دو چند ہو گئیں، جب ایک بار پھر ان کی حکومت ختم کر دی گئی اور شوہر کو پابند سلاسل کر دیا گیا۔ پھر ایک لمبی جدائی، مقدر بن گئی۔ بیس سالہ ازدواجی زندگی میں دس سال تو شوہر سے دوری میں گزر گئے۔ مگر اس کے باوجود افسانوی کردار نے ہمت نہیں ہاری۔ جدوجہد بھی جاری رہی اور اپنے والد کے مشن کو آگے بڑھانے کی خواہش بھی کم نہ ہوئی۔

تب اس کی کہانی کا کلائمیکس آیا 18 اکتوبر 2007ء کو وہ دبئی سے مقتل کی طرف روانہ ہوئیں۔ انہیں سفر کی سنگینی کا بخوبی علم تھا۔ اسی لئے آنے سے پہلے انہوں نے اپنی وصیت لکھ دی۔ ایک پر آسائش زندگی، پیار کرنے والے بچے اور اربوں روپے کی جائیداد کو پیچھے چھوڑ کر وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے آگے بڑھیں وہ عوام سے دور نہیں رہنا چاہتی تھیں، وہ اپنی زمین سے بچھڑ کر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھیں، یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے کراچی ائیر پورٹ پر قدم رکھا، تو بے اختیار ان کے آنسو نکل آئے، خوشی کے آنسو، انہیں کیا معلوم تھا کہ یہی خوشی کے آنسو چند ہفتوں بعد کروڑوں پاکستانیوں کے لئے غم کے آنسوؤں میں ڈھل جائیں گے۔ وہ فاتحانہ شان سے آئیں اور زندگی سے آگے نکل گئیں۔ شاید انہی کے بارے میں شکیب جلالی نے کہا تھا۔

فصل جسم پر تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدود وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

54 سال کی زندگی میں اس قدر مد و جزر، اس قدر تنوع، اس قدر حیرتیں اور اس قدر سنسنی، کیا اس زندگی پر ایک بڑا ناول تخلیق نہیں ہو سکتا، میرا جواب اثبات میں ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ناول کی تخلیق کا بیڑہ کون اٹھاتا ہے۔

لیہ سے سلیم اختر ندیم نے ایک نظم بھیجی ہے، جس کے تین شعر نذر قارئین ہیں۔

تو وہ شہید ہے اے بے نظیر تیری قسم
کہ موت آپ ہے خود سوگوار تیرے بعد

رہے گا راج سدا تیرا "دختر مشرق"
انہیں کے تیرے علم بے شمار تیرے بعد
کسی بھی چہرے پہ رونق نظر نہیں آتی
اجڑ گئی ہے وطن کی بہار تیرے بعد

(ہفت روزہ "زندگی" 6 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

یہ کس کا لہو ہے؟ کون مرا؟ اے رہبر ملک وقوم بتا؟

طارق اسمٰعیل ساگر

بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد پاکستان کے ہر قابل ذکر شہر میں ہنگامے پھوٹ پڑے ہیں اپنے باپ کی لاڈلی ''پنکی'' اور میدان سیاست کی شہسوار محترمہ بے نظیر بھٹو کا شمار دنیا کی ذہین ترین خواتین میں ہوتا تھا وہ شاندار تعلیمی کیریئر کی حامل تھیں ان کی مختصر زندگی کے 30 سال قید و بند، جبر واستبداد اور گردش حالات کی نذر ہو گئے۔ اپنے باپ، دو بھائیوں کی ناگہانی موت، والدہ کی ناقابل علاج بیماری اور بے پناہ پریشر اور دھمکیوں کے باوجود میدان سیاست میں ڈٹی رہنے والی بے نظیر بھٹو نے زندگی کے حالات کے آگے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ وہ آخری لمحات تک ڈٹی رہیں، ان کے ہمدردانہیں مشورہ دیتے رہے کہ وہ اس طرح بے دھڑک عوام میں نہ جائیں ان کی زندگی کو خطرات لاحق ہیں لیکن انہوں نے کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کیا۔ آخری لمحات میں بھی وہ کارکا شیشہ اتار کر کارکنوں کے نعروں کا جواب دے رہی تھیں جب قاتل کو موقع مل گیا اور کھڑکی کے راستے اس بے رحم نے گولیاں محترمہ بے نظیر بھٹو کے سر اور سینے میں منتقل کر دیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بے نظیر بھٹو اپنے خاندان کی تیسری فرد ہیں جن کی زندگی سیاست کی بھینٹ چڑھی ہے وہ اور ان کے بھائی میر مرتضیٰ بھٹو اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سیاست میں آئے تھے اور یہی ان سب کی موت کی وجہ بنی۔ ان کے والد کو جنرل ضیاء الحق نے 1979ء میں پھانسی پر چڑھایا تھا اس کے بعد ان کے بھائی مرتضیٰ بھٹو کو 1996ء میں ان ہی کے دور حکومت میں گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا اور جمعرات کو بے نظیر بھٹو کو لیاقت باغ راولپنڈی میں شہید کر دیا گیا۔ قبل ازیں ان کے انتہائی پیارے چھوٹے بھائی شاہ نواز بھٹو بھی 1985ء میں جنرل ضیاء کے دور میں فرانس کے دارالحکومت پیرس میں اپنی قیام گاہ پر مردہ پائے گئے تھے۔ بھٹو خاندان کا الزام تھا کہ انہیں زہر دے کر قتل کیا گیا۔ اس ضمن میں بہت سی باتیں وقتاً فوقتاً سامنے آتی رہیں جن میں اس دور کی حکومت کو اس کا ذمہ دار قرار دیا گیا۔ بھارت کے نہرو، گاندھی خاندان کی طرح پاکستان کا بھٹو خاندان دنیا کے طاقتور ترین سیاسی خاندانوں میں سے ایک ہے۔ بے نظیر بھٹو کے والد ذوالفقار علی بھٹو 70 کے عشرے میں ملک کے وزیراعظم تھے اپنی جادوئی شخصیت کی وجہ سے وہ پاکستانی عوام میں بے حد مقبول تھے اور آج بھی ان کا دور حکومت متنازعہ ہونے کے باوجود یادگار ہے۔ بے نظیر بھٹو دو بار پاکستان کی وزیراعظم بنیں۔ پہلے 1988ء میں اور پھر 1993ء میں لیکن دونوں مرتبہ ان کی حکومت کو ڈھائی سال سے زیادہ نہیں چلنے دیا گیا اور کرپشن کے الزام کے تحت برطرف کر دیا گیا۔ 1988ء میں پہلی بار وزیراعظم بننے کے بعد ان کا شمار دنیا کی چند مقبول ترین خواتین رہنماؤں میں ہونے لگا تھا اور برسر اقتدار آنے کے بعد انہوں نے خود کو مردانہ حاکمیت کی حامل پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے مقابلے میں ایک کامیاب سیاستدان کے طور پر پیش کیا تھا۔ لیکن دوسری مرتبہ اقتدار سے نکالے جانے کے بعد بے نظیر بھٹو کے اقتدار کو ان کے مخالفین کرپشن اور بے ضابطگیوں کی حکمرانی سے تعبیر کرتے تھے۔ بے نظیر بھٹو نے 1953ء میں صوبہ

سندھ میں جنم لیا اور اس کے بعد ہارورڈ اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سیاستدان نہیں بننا چاہتی تھی لیکن اپنے والد کی موت کے سات سالوں بعد جب انہوں نے پاکستانی سیاست میں قدم رکھا تو انہیں اپنے والد کی عوامی مقبولیت کا فائدہ پہنچا۔ جس ثابت قدمی اور ہمت کے لئے بے نظیر بھٹو شہرت رکھتی تھیں وہ سب سے پہلے اس وقت دیکھی گئی جب ان کے والد کو جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کر کے 77ء میں جیل میں ڈال دیا تھا اور ان پر قتل کا مقدمہ بنایا تھا جس کے دو سال بعد انہیں سزائے موت دے دی گئی۔ جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے بے نظیر کو ان کے والد کی موت سے پہلے قید کر دیا تھا اور انہوں نے جیل میں اپنا زیادہ تر وقت قید تنہائی میں گزارا بے نظیر بھٹو نے قید کے حالات کو سخت ترین قرار دیا تھا۔ علاج کی غرض سے جیل سے رہائی کے بعد انہوں نے لندن میں پیپلز پارٹی کا دفتر قائم کیا اور جنرل ضیاء الحق کے خلاف مہم شروع کی۔ 1986ء میں پاکستان واپس گئیں جہاں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔

1988ء میں فوجی طیارے کے حادثے میں جنرل ضیاء الحق کی موت کے بعد وہ کسی اسلامی ملک میں جمہوری طور پر منتخب ہونے والی پہلی وزیر اعظم تھیں۔ لیکن 20 ماہ بعد ہی جنرل ضیاء الحق کے قریبی ساتھی صدر اسحاق خان نے ان پر کرپشن کے الزامات لگا کر ان کی حکومت ختم کر دی۔ بے نظیر بھٹو کے دونوں ادوار حکومت میں ان کے شوہر آصف علی زرداری کی حیثیت متنازعہ رہی اور ان پر بعد میں آنے والی حکومتوں نے مالی بدعنوانیوں میں ملوث ہونے کا الزام لگایا۔ بعض لوگوں نے یہ بھی الزام دیا کہ ان کی مبینہ مالی بدعنوانیاں بے نظیر بھٹو کو کرپشن کے کم سے کم پانچ مقدمات کا سامنا کرنا پڑا لیکن کسی بھی مقدمے میں انہیں سزا نہیں ہوئی اور اس سال اکتوبر میں انہیں قومی مصالحتی آرڈیننس کے تحت ان الزامات سے بری کر دیا گیا جو حکومت پاکستان کی طرف سے ان پر لگائے گئے۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے اور اپنے شوہر کے اوپر لگنے والے کرپشن کے الزامات کی ہمیشہ تردید کی اور انہیں ان کی کردار کشی کی سیاسی کوششیں قرار دیا۔ بے نظیر بھٹو 1999ء میں پاکستان سے باہر چلی گئیں تھیں اور آٹھ سال خود ساختہ جلاوطنی میں گزارے جس کے دوران وہ دبئی میں آٹھ سالوں تک اپنے تین بچوں کے ساتھ رہیں۔ خود ساختہ جلاوطنی کے دوران انہوں نے مغربی ممالک کے دارالحکومتوں کے دورے کیے اور وہاں کے مختلف اداروں میں لیکچرز دیتی رہیں۔ انہوں نے ملکی صورتحال سے کبھی خود کو الگ نہیں کیا اور مسلسل اپنی باعزت واپسی کے لئے کوشاں رہیں۔ بے نظیر بھٹو خود ساختہ جلاوطنی ختم کر کے 18 اکتوبر کو وطن واپس لوٹی تھیں۔ ان کی آمد سے قبل ملک کے فوجی صدر پرویز مشرف نے متنازعہ قومی مصالحتی آرڈیننس جاری کر کے ان کے خلاف قائم کرپشن کے مقدمات ختم کر دیئے تھے۔ یہ باور کیا جاتا ہے کہ پرویز مشرف کی فوجی حکومت انہیں انتہا پسندوں کے خلاف جنگ میں اپنا فطری اتحادی سمجھتی تھی۔ 18 اکتوبر کو بے نظیر بھٹو جب پاکستان واپس آئیں تو کراچی میں ان کی آمد پر ایک بار پھر انسانوں کے سمندر نے ان کا استقبال کیا لیکن ان کے جلوس پر خودکش حملہ ہوا جس میں وہ محفوظ رہیں۔ تاہم ڈیڑھ سو کے قریب لوگ مارے گئے اور پانچ سو سے زائد شدید زخمی ہوئے تھے۔ اس واقعے کے بعد انہوں نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہیں وطن واپس آنے سے پہلے اس خطرے کا علم تھا کہ ان پر حملہ ہو سکتا ہے لیکن وہ جمہوریت اور ملک کے عوام کی خاطر وطن واپس آئیں اور اب ان کا جینا مرنا پاکستانی عوام کے ساتھ ہوگا۔

اپنے والد کی طرح شعلہ بیان مقررہ بے نظیر بھٹو کو گو کہ اردو زبان پر مکمل عبور حاصل نہیں تھا لیکن ان کی اردو سننے کے لئے لوگ گوش بر آواز

رہتے تھے۔ وہ جب مجمع کے سامنے آتیں تو ہجوم کا جوش دو چند ہو جاتا۔ بے نظیر بھٹو اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی طرح بڑے جوش و خروش سے عوام سے خطاب کرتیں ان کے ہاتھوں کی مسلسل حرکت عوام کو بھی متحرک رکھتی اور ان کی تقریر اکثر عوامی نعروں کی گونج میں مقید رہتی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اپنے والد کی طرح وہ بھی طلسماتی شخصیت کی مالک تھیں۔ دنیا بھر کا میڈیا ان سے بات چیت کا منتظر رہتا۔

اس مرتبہ جب وہ پاکستان آئیں تو لندن کی اے پی سی کے بعد اے پی ڈی ایم کے قیام نے بظاہر ان کے اور میاں نواز شریف کے راستے الگ کر دیئے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر انہوں نے سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف میاں نواز شریف کو ہمیشہ اے آر ڈی کا حصہ قرار دیا بلکہ اس بات کی بھی تکرار کرتی رہیں کہ ایم ایم اے سے الحاق میاں نواز شریف کو کہیں کا نہ رکھے گا اس کا عملی ثبوت تب ملا جب مولانا فضل الرحمان نے اپنا روایتی سیاست کا مظاہرہ کرتے ہوئے پہلے صدارتی انتخابات کے موقعہ پر اے پی ڈی ایم کو چکر دیا پھر سب سے پہلے الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان بھی کر دیا۔ جس کے بعد میاں نواز شریف بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ مولانا فضل الرحمان نے انہیں دھوکہ دیا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اس حقیقت سے آگاہ تھیں کہ میاں نواز شریف ہی ایک ایسے لیڈر ہیں جو فوجی آمریت کے لئے چیلنج بن گئے ہیں اور جب تک وہ الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان نہیں کریں گے (ق) لیگ کے اقتدار کے خطرے کی تلوار ان کے سر پر لٹکتی رہے گی صرف میاں نواز شریف ہی ایک ایسی شخصیت تھے جو (ق) لیگ کے لیے چیلنج بن گئے تھے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے سندھ میں ان کے ساتھ کئی جگہ سیٹ ایڈجسٹمنٹ بھی کی تھی اور وہ اپنے متعدد جلسوں میں برملا یہ کہہ چکی تھیں کہ اگر مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی کو 60 فیصد ووٹ نہ ملے تو یہ سمجھا جائے گا کہ حکومت نے دھاندلی کی ہے۔ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی مل کر اتنی سیٹیں حاصل کر لیں گی کہ وہ اپنی حکومت بنا سکیں اور صدر جنرل (ر) پرویز مشرف کی ایمرجنسی کے دوران نافذ اقدامات جنہوں نے اب آئینی حیثیت اختیار کر لی ہے کو پارلیمنٹ کے ذریعے ختم کر سکیں گی۔ انہوں نے میاں نواز شریف کی طرف سے بائیکاٹ ختم کر کے الیکشن میں حصہ لینے کے فیصلے کا بھرپور خیر مقدم کیا تھا اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ میاں نواز شریف کو اس فیصلے تک پہنچنے میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی معاونت اور مشاورت حاصل تھی۔

بے نظیر بھٹو پاکستانی سیاست کی اہم ترین شخصیات میں سے ایک تھیں۔ اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کے بعد انہوں نے پارٹی کی باگ ڈور سنبھالی اور وہ اسلامی دنیا کی پہلی خاتون وزیر اعظم بن گئیں۔ وہ 1988ء سے 1990ء اور پھر 1993ء سے 1996ء کے عرصے میں اس منصب پر فائز رہیں۔ ان کے ادوار پر بدعنوانی کے الزامات لگائے گئے اور بعد ازاں انہوں نے ایسے حالات میں پاکستان چھوڑ دیا کہ ان پر کئی مقدمات قائم ہو گئے تھے۔ حالیہ برسوں میں مغربی ممالک نے ایک جمہوریت نواز رہنما کے طور پر ان کے کردار کو سراہا آٹھ سال جلاوطنی کاٹنے کے بعد 54 سالہ بے نظیر نے پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف کے ساتھ مفاہمت کی جس سے ان کی واپسی کی راہ ہموار ہو گئی۔ وہ اپنی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کی انتخابی مہم چلانے کے لئے اکتوبر میں اپنے مضبوط سیاسی گڑھ کراچی میں آئیں۔

بے نظیر بھٹو نے صدر مشرف کی طرف سے 3 نومبر کی ہنگامی حالات کے نفاذ پر شدید نکتہ چینی کی تھی۔ پاکستان کے سیکورٹی عہدے داروں

نے انہیں کئی بار ان کی زندگی کو لاحق خطرات سے خبردار کیا لیکن انہوں نے اس کے باوجود جنوری کے انتخابات میں اپنی پارٹی کی حمایت میں اضافہ کے لئے عوامی جلسے اور جلوس جاری رکھے۔ صدر جنرل پرویز مشرف اس بات پر شاکی رہتے تھے کہ بے نظیر بھٹو ان کے ساتھ طے شدہ معاملات سے ہٹ گئی ہیں جبکہ سیاسی مبصرین پہلے ہی سے یہ بات جانتے تھے کہ بے نظیر بھٹو کبھی اپنے مشن سے پیچھے نہیں ہٹیں گی اور وہ کبھی جنرل مشرف سے جمہوریت کے معاملات پر سودے بازی بھی نہیں کریں گی۔

بی بی سی کے مطابق پاکستان پیپلز پارٹی کا راولپنڈی کا جلسہ ریاستی جبر کی نذر ہونے کے بعد پارٹی کے رہنما بے نظیر بھٹو ابھی پنجاب میں اپنی سیاسی طاقت کا مظاہرہ تو نہیں کر پائیں لیکن اپنی نوسالہ جلاوطنی ختم کرنے کے بعد 18 اکتوبر کو پاکستان واپس آنے سے لے کر اب تک وہ بتدریج اپنی سیاست کی رفو گیری میں لگی ہیں۔ اس کوشش میں بے نظیر بھٹو کو ابھی تک خاطر خواہ کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ ان کی ان سیاسی کامیابیوں کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب کراچی میں ان کے استقبالیہ جلوس پر ہونے والے خودکش حملوں کے بعد پی پی کے ورکرز کی جانب سے کوئی پرتشدد جوابی کارروائی نہ ہوئی۔ یہ پاکستان پیپلز پارٹی کی غیر انتہا پسند اور نسبتاً پرامن سیاست کا واضح ثبوت تھا جسے جو بھی دیکھنا چاہتا درجنوں ٹی وی چینلز پر براہ راست دیکھ سکتا تھا۔ پی پی کا یہ روپ دیکھنے والوں کو اس وقت ماتھا ٹھنکا جب بے نظیر بھٹو قومی مفاہمی آرڈیننس کا سپریم کورٹ میں فیصلہ ہونے کے دوران اچانک دبئی روانہ ہو گئیں۔ کہا گیا کہ وہ مفاہمتی آرڈیننس کی راہ میں حائل قانونی رکاوٹوں کے دور ہونے تک شاید واپس نہ آئیں۔ لیکن ایمرجنسی کے نفاذ کے فوراً بعد پاکستان واپس آنا اور پھر اسلام آباد میں پی سی او کی غیر مشروط واپسی کے مطالبہ نے بھی ان کی محلاتی سازشوں میں الجھی سیاست کی مزید رفو گیری کی۔ راولپنڈی کا جلسہ ہونا نہ ہوا، 9 نومبر کو پوری دنیا کے میڈیا پر یہ جلسہ سب سے بڑی کہانی رہا۔ اسلام آباد میں اپنی سیاسی سرگرمیوں کے دوران وہ میڈیا پر چھائی رہیں لیکن صرف بیان بازی کی حد تک نہیں۔ انہوں نے آج صحافیوں کے احتجاج اور پھر چیف جسٹس کے گھر جا کر صدر جنرل پرویز مشرف کے دوسرے پی سی او کے دو بڑے شکاروں کو اپنی سیاسی حمایت دی۔ اس دوران انہوں نے بی بی سی کو کہا کہ صدر مشرف اور حکومت پنجاب کی سیاست میں کیا فرق رہ گیا ہے۔ اس کا فیصلہ تجزیہ کار خود کریں۔ بے نظیر بھٹو کی ہلاکت کی دنیا بھر میں سخت الفاظ میں مذمت کی گئی اور اسے بہت بڑا نقصان قرار دیا گیا ہے۔ بھارت نے بے نظیر کے قتل پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اس عمل کو انتہائی ظالمانہ قرار دیا ہے۔ وزیر اعظم من موہن سنگھ نے بے نظیر کی جانب سے بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر کرنے کی کوشش کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ بے نظیر برصغیر کے بہترین حکمرانوں میں سے تھیں۔ برطانیہ نے بے نظیر کے قتل کو بے حس دہشت گردوں کی کارروائی قرار دیتے ہوئے زور دیا ہے کہ دہشت گردوں کا راستہ روکنا انتہائی ضروری ہو گیا ہے۔ برطانوی وزیر خارجہ نے بے نظیر بھٹو پر حملے کی مذمت کی۔ وزیر خارجہ ڈیوڈ ملی بینڈ نے پاکستان میں ''تحمل اور یکجہتی'' کی اپیل کی ہے۔ امریکہ نے بھی اس حملے کی مذمت کی ہے۔ صدر بش بے نظیر کے قتل پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے دہشت گردی کے خلاف پاکستان کا ساتھ برقرار رکھنے کا کہا ہے۔ ویٹی کن نے بھی بے نظیر کے قتل کو افسوسناک قرار دیا ہے۔ روس نے پاکستانی حکام سے اپیل کی ہے کہ وہ ملک میں قیام امن کو یقینی بنائیں۔ فرانس اور اٹلی نے بے نظیر بھٹو کے قتل کو انتہا پسندی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ فرانس نے بے نظیر پر قاتلانہ حملے کی شدید مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ قابل نفرت فعل ہے۔ افغانستان کی حکومت نے بے نظیر پر قاتلانہ حملے کی مذمت کرتے ہوئے اسے ''بربریت'' قرار دیا۔

افغان صدر حامد کرزئی نے کہا کہ بے نظیر کے قاتل پاکستان اور امن کے دشمن ہیں۔ بے نظیر بھٹو اور حامد کرزئی نے آج ہی اسلام آباد میں ملاقات کی تھی۔ متحدہ عرب امارات نے پاکستان کی سابق وزیر اعظم کے قتل کی مذمت کی ہے۔ متحدہ عرب امارات کے وزیر خارجہ شیخ عبداللہ بن زید النہان نے اسے ایک مجرمانہ عمل قرار دیتے ہوئے پاکستانی عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے خلاف متحد رہیں۔ مصری سرکاری میڈیا پر جاری ہونے والے بیان میں پاکستانی عوام سے اظہار تعزیت کیا گیا ہے اور بے نظیر کے قتل کو ظالمانہ کارروائی قرار دیا گیا ہے۔ پاکستانی لیڈر شپ کی طرف سے ان کو شہید کہا گیا اور ان کی موت پر تین دن کا باقاعدہ سوگ منانے کا اعلان ملک کے ہر طبقہ فکر کی طرف سے کیا گیا۔ میاں نواز شریف ان کے جنازے میں شرکت کے لئے نوڈیرو جانا چاہتے تھے لیکن آصف زرداری کی درخواست کرنے پر انہوں نے یہ دورہ منسوخ کیا، اس سے پہلے وہ پہلے لیڈر تھے جو فوراً بے نظیر کی موت کی اطلاع ملنے پر جنرل ہسپتال راولپنڈی پہنچے جہاں پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے جھولیاں پھیلا کر ان کی زندگی کی دعائیں مانگیں اور انہیں روتے ہوئے کہا کہ آپ اپنی جان کی فکر کریں یہ حکومت آپ کو بھی مار ڈالے گی۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے بے نظیر بھٹو کی ہلاکت پر ہنگامی اجلاس کے بعد اپنے بیان میں اس حملے کے ذمہ داروں کو پکڑنے اور سزا دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی موت کے بعد بلائے گئے کونسل کے ہنگامی اجلاس کے بعد دسمبر کے مہینے کے لئے سلامتی کونسل کے صدر، اٹلی کے سفیر مارسیلو سپیفورا نے اپنے بیان میں کہا کہ سلامتی کونسل محترمہ بے نظیر بھٹو پر ہونے والے دہشت گرد حملے کی بہت سخت الفاظ میں مذمت کرتی ہے اور اس حملے کا نشانہ بننے والوں کے خاندان والوں، پاکستان کے عوام اور حکومت سے تعزیت کرتی ہے۔ انہوں نے سلامتی کونسل کی طرف سے محترمہ بے نظیر بھٹو کو خراج تحسین پیش کیا۔ سلامتی کونسل کے بیان میں تمام پاکستانیوں سے صبر اور تحمل کی اپیل کی گئی ہے اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ اس حملے کے ذمہ دار افراد کو گرفتار کر کے بین الاقوامی قوانین کے مطابق سزا دی جائے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ دہشت گردی کسی بھی شکل میں عالمی امن کو لاحق سب سے بڑا خطرہ ہے اور دہشت گردی کا کوئی بھی قدم جائز نہیں، چاہے وہ جو بھی کرے اور جس مقصد کے لئے بھی کرے۔ دنیا کے تمام ممالک کو مخاطب کر کے اس بیان میں ان سے کہا گیا ہے کہ اگرچہ دہشت گردی کا مقابلہ ضروری ہے لیکن اس سلسلے میں اٹھایا گیا کوئی بھی قدم بین الاقوامی اور انسانی حقوق کے قوانین کے مطابق ہونا چاہیے۔ پاکستانی مشن کی درخواست پر اس اجلاس میں نائب سفیر فرخ عمل کو شرکت کرنے کی اجازت دی گئی جنہوں نے بعد میں صحافیوں کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان دہشت گردی کا نشانہ ہے اور ملک کے صدور، سابق وزیر اعظم اور کئی وزراء اس کا نشانہ بن چکے ہیں۔ لیکن حکومت دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لئے پرعزم ہے۔ اجلاس کے اختتام پر ذرائع ابلاغ سے بات کرتے ہوئے کونسل کے صدر سپیفورا نے کہا کہ سلامتی کونسل زمینی حقائق کا مطالعہ کرنا چاہتی تھی اور سب سے اہم یہ تھا کہ بہت سخت الفاظ میں اس حملے کی مذمت کی جائے اور لوگوں کو پرامن رہنے کی تلقین کی جائے کیونکہ پاکستان میں ہنگامے شروع ہو گئے ہیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے سینیٹر بابر اعوان نے کہا ہے کہ بے نظیر بھٹو کی موت ''ٹارگٹ کلنگ'' کا نتیجہ ہے۔ بی بی سی سے بات کرتے ہوئے بابر اعوان کا کہنا تھا کہ بے نظیر بھٹو اپنی سکیورٹی کے بارے میں بہت فکرمند تھیں اور آج جلسے کے دوران بھی انہوں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا تھا۔ بابر اعوان نے کہا کہ وہ صبح بے نظیر بھٹو کے ساتھ ہی جلسے میں گئے تھے۔ جلسہ گاہ میں ہم اکٹھے بیٹھے رہے۔ ہم ساتھ ہی ان کے گھر سے آئے تھے۔ وہ بتاتی

رہیں کہ انہیں کیا خطرات درپیش ہیں۔ انہوں نے کچھ تفصیلات بھی مجھے دیں جو میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ جب ہم جلسے میں بیٹھے ہوئے تھے تب بھی محترمہ نے مجھے کچھ چیزیں لکھ کر دیں۔ وہ اس بارے میں بہت فکرمند تھیں۔ جب ہم نکلے تو دو گاڑیاں تھیں۔ اگلی گاڑی میں، میں بیٹھا، رحمان ملک اور فرحت اللہ بابر اور پچھلی گاڑی میں محترمہ بیٹھیں۔ وہ کھڑی ہوئی اپنے مداحوں کو وِیو کرنے کے لئے (ہاتھ ہلانے کے لئے) تو پہلے ان پر شارپ شوٹنگ ہوئی، اور پھر بم کا دھماکہ ہوا۔ اس کے بعد پولیس نے ہمیں وہاں سے نکال دیا۔ یہ ٹارگیٹڈ کلنگ تھی، ہم کیوں اسے خواہ مخواہ اور کوئی (نام دیں)۔ جس طرح شہید قائد عوام کو ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنایا گیا، اس کے لئے طریقہ کار مختلف اختیار کیا گیا، اسی طرح سے محترمہ کو بھی آج ٹارگٹ کر کے مارا گیا۔ ان کی گردن میں گولی لگی اور بعد میں ان کی گاڑی پر کچھ مواد بھی پھینکا گیا۔ لاکھوں لوگوں نے دیکھا کہ انہوں نے دو مرتبہ مجھے چٹ لکھ کر دی اور وہ اپنی سکیورٹی کے بارے میں بہت فکرمند تھیں۔ ہم ان کی ہلاکت کے لئے انہی عناصر کو ذمہ دار سمجھتے ہیں جو ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت کا باعث تھے، ہم کسی اور کو موردِ الزام کیوں ٹھہرائیں۔

(روزنامہ ''نوائے وقت'' 29 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

مشرق کی بیٹی کی شہادت.....ایک تجزیاتی جائزہ!

رانا عبدالباقی (اسلام آباد)

دسمبر 2007ء کا آخری عشرہ یہ وحشت ناک خبر لے کر آیا کہ لیاقت باغ میں مشرق کی بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو شہید ہو چکی ہیں۔ کوئی بھی درد مند دل یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا لیکن انہونی ہو چکی تھی۔ راولپنڈی کے لیاقت باغ میں قوم و ملک کے حوالے سے ان کی آخری تقریر ایک یادگار تقریر تھی جس نے عوام الناس میں فکر و نظر کی جوت کو جگایا اور بیشتر قومی و غیر ملکی دانشوروں کے دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ محترمہ کی تقریر سے اسی لیاقت باغ میں ذوالفقار علی بھٹو کی اس تقریر کی یاد بھی تازہ ہو گئی جس میں انہوں نے بھارتی ایٹمی دھماکوں کے جواب میں پاکستان کے لئے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے عزم کا اظہار کیا تھا۔ افسوس کہ آمریت کے ایوانوں نے تب بھی ذوالفقار علی بھٹو کے عزم صمیم کو پاش پاش کرنے کی کوشش کی تھی جس طرح ایٹمی دھماکے کے بعد قید و بند اور جلا وطنی کے ذریعے میاں نواز شریف کو ملک کے سیاسی منظر نامے سے ہٹانے کی کوشش کی گئی۔ بہر حال ذوالفقار علی بھٹو کے بعد ان کی تصویر بے نظیر بھٹو کی شکل میں وہ عزم زندہ و پائندہ رہا اور جب سابق وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی آخری آرامگاہ پر چھلکتے آنسوؤں کے دوران یہ کہا کہ بلاشبہ بے نظیر چاروں صوبوں کی زنجیر تھی تو یہ عزم اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت پر پشاور سے کوئٹہ تک، مظفر آباد سے بلتستان تک اور راولپنڈی سے کراچی تک جو غم اور دکھ کے بادل برستے نظر آئے ہیں، شاید ہی کسی اور ایسے موقع پر دیکھنے میں آئے ہوں۔ محترمہ نے اپنی آخری تقریر میں اپنے والد اور بھائیوں کی اندوہناک اموات کا بھی ذکر کیا تھا، انہیں اپنے والد کی موت سے قبل آمریت کی دیواروں کے سایہ تلے اپنے والد سے آخری ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا لیکن محترمہ کے قاتلوں نے انہیں اپنے بچوں اور علیل والدہ سے ملاقات کا آخری موقع بھی نہیں دیا اور وہ چشم زدن میں اپنے شہید والد اور بھائیوں سے ملنے کے لئے آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئیں، انہیں یقیناً اپنے والد کی موت سے قبل ان سے اپنی آخری ملاقات ضرور یاد ہو گی جب سپرنٹنڈنٹ جیل نے انہیں اپنے والد سے بالمشافہ آخری ملاقات کی اجازت دینے سے بھی انکار کر دیا تھا، جس کے بارے میں وہ اپنی کتاب 'مشرق کی بیٹی' میں لکھتی ہیں ''سلاخوں کے درمیان سے میں اپنے والد کے جسم کو چھونے کی کوشش کرتی ہوں، وہ اس قدر نحیف و ناتواں ہو چکے ہیں، ملیریا، پیچش اور ناکافی خوراک کی وجوہ سے جسم بالکل نحیف اور باریک ہو چکا ہے لیکن وہ سیدھا اٹھ بیٹھتے ہیں اور میرے ہاتھ کو چھو لیتے ہیں۔ چہرے پر ایک چمکتی روشنی لئے وہ کہتے ہیں، میں آج شام آلائم دنیا سے آزاد ہو جاؤں گا اور اپنی والدہ اور اپنے والد کے پاس چلا جاؤں گا، میں لاڑکانہ میں اپنے اجداد کی زمینوں کی طرف واپس جا رہا ہوں تاکہ اس سرزمین کا، اس کی خوشبو اور اس کی فضا کا حصہ بن جاؤں، خلق خدا میرے گیت گائے گی اور میں اس کی جاوداں کہانیوں کا حصہ بن جاؤں گا۔'' ذوالفقار علی بھٹو کی مانند مشرق کی بیٹی بھی اب ایک نئے سفر پر روانہ ہو گئی ہے۔ گو کہ نہ معلوم قاتلوں

نے انہیں راستے کا پتھر سمجھتے ہوئے حرف غلط کی طرح مٹانے کی کوشش کی ہے لیکن انہیں بھی جاوداں کہانیوں کے اس عظیم ورثہ کا حصہ بننے سے کوئی نہیں روک سکتا جو پاکستان کی فضاؤں کو اپنے گیتوں سے صدا منور کرتی رہیں گی کیونکہ وہ شہید ہے اور ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ مشرق کی بیٹی کی شہادت کا خون رنگ لائے گا۔ ان کی بے گناہی کی آہ سے ملک سے ظلم، استبداد اور آمریت کے بادل چھٹ جائیں گے اور اسی سرخی آمیز نورانی سحر سے آئین، انسانی حقوق، عدل و انصاف، جمہوریت اور قومی یکجہتی کی نئی صبح طلوع ہوگی۔ عوام الناس اور سول سوسائٹی اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گے جب تک قاتلوں کے پیچھے چھپے چہروں کو بے نقاب نہیں کیا جاتا۔ عوام جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کون لوگ ہیں، جنہوں نے محترمہ کو 18 اکتوبر کی ریلی کے دوران کراچی میں بھی قتل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی جس میں ان قاتلوں کے ہاتھ سینکڑوں بے گناہ انسانوں کے خون سے بھی رنگے ہوئے ہیں۔ عوام جاننا چاہتے ہیں کہ کراچی کے دلخراش واقعات کے بعد انسداد دہشت گردی کے اداروں نے محترمہ کی سیکورٹی کے لئے کیا فول پروف سیکورٹی انتظامات کئے تھے اور ان انتظامات میں کوتاہیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ عوام جاننا چاہتے ہیں کہ کراچی کے تلخ تجربے کے بعد سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کی سیکورٹی مؤثر بنانے کے حکومتی دعووں کے برعکس محترمہ کے لئے ناکافی اور نامناسب سیکورٹی کا کیا جواز تھا اور انہیں دہشت گردوں کے رحم و کرم پر کیوں چھوڑ دیا گیا تھا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو پاکستانی عوام ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے دانشور پوچھ رہے ہیں اس لئے بھی کہ لیاقت باغ میں 27 دسمبر کی شام نے جو ظلم ڈھائے ہیں، اس کی بلند و بانگ آواز پاکستان کے میدانوں، پہاڑوں، وادیوں، شہروں اور قریہ قریہ سنی گئی ہے اور جب تک قاتلوں کا سراغ نہیں ملتا، اس خون ناحق کی بازگشت اقتدار کے ایوانوں میں سنی جاتی رہے گی۔ آیئے اس امر کا ایک مختصر اتجزیاتی جائزہ لیتے ہیں کہ لیاقت باغ میں پیش آنے والی اس سانحہ قتل پر حکومتی مؤقف کیا ہے اور زمینی صورتحال کیا ہے؟

محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ابتدائی سرکاری مؤقف یہی تھا کہ ایک خودکش حملہ آور نے پہلے فائرنگ کی اور بعد میں اپنے آپ کو دھماکے سے اڑا دیا۔ بعد میں وزارت داخلہ میں قائم جوائنٹ کرائسس مینجمنٹ سیل کے چیف بریگیڈیئر جاوید اقبال چیمہ نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی موت کو حادثاتی چوٹ کا باعث قرار دیتے ہوئے اسے القاعدہ اور بیت اللہ محسود کی دہشت گرد کارروائی کا نتیجہ قرار دیا اور ثبوت کے طور پر بیت اللہ محسود کی ٹیلی فون گفتگو کا ٹیپ پیش کیا لیکن پیپلز پارٹی کی شیری رحمان، جنہوں نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی میت کو غسل دیا تھا، چوٹ کی تھیوری کو قطعی احمقانہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ محترمہ کے سر پر گولی لگنے کے نشان موجود ہیں جبکہ فرحت اللہ بابر نے ٹیپ کی تھیوری کو پلانٹ تھیوری قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا ہے۔ بی بی سی پر پیش کی جانے والی چند تصاویر اور ڈان نیوز کے حوالے سے ایک فوٹو گرافی کی کھینچی گئی تصاویر میں قاتل کو نہ صرف انتہائی قریبی رینج سے فائرنگ کرتے ہوئے اور خودکش بم دھماکے سے قبل گاڑی کے ہڈ کو بدستور کھلا دکھایا گیا ہے جس سے حکومتی مؤقف کی نفی ہوتی ہے۔ ان تصاویر میں ایک دوسرے مبینہ خودکش حملہ آور کو بھی چادر میں ملبوس دکھایا گیا ہے۔ ان تصاویر کے بغور مشاہدہ سے جو بات کھل کر سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ دہشت گرد انتہائی قریب سے محترمہ بے نظیر بھٹو کو انتہائی اطمینان سے نشانہ بناتے رہے جبکہ مناسب سیکورٹی موجود نہیں تھی، جس سے شیری رحمان کے مؤقف کی تائید ملتی ہے۔ امریکی سینیٹ کی خارجہ تعلقات کمیٹی کے چیف سینیٹر جوزف برائیڈن جونیئر نے 18 اکتوبر کے دہشت گردی کے واقع کے

بعد اپنے دو ساتھی سینیٹرز کے ساتھ مل کر محترمہ کی درخواست پر صدر مشرف کو ایک خط لکھا تھا جس میں دہشت گردی کے خطرہ کے پیش نظر محترمہ کی سیکورٹی بڑھانے کی بات کی گئی تھی جس پر مبینہ طور پر توجہ نہیں دی گئی۔ دریں اثنا اقوام متحدہ اور مغربی دنیا کے بیشتر دانشوروں بشمول امریکی سینیٹر اور صدارتی امیدوار ہیلری کلنٹن و دیگر انسانی حقوق کے اداروں نے محترمہ کے قتل کی تفتیش میں بین الاقوامی اداروں کی شمولیت کا مطالبہ کیا ہے جسے حکومتی ترجمان نے مسترد کر دیا ہے۔ مزید براں بیت اللہ محسود کے ترجمان مولانا محمد عمر کے علاوہ طالبان نے بھی واشگاف الفاظ میں اس دہشت گرد کارروائی میں ملوث ہونے سے انکار کیا ہے۔

یاد رہے کہ اس سے قبل محترمہ بے نظیر بھٹو نے کراچی کی انکوائری میں انسداد دہشت گردی کی بین الاقوامی ٹیم کی شمولیت کا مطالبہ کیا تھا اور اب پیپلز پارٹی کی لیڈر شپ نے محترمہ کے قتل کی انکوائری میں بین الاقوامی ٹیم کو شامل کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ امر سمجھ سے بالاتر ہے کہ ویسے تو پاکستان دہشت گردی کے خلاف بین الاقوامی اتحاد کا حصہ ہے اور صدر پرویز مشرف کی قیادت میں پاکستان دہشت گردی کے ہر معاملے میں بیرونی دنیا کی مدد میں پیش پیش رہتا ہے تو موجودہ متنازعہ دہشت گردی کی واردات میں بین الاقوامی مدد لینے میں کیا قباحت ہے۔ اندریں حالات، قرائین یہی کہتے ہیں کہ محترمہ کے سیکورٹی معاملات کو مس ہینڈل کیا گیا ہے۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ صدر کی ماورائے آئین غیر سیاسی سوچ، سیاسی جماعتوں کا ملک میں شفاف اور ایماندارانہ انتخابات کے حوالے سے حکومت پر عدم اعتماد، عدلیہ، وکلاء، اور سول سوسائٹی کے خلاف لئے جانے والے ماورائے آئین و ماورائے قانون اقدامات کے باعث ملک میں بے یقینی کے بھنور میں پھنس چکا ہے۔ مزید براں قبائلی علاقوں اور چھوٹے صوبوں کے مسائل سیاسی فکر و نظر سے حل کرنے کے بجائے فوج کا بتدریج بلوچستان سے لے کر سوات تک جنگ میں الجھ کر رہ جانا اور اب محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد پیدا ہونے والی نئی صورتحال کے باعث اس دائرہ کا مزید وسیع تر ہو جانا، ملک کی سلامتی کے لئے اچھا شگون نہیں ہے کیونکہ اندرونی خلفشار ہمیشہ ہی بیرونی طاقتوں کو مداخلت کی دعوت دیتا ہے اور یہی کچھ ملک کے مشرقی حصے میں 1971ء میں ہو چکا ہے۔

(روزنامہ ''نوائے وقت'' 3 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

نیلے اور سبز رنگ کی دلدادہ شہزادی جنت سدھار گئی

رباب عائشہ

عام طور سے یوں ہوتا ہے کہ جب کوئی انہونی ہونی ہو تو دل میں اندیشے سر اٹھانے لگتے ہیں، فضاء میں اداسی گھل جاتی ہے، طبیعت پر خواہ مخواہ ایک نامعلوم سی اداسی طاری ہو جاتی ہے۔ چھٹی حس کوئی نہ کوئی سگنل دے دیتی ہے۔ لیکن 27 دسمبر 2007ء کا سورج تو معمول کے مطابق طلوع ہوا تھا۔ اس دن کوئی خوفناک خیال ذہن میں نہیں ابھرا تھا۔ کئی دن سے پتا تھا کہ لیاقت باغ میں پیپلز پارٹی کا جلسۂ عام ہوگا جس سے بے نظیر بھٹو خطاب کریں گی۔ دفتر میں روزمرہ کام کی مصروفیات میں خاصی دیر ہوگئی۔ بار بار کانوں میں مختلف جملے پڑ رہے تھے "ساری مری روڈ بند ہے" جانے کے راستے بند کر دیے گئے ہیں ایک لمحہ کو خیال آیا کیسے گھر پہنچیں گے؟ پھر میں نے خود ہی اس خیال کو جھٹک دیا اللہ مالک ہے کوئی راستہ مل ہی جائے گا پانچ بجے گھر سے فون آیا فیض آباد کی طرف سے مت آیئے گا "سارے راستے بند ہیں" ساڑھے پانچ بجے ہم دفتر سے نکلنے لگے تو میرے ایک کولیگ نے کہا لیاقت باغ میں بم دھماکہ ہوگیا۔ بہت سے لوگ مارے گئے ہیں۔ ابھی تفصیلات آ رہی ہیں۔ میں نے فیض آباد کے راستے کے بجائے آئی ایٹ کی طرف سے جانے کا فیصلہ کیا۔ میری برابر کی سیٹ پر میری کولیگ صائمہ عمران بیٹھی تھی۔ ابھی ہم آئی ایٹ سے گزر کر آئی ٹین میں پہنچے تھے کہ صائمہ کے سیل فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔ صائمہ نے فون بند کر کے کہا "بے نظیر کو گولی لگ گئی" ایک لمحہ کو مجھے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا، دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک بار پھر موبائل فون بجنے لگا، صائمہ نے پھر گلوگیر آواز میں کہا "بے نظیر فوت ہوگئیں" مجھے یوں لگا جیسے میرا سارا جسم بے جان ہوگیا ہو، ذہن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوگیا۔ رہ رہ کر ایک ہی خیال آ رہا تھا "اللہ اس ملک کا حامی و ناصر ہو" یہ کیسی قیامت ہے ہمارا پیارا پاکستان جس کی طرف چل پڑا ہے کیا اب کبھی یہاں امن قائم ہو سکے گا؟ کیا یہاں کبھی ہمیں تحفظ ہوگا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میں نے بے نظیر کو ٹیلی ویژن کی اسکرین پر بڑے جوش و جذبے سے جلسہ میں تقریر کرتے دیکھا تھا۔ کیا زندگی اتنی بے ثبات، اتنی بے وقعت ہے؟ کہ موت کا فرشتہ ایک لمحہ میں زندگی سے بھرپور ایسی ہر دلعزیز شخصیات کو دبوچ کر لے جاتا ہے اور پھر میرے ذہن میں الٹی فلم چلنے لگی۔

4 اپریل 1979ء کا وہ دن میرے خیال میں ابھرا جب بے نظیر کے والد ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی اور میرے شوہر صغیم زیدی دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ اپنا سر پیٹ رہے تھے۔ میں نے ایک دفعہ انہیں تسلی دینے کی کوشش کی مگر پھر ان کی حالت دیکھ کر سوچا یہ اپنے دل کا غبار نکال لیں تو بہتر ہوگا۔ مجھے معلوم تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو، صغیم زیدی کی ایک آئیڈیل شخصیت تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو جب ایوب خان سے علیحدہ ہو کر لاڑکانہ جا رہے تھے صغیم زیدی اس وقت بھی ان کے ساتھ تھے اور پھر پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد بھی صغیم زیدی، ذوالفقار علی بھٹو کے جلسے جلوسوں کی تصاویر بنایا کرتے تھے۔ بعد میں ان کی بنائی ہوئی یہ تصاویر 1970ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی نے اپنے پوسٹروں اور بینرز پر چھاپی تھیں۔

1973ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم کے عہدے پر فائز ہوئے تو ایک دن صنم صاحب نے مجھے بتایا کہ آج بیگم نصرت بھٹو نے مجھے بلایا تھا اور انہوں نے کہا کہ ''بھٹو صاحب چاہتے ہیں کہ تم ان کے ذاتی فوٹو گرافر کی حیثیت سے کام کرو اور کل سے وزیراعظم ہاؤس میں ڈیوٹی دو'' اس دن کے بعد سے 1977ء کے اس دن تک جب جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا کر ملک کے منتخب وزیراعظم کو معزول کر کے قید نہیں کر دیا، صنم زیدی ان کے ساتھ کام کرتے رہے۔ اندرون ملک اور بیرون ملک ذوالفقار بھٹو بحیثیت وزیراعظم جہاں بھی جاتے صنم زیدی ذاتی فوٹو گرافت کی حیثیت سے ان کے ساتھ ہوتے۔ پھر پورے دس سال بعد جب دو دسمبر 1988ء کو بے نظیر بھٹو نے وزیراعظم کا عہدہ سنبھالا تو اس کے چند دن بعد ہی صنم زیدی کو پیغام ملا کہ وزیراعظم ان سے ملنا چاہتی ہیں۔ ملاقات کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ وزیراعظم چاہتی ہیں کہ میں ان کے ذاتی فوٹو گرافر کی حیثیت سے کام کروں'' اس وقت ہم دونوں کو ہی بہت تعجب ہوا تھا کہ یہ کتنے بڑے لوگ ہیں جو اپنے ورکرز کو یاد رکھتے ہیں۔ صنم زیدی نے چار ماہ بے نظیر کے ساتھ کام کیا۔ وہ چین اور امریکہ کے دورے پر بے نظیر کے ساتھ گئے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ 8 مئی 1989ء کو صنم زیدی پرائم منسٹر ہاؤس سے واپس آ رہے تھے کہ ایک تیز رفتار ویگن نے ان کی موٹر سائیکل کو ٹکر ماری جب انہیں راولپنڈی جنرل ہسپتال پہنچایا گیا تو ان کی ٹانگ دو جگہ سے ٹوٹ چکی تھی۔ یہ ایک پیچیدہ فریکچر تھا جس کا آپریشن کر کے ٹانگ میں راڈ ڈالی گئی اور وہ دو سال تک صاحب فراش رہے۔ جب وہ جنرل ہسپتال کے وی آئی پی وارڈ میں داخل تھے تو دو مرتبہ وزیراعظم کے اے ڈی سی نے ان سے ملاقات کی اور وزیراعظم کا پیغام انہیں پہنچایا کہ انہوں نے دریافت کیا ہے کہ آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہے تو پلیز بتائیں۔ انہوں نے کہا بس میرے لئے دعا کریں۔

مجھے صرف ایک بار بے نظیر صاحبہ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وزیراعظم بننے کے بعد انہوں نے پرائم منسٹر ہاؤس میں راولپنڈی اسلام آباد کی خواتین اخبار نویسوں کو مدعو کیا تھا۔ اس تقریب میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ پاکستانی خواتین کے حقوق کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتی ہیں جس میں انہیں صحافیوں اور خاص طور سے خواتین کے مسائل پر لکھنے والوں کی سپورٹ کی بہت ضرورت ہے۔ پھر رخصت ہونے کے وقت جب وہ کھڑی ہو کر ہر ایک سے انفرادی طور سے مل رہی تھیں تو میں سوچ رہی تھی کہ بے نظیر اپنے والد کی طرح کس قدر طویل قامت ہیں کہ بہت سے مرد بھی ان کے سامنے بونے لگتے تھے۔ وہ صرف جسمانی طور سے ہی قد آور نہیں تھیں بلکہ سیاست کے میدان میں بھی بہت قد آور شخصیت تھیں۔ وہ ساری دنیا میں پاکستان کی پہچان بن کر ابھری تھیں۔

بے نظیر بھٹو، ذوالفقار علی بھٹو کی پہلوٹھی کی اولاد تھیں۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں لڑکیوں کو ہمیشہ نظر انداز کرنے اور لڑکوں کو باپ کا فخر اور وارث سمجھنے کی روایات ہوں۔ وہاں ایک انقلابی شخص کی طرف سے اپنی بیٹی کو اپنی ذکاوت، قابلیت اور اپنی ذہنی اپج منتقل کرنے کا خیال بہت اور منفرد تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ننھی سی بے نظیر کے ذہن میں پوشیدہ اس ذہانت اور قابلیت کا اندازہ لگا لیا تھا جس کے بل بوتے پر وہ اپنے باپ کے مشن کو لے کر آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ابتداء سے ہی ان کی تربیت ان خطوط پر کی جس کے تحت وہ ایک کامیاب سیاست دان بننے کی صلاحیت حاصل کر سکیں۔ بے نظیر نے ایک بار ایک غیر ملکی صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا میں اپنی ماں کے مقابلے میں باپ سے زیادہ قریب تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ان کی سب سے بڑی اولاد تھی۔ جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ میں ان کے نقش قدم پر

چلوں گی۔ وہ مجھے اکثر غیر ملکی دوروں پر اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ میں بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکوں۔ بھارت میں شملہ معاہدے کے دوران بھی میں ان کے ساتھ تھی۔ انہوں نے کہا تھا "میں دوسری لڑکیوں سے ہٹ کر کچھ مختلف کرنا چاہتی تھی۔ میں نے بھارت میں اندرا گاندھی، سری لنکا میں بندرانائیکے اور پاکستان میں فاطمہ جناح کو دیکھا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں بھی ان بہادر خواتین کی طرح بنوں۔ اپنے ملک کے حوالے سے ساری دنیا میں جانی جاؤں۔ ایک اور مرتبہ بے نظیر نے کہا تھا کہ میں نہیں مانتی کہ پاکستانی خواتین میں سیاسی شعور نہیں۔ مسلمان عورتیں تو اس وقت بھی باشعور تھیں جب برصغیر میں نوآبادیاتی نظام اور انگریزوں کے تسلط کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے تو مسلم خواتین اس تحریک میں آگے آگے تھیں۔ اس لئے میں کہتی ہوں کہ عورتوں کا سیاست میں آنا کوئی نئی بات نہیں۔ عورتوں کی جدوجہد کو زیادہ پذیرائی صرف اس لئے حاصل نہیں ہوئی کیونکہ ہمارا معاشرہ میں زیادہ پڑھے لکھے لوگ موجود نہیں ہیں۔ عورت کی پہچان ہمیشہ مرد کے حوالے سے ہوتی ہے۔ اندرا گاندھی کو نہرو کے حوالے سے اور خالدہ ضیاء کو ان کے شوہر کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے جبکہ میں چاہتی ہوں کہ عورت کی اپنی ایک شناخت اور پہچان ہونا چاہیے۔

بے نظیر بھٹو کو گھر میں پیار سے "پنکی" کہا جاتا تھا۔ انہیں نیلا اور سبز رنگ بہت پسند تھا۔ جب وہ وزیراعظم بنیں تو انہوں نے حلف اٹھاتے وقت ایسا لباس سلوایا جو پاکستانی جھنڈے کی عکاسی کرتا تھا یعنی سبز قمیض اور سر پر سفید دوپٹہ۔

وہ سادہ غذا کھاتی تھیں دال چاول اور بھنڈی ان کی مرغوب ڈشیں تھیں طالب علمی کے زمانے میں انہیں ٹکٹ اور سکے جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اس کے بارے میں وہ کہتی تھیں کہ اس سے معلومات میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔ انہیں کتابیں پڑھنے اور لکھنے کا بہت شوق تھا۔ اپنے بچوں کے لئے نئی نئی کتابیں ڈھونڈ کر لاتی تھیں۔

1987ء میں جب بے نظیر بھٹو کی آصف زرداری سے شادی ہوئی تو ساری دنیا میں اس شادی کے بارے میں جاننے کی خواہش موجود تھی۔ بہت سے غیر ملکی صحافیوں نے بے نظیر سے اس شادی کے بارے میں سوالات کئے تھے۔ اس سوال کے جواب میں کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، بااعتماد اور خودمختار خاتون ہونے کے باوجود ارینج میرج کرنے پر کیسے آمادہ ہوئیں؟ بے نظیر نے جواب دیا تھا کہ میرے ذہن میں یہ اندیشہ پنپ رہا تھا کہ اگر میرے نام کے ساتھ کسی مرد کا نام وابستہ ہو گیا تو میرا سیاسی کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ درحقیقت میں نے اپنے سیاسی کیریئر کی خاطر شوہر اور بچوں کے بغیر ایک مجرد زندگی گزارنے سے سمجھوتہ کر لیا تھا پھر جب میرے بھائیوں کی شادیاں ہوئیں اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ مستقبل میں جب میں سیاست میں سرگرم نہیں رہ پاؤں گی تو کیا مجھے اپنی بھابیوں سے پوچھنا پڑے گا کہ کیا میں ان کا فون استعمال کر سکتی ہوں؟ پاکستانی معاشرہ میں، میں علیحدہ گھر لے کر بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ کیونکہ یہاں تنہا رہنے والی عورتوں کے بہت سے اسکینڈلز بنا دیئے جاتے ہیں۔ میں اپنے والد کے بعد اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی تھی۔ میں اپنے اس فیصلے پر خوش ہوں کیونکہ آصف کی موجودگی میں مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں محفوظ ہوں۔

بے نظیر بھٹو کی شادی 18 دسمبر 1987ء کو کلفٹن پیلس گارڈن کراچی میں ہوئی تھی۔ شادی کے وقت سفید رنگ کا جوڑا پہنا جس پر سنہرا کام

کروایا گیا تھا۔ آصف علی زرداری نے کریم کلر کا لباس پہنا اور پگڑی باندھی تھی۔ شادیوں میں ہونے والی چند رسمیں ادا کی گئیں جن میں آرسی مصحف کی رسم شامل تھیں۔ دولہا نے آئینہ میں دلہن کی شکل دیکھی۔ بے نظیر کے تین بچے ہیں۔ 19 سالہ بلاول زرداری، اس سے ایک سال چھوٹی بختاور اور پھر تین سال چھوٹی آصفہ۔ محترمہ بے نظیر اپنے بچوں سے بے انتہا محبت کرتی تھیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی خیال رکھتیں۔ سکول میں والدین اور اساتذہ کے درمیان ہونے والی میٹنگ میں ضرور شرکت کرتیں۔ گھر پر جو استاد بچوں کو پڑھانے آتے ان سے بچوں کی پراگریس کے بارے میں پوچھتیں۔ وہ شروع سے ہی بلاول کی سیاسی تربیت کر رہی تھیں۔

ہر مشرقی ماں کی طرح بے نظیر اپنے بچوں سے والہانہ محبت کرتی تھیں۔ وزیراعظم کی حیثیت سے جب وہ ایک بار امریکہ گئیں تو ان کے استقبال کے لئے آنے والی سرکردہ امریکی شخصیات اس وقت حیرت زدہ رہ گئیں۔ جب جہاز سے اترتے وقت ننھا بلاول ان کی گود میں تھا۔ اس وقت بے نظیر نے صحافیوں کے جوابات دیتے ہوئے کہا تھا کہ میری دوہری ذمہ داریاں ہیں ایک وزیراعظم پاکستان کی حیثیت سے اور دوسرے ایک ماں کی حیثیت سے۔ میری پہلی ذمہ داری اپنے بچوں کی پرورش ہے۔

بے نظیر خواتین کے حقوق کی بہت بڑی علمبردار تھیں۔ انہوں نے عورتوں سے امتیازی سلوک کے خلاف ہمیشہ کام کیا اپنے دور حکومت میں انہوں نے فسٹ ویمن بنک کھولا اور ویمن پولیس اسٹیشن قائم کئے۔

وہ ایک فولادی عزم والی خاتون تھیں۔ بہادر، نڈر، اولوالعزم، اپنے مشن کے لئے ہر قربانی دینے کے لئے تیار۔ انہیں اپنی زندگی میں بیشمار صدمات سے گزرنا پڑا۔ والد کی پھانسی، دو بھائی کی غیر طبعی موت، والدہ کی بیماری، اس کے باوجود انہوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ انہیں بار بار دھمکیاں مل رہی تھیں مگر وہ اس قدر نڈر تھیں کہ انہوں نے کسی بھی دھمکی کی پرواہ کی نہ خوفزدہ ہوئیں اور عوامی جلسوں سے خطاب کرنے کا پروگرام جاری رکھا۔

بے نظیر بھٹو پاکستانی عورتوں کے لئے بہادری اور عزم کی ایک علامت تھیں۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ پاکستانی عورت قابلیت، صلاحیتوں اور جرأت مندی میں کسی سے کم نہیں۔ اس کے بارے میں تاثر کہ وہ ڈری، سہمی، کم ہمت عورت ہے بالکل غلط ہے۔ عورت چاہے تو دریاؤں کے رخ موڑ دے، قوموں کی تقدیر بدل دے۔ بے نظیر جیسی عورتیں صدیوں میں ایک بار پیدا ہوتی ہیں۔ ہماری قوم کی بدقسمتی ہے کہ ہم نے اسے کھو دیا۔

پیپلز پارٹی کے شہید قائد بے نظیر بھٹو کے صاحبزادے بلاول بھٹو 1988ء کو کراچی میں پیدا ہوئے ان کی عمر 19 سال ہے بلاول کی پیدائش کے وقت بے نظیر بھٹو وزیراعظم تھیں واحد اولاد نرینہ ہونے کی وجہ سے بے نظیر بھٹو اپنی اولاد میں سے بلاول کا سب سے زیادہ خیال رکھتی تھیں۔ بلاول نے ابتدائی تعلیم کراچی میں پائی پھر ان کا دبئی میں داخلہ کرا دیا گیا۔ آصف زرداری جب جیل سے رہا ہوئے تو بلاول دبئی سے آ کر ان کے ساتھ رہتے تھے۔ آصف زرداری فخر سے کہتے تھے بلاول میرے قد سے اوپر نکل گیا ہے۔ بلاول نے اپنی والدہ کی طرح آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے جس کالاڑکانہ میں بحیثیت ووٹر اندراج کیا گیا ہے۔ بے نظیر بھٹو جب کبھی آصف زرداری سے جیل میں ملنے جاتی تھیں تو بلاول کو ساتھ

رکھتی تھیں، وہ بڑی مضبوطی سے ان کا ہاتھ تھامے رہتی تھیں، بے نظیر بھٹو کی جلاوطنی کے دنوں میں بلاول کا لندن میں داخلہ کرادیا گیا جہاں سے انہوں نے گریجویشن کی، بلاول نہایت باوقار، سنجیدہ اور کم گو ہیں، وہ والدہ کی شہادت پر دل گرفتہ ہیں، 18 اکتوبر کے سانحہ کے فوراً بعد آصف زرداری نے بلاول کو لندن فون کرکے کہا کہ دھماکا ہوا ہے مگر تمہاری ماما خیریت سے ہیں لیکن 27 دسمبر کو آصف زرداری کو بلاول کو خیریت کی اطلاع نہ دے سکے اور اس بار انہوں نے کہا کہ ماما دنیا سے چلی گئی ہیں۔ بلاول اپنی بہنوں بختاور اور آصفہ کے ہمراہ کراچی پہنچے جو بے نظیر بھٹو کے جنازہ میں شریک تھے۔ بلاول نے دبئی کے الرشید سکول فار بوائز میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور سکول کے زمانے میں وہ سکول کونسل کے نائب صدر منتخب ہوئے، الرشید سکول سے فارغ ہونے کے بعد انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے آکسفورڈ میں داخل کرادیا گیا جہاں ان کے نانا شہید ذوالفقار علی بھٹو اور والدہ بے نظیر بھٹو بھی تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ بلاول بھٹو زرداری کو بھی اپنے والد آصف زرداری کی طرح گھوڑے اور گھڑ سواری پسند ہے۔

(روزنامہ ''نوائے وقت'' 7 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

بدلی جاتی ہے، بدلتی نہیں تقدیر کبھی!

جاوید قریشی

گروپ کے سینئر نائب صدر مارک شنائڈ(Mark Schneider) کا کہنا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے قتل نے صدر مشرف کی حکومت اور پاکستان کے عوام کی اکثریت کے درمیان ایک لکیر کھینچ دی ہے۔ جو ملک میں مکمل جمہوریت کی بحالی سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوگی۔ گروپ کو انتخابات کے التوا پر تو کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ آزادانہ، منصفانہ اور غیر جانبدار انتخابات کے انعقاد کے لیے مزید ضروری اقدامات کیے جائیں۔ جن میں سیاسی جماعتوں کی مشاورت کے ساتھ وفاق اور صوبائی سطح پر حکومتوں کا قیام، دستور کی مکمل بحالی، آزاد عدلیہ کا قیام نیز ان تمام ججز کی بحالی جنہیں اس جرم یا خدشہ کی پاداش میں برخواست کیا گیا کہ وہ حکومت کو من مانی کرنے کی راہ میں مزاحم ہوں گے، وغیرہ شامل ہیں۔ یہ باتیں پاکستان کی سیاسی جماعتیں نہیں کر رہیں ایک یورپی تھنک ٹینک کے ارکان کر رہے ہیں۔ جن کی غیر جانبداری ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ یہ الگ بات کہ یہ لوگ ابھی انہیں باتوں کا تقاضا کر رہے ہیں جن کا مطالبہ پاکستان کے عوام اور اپوزیشن جماعتیں بالخصوص پیپلز پارٹی کر رہی ہے۔ عدلیہ کی آزادی اور معزول کیے گئے ججز کی بحالی کا مطالبہ تو میاں نواز شریف اور ان کی جماعت بھی شد و مد سے کرتی رہی ہے۔ صدر مشرف کی اندرون ملک مقبولیت کا ہم پاکستانیوں کو تو خوب اندازہ تھا ہی۔ اب غیر ملکی بھی اس سے آگاہ ہوتے جا رہے ہیں۔ امریکی عہدہ دار اس سے اور فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صدر مشرف اب اتنے کمزور ہو چکے ہیں کہ وہ قبائلی علاقوں میں سی۔آئی۔اے اور امریکی افواج کو آپریشنز کی اجازت پر آمادہ ہو جائیں گے۔

محترمہ بے نظیر نے زندگی کی آخری تقریر میں ببانگ دہل حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے پرجوش لہجہ میں کہا تھا کہ ”یہ میرا پاکستان ہے۔ یہ آپ کا پاکستان ہے۔ اس کی حفاظت میں کروں گی۔ اس کی حفاظت آپ کریں گے۔ اس کی حفاظت ہم سب مل کر کریں گے (انشاءاللہ)“۔ بی بی نے تو اپنا قول پورا کرتے ہوئے جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ اب ملک کی حفاظت ہم سب پاکستانیوں کا فرض ہے۔ بی بی نے اسی تقریر میں کسی بھی غیر ملکی فوج کی پاکستان آمد کو سختی سے رد کر دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ ایسی ہی وجوہات کی بنا پر امریکہ اور محترمہ کے درمیان فاصلے بڑھنے لگے تھے۔

تیسری دنیا میں رہنے والے ہم لوگ سپر پاور امریکہ میں ہونے والی جھوٹی جھوٹی باتوں کا بھی بغور جائزہ لینے پر مجبور ہیں۔ چہ جائیکہ امریکہ کے سب سے بڑے اخبار ”نیویارک ٹائمز“ میں چھپنے والی اہم خبروں کو نظر انداز کرنے کی غلطی کریں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ اس اخبار میں چھپنے والی خبریں، تبصرے اور جائزہ آج نہیں تو کل امریکہ کی سرکاری پالیسی کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ طاقت سے مغلوب امریکی انتظامیہ کچھ بھی کر سکتی

ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ہمارے قبائلی علاقوں پر حملہ امریکیوں نے کیا ہو اور ہم نے اسے پاکستانی فوج کی کارروائی قرار دے کر ذمہ داری خود قبول کر لی ہو۔ یوں بھی ہوا ہے کہ ہماری حکومت نے واشنگٹن کی ایک فون کال پر اپنی سالہا سال کی روایتی پالیسی ترک کر دی ہو۔ دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست کہنے پر مجبور ہوئے ہوں۔ غیر ملکی ماہرین اور تھنک ٹینکس کی غیر ہمدردانہ رپورٹوں کو رد کر دیتا یوں تو ہماری حکومت کی روش رہی ہے کیونکہ ہماری حکومت کے بقول انہیں ہمارے "زمینی حقائق" (ground realities) کا علم نہیں ہوتا لیکن ان انٹیلی جنس ایجنسیز کی رپورٹس کو رد کر دینا دشوار ہوگا جو اپنے وسائل کی بنا پر دنیا بھر سے معلومات اکٹھی کرنے پر قادر ہوں۔ مغربی تھنک ٹینکس اور ایجنسیز کا اندازہ ہے کہ صدر مشرف ملک میں غیر مقبول ہو چکے ہیں اور اب ان کے اور پاکستانی عوام کے راستے جدا جدا ہیں۔

محترمہ بے نظیر کی شہادت نے ملک کو جن مسائل سے دوچار کر دیا ہے ان کے تصور ہی سے خوف آتا ہے۔ اب ملک میں ان کے قد کاٹھ کا کوئی لیڈر باقی نہیں۔ محترمہ کے چلے جانے کے بعد ملک کی سیاسی جماعتوں بالخصوص پیپلز پارٹی پر بھاری ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پارٹی نے قیادت کے انتخاب کا مرحلہ خوش اسلوبی سے طے کر لیا لیکن مخالف قوتیں اس سب سے بڑی جماعت میں تفرقہ ڈالنے سے باز نہ آئیں گی۔ بلاول کی نوعمری اور آصف زرداری کی ماضی کی شہرت دونوں کو ہدف تنقید بنانے کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ مخالفین یہ چاہیں گے کہ اس پارٹی میں پھوٹ پڑے اور یہ مختلف دھڑوں میں بٹ جائے۔ پارٹی قیادت کو اس خطرناک سازش کو ناکام بنانا ہوگا۔

ملک کے تحفظ کی ذمہ داری پاکستانی عوام پر عائد ہوتی ہے۔ جنہوں نے بارہا ثابت کیا ہے کہ اگر وہ ڈٹ جائیں تو بڑی سے بڑی آزمائش کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آمرانہ نظام نے تو ہمیشہ شخصی آزادیوں پر پابندی لگائی، اظہار پر پابندی، اجتماع پر پابندی، تقریر پر پابندی، تحریر پر پابندی۔ یہ روش نئی نہیں ہے۔ ہر آمرانہ دور میں ایسا ہی ہوا ہے۔ کسی پس ماندہ سے پس ماندہ ملک میں بھی نہ سنا ہوگا کہ اعلیٰ عدلیہ کے 66 جج کو معزول کر کے حراست میں لے لیا جائے۔ معزول ہونے والوں میں ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کے اعلیٰ ترین جج بھی شامل ہیں۔ نہ صرف آزاد عدلیہ کا مطالبہ کرنے والے سول سوسائٹی کے بے شمار لوگ اور چوٹی کے وکیل (جس میں سپریم کورٹ بار کے صدر بھی شامل ہیں) قید و بند کی صعوبتیں کاٹ رہے ہیں۔ قصور ان کا صرف یہ ہے کہ عدلیہ اور عوام کے لئے اس آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں جس کی ضمانت آئین پاکستان عطا کرتا ہے۔ لیکن وہ حکومتیں جو آئین کو توڑ کر قائم کی جائیں کب آئین کے تقدس اور تحفظ کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ یہ سب کچھ تو قربانیاں دے کر حاصل کرنا پڑتا ہے۔ از خود نہیں ہو جاتا۔

خود بخود ٹوٹ کے گرتی نہیں زنجیر کبھی
بدلی جاتی ہے بدلتی نہیں تقدیر کبھی

(روزنامہ "نوائے وقت" 15 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

چار قبریں، ایک کہانی

حامد میر

سندھ کی روایات کے مطابق شادی شدہ عورتوں کو موت کے بعد سسرال والوں کے قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی شادی کے بعد سندھی عورتوں کی طرح آصف علی زرداری سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مرنے کے بعد اس قبرستان میں دفن ہوں گی جہاں ان کے شوہر کو دفن ہونا ہے۔ اس وعدے کے مطابق محترمہ بے نظیر بھٹو کو زرداری خاندان کے نواب شاہ میں واقع پانچ سو سال پرانے قبرستان میں دفن ہونا تھا۔ موت سے چند دن پہلے محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے شوہر سے درخواست کی کہ وہ انہیں اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت دے دیں۔ شوہر نے اپنی بیوی کی یہ التجا سن کر اسے کہا کہ وہ موت کی باتیں نہ کرے لیکن بیوی نے شوہر سے پھر کہا کہ وہ ہاں یا ناں میں جواب دے۔ آصف زرداری نے بیوی کو اپنے والد کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت دے دی لیکن اس کے بعد وہ اپنی بیوی کی زندگی کے بارے میں پریشان رہنے لگے۔ 16 اکتوبر 2007ء کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے صدر پرویز مشرف کے نام خط لکھا اور اس خط میں اپنی زندگی کو درپیش خطرات کے بارے میں انہیں آگاہ کیا۔ اسی دن انہوں نے اپنی آخری وصیت تحریر کی اور اسے بلاول کے حوالے کر دیا۔

دو دن کے بعد وہ پاکستان پہنچیں تو 18 اکتوبر کو کراچی میں ان کے جلوس پر بم سے حملہ ہوا جس میں ڈیڑھ سو سے زائد لوگ موت کے منہ میں چلے گئے۔ اس واقعے کے بعد آصف زرداری فوری طور پر پاکستان آنا چاہتے تھے لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو نے انہیں روک دیا۔ آصف زرداری نے دنیا کے سامنے ابھی تک آنسو نہیں بہائے، شائد وہ مخالفوں کے سامنے کمزور نظر نہیں آنا چاہتے لیکن نوڈیرو کے بھٹو ہاؤس میں اس خاکسار کے سامنے اپنی بیوی کی باتیں کرتا ہوا یہ شوہر کئی مرتبہ آبدیدہ ہو گیا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور تھکا ماندہ آصف علی زرداری مجھے بتا رہا تھا کہ 25 جنوری کو ان کی بیٹی بختاور کی 18 ویں سالگرہ ہے۔ بختاور کی ماں کو پتہ تھا کہ 25 جنوری 2008ء کو وہ زندہ نہیں ہو گی لہٰذا ماں نے بیٹی کی سالگرہ سے کئی ہفتے قبل ہی اسے سالگرہ کی نیک تمنائیں بلکہ سالگرہ کا تحفہ بھی پہنچا دیا۔ بیٹی کافی حیران ہوئی کہ اس کی ماں سالگرہ سے کئی دن پہلے ہی اسے سالگرہ کا تحفہ کیوں دے رہی ہے لیکن ماں نے بیٹی کو سوال کرنے کا موقع دیئے بغیر ہدایت کی کہ وہ اپنی تعلیم پر توجہ دے اور چھوٹی بہن آصفہ کا خیال رکھے۔ آصف زرداری بتا رہے تھے کہ موت سے چند دن قبل محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے کچھ قریبی ساتھیوں کو اس قسم کے اشارے دیئے کہ وہ اپنے والد کی 80 ویں سالگرہ کے موقع پر 5 جنوری کو ان کے ساتھ نہیں ہوں گی۔ ان کی اس قسم کی گفتگو سے آصف زرداری مسلسل پریشان تھے اور 26 دسمبر کو پشاور میں ہونے والے بم دھماکے نے اس پریشانی کو مزید بڑھا دیا۔ اسی شام آصف زرداری نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو فون کیا اور کہا کہ وہ پاکستان پہنچ رہے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے ایک دفعہ پھر انہیں روکا لیکن اس مرتبہ آصف زرداری واپسی کے لئے ضد کر رہے تھے لہٰذا طے پایا کہ آصف

زرداری 28 دسمبر کو پاکستان واپس آئیں گے۔ وہ 28 دسمبر کو پاکستان واپس آ گئے لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ انتخابی مہم میں شامل ہونے کے لئے نہیں بلکہ (شاید) انہیں ان کی خواہش کے مطابق ذوالفقار علی بھٹو کے پہلو دفن کرنے کے لئے واپس آئے۔

آصف علی زرداری جانتے ہیں کہ بہت سے لوگ انہیں پاکستان پیپلز پارٹی کا شریک چیئرمین بنائے جانے پر تحفظات رکھتے ہیں۔ آصف زرداری کو یہ بھی احساس ہے کہ وہ بھٹو نہیں ہیں لیکن ان کا کہنا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی پارٹی کی سربراہی میرے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاید اس لئے کہ میں نے گیارہ سال جیل میں گزارے اور اس دوران پارٹی کے کارکنوں سے میرا مسلسل رابطہ رہا، شائد اس لئے بھی کہ مستقبل میں پاکستان کی سلامتی کو درپیش خطرات کا محترمہ بے نظیر بھٹو کو اندازہ تھا، وہ جانتی تھیں کہ ان کی شہادت سے ایک دفعہ پھر صوبائی منافرت کو ہوا ملے گی اور انہیں میری صورت میں وہ شخص نظر آیا جو پنجابیوں، بلوچوں اور پختونوں کی دوستی پر ناز کرتا ہے۔ آصف زرداری کہتے ہیں کہ انہوں نے 20 سالہ ازدواجی زندگی کے گیارہ سال جیل میں گزارے، پانچ سال اقتدار میں اور چار سال اپوزیشن میں گزارے اور ان کا آئندہ کردار وزارت عظمی کے امیدوار کا نہیں بلکہ پیپلز پارٹی کے رکھوالے کا ہے۔ وہ وفاق کی سیاست قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

آصف زرداری کے ساتھ تعزیت کے بعد اگلی صبح میں نوڈیرو سے کچھ فاصلے پر واقع گڑھی خدا بخش پہنچا اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ یہاں پر عجیب و غریب مناظر دیکھنے کو ملے۔ کچھ لوگ قرآن خوانی کر رہے تھے، کچھ لوگ زار و قطار رو رہے تھے اور چوہدری اعتزاز احسن کی اہلیہ بشریٰ اعتزاز گم سم بیٹھی قبر پر ڈالے جانے والے پھولوں کے پیچھے سے محترمہ بے نظیر بھٹو کا چہرہ تلاش کر رہی تھیں۔ حبیب اللہ شاکر کی سربراہی میں آنے والا ملتان بار ایسوسی ایشن کا وفد جئے بھٹو کے ساتھ ساتھ عدلیہ کی آزادی کے حق میں نعرہ بلند کر رہا تھا۔ پیپلز پارٹی پشاور ڈویژن کے صدر ظاہر علی شاہ گلوگیر لہجے میں بتا رہے تھے کہ کس طرح محترمہ بے نظیر بھٹو نے 18 اکتوبر کو کراچی میں چارسدہ کے رہنے والے خوانچہ فروش دیار خان کی بیوہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، کس طرح چارسدہ میں محترمہ نے دیار خان کی بیوہ کے ساتھ دو گھنٹے ملاقات کی، اس بے گھر عورت کی چھ بچیوں کے لئے مکان کا انتظام کیا اور ظاہر علی شاہ کو اس کا ہمیشہ خیال رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ نے کوتاہی کی تو روز قیامت آپ کا گریبان پکڑوں گی۔ ظاہر علی شاہ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو گڑھی خدا بخش کے ایک مقبرے میں واقع چار قبروں کی کہانی سنا رہے تھے۔ یہ کہانی جمہوریت کے لئے دی جانے والی قربانیوں کے گرد گھومتی ہے۔ ان چاروں قبروں پر فاتحہ خوانی کرنے والوں کا تعلق پاکستان کے چاروں صوبوں، آزاد کشمیر اور شمالی علاقہ جات سے نظر آتا ہے۔ ان قبروں میں دفن دو سابق وزرائے اعظم بعد از شہادت بھی وفاق کی علامت ہیں۔ پیپلز پارٹی کی قیادت اور کارکنوں کی بڑی اکثریت بدستور وفاق کی سیاست پر یقین رکھتی ہے۔

پیپلز پارٹی کے امیر و غریب کارکن اپنی لیڈر محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد فاتحہ خوانی کے لئے آنے والوں کی ہر ممکن میزبانی میں مصروف ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ مہمانوں کی زیادہ تعداد بڑے صوبے پنجاب سے آ رہی ہے۔ میں نے سید خورشید شاہ اور ان کے ساتھیوں کو سارا سارا دن پنجاب سے آنے والوں کی خدمت کرتے دیکھا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اسی خورشید شاہ سے کئی سندھیوں نے پوچھا کہ ان کے لیڈروں کی لاشیں بار بار پنجاب سے کیوں آتی ہیں تو وہ صبر کی تلقین کرتے رہے اور جب سوال کرنے والوں کے لہجے سخت ہو گئے تو شاہ صاحب نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ

اللہ کے واسطے شہید بھٹو اور شہید بے نظیر کا راستہ مت چھوڑو، ان دونوں نے پاکستان کے لئے جان دی ہے۔ مخدم امین فہیم سے نثار کھوڑو تک اور آفتاب شعبان میرانی سے صفدر عباسی تک پیپلز پارٹی کے تمام سندھی لیڈروں کو روزانہ ایسے کئی نوجوان ملتے ہیں جو پوچھتے ہیں کہ انہیں انصاف کب ملے گا؟ سکھر، نوڈیرو اور لاڑکانہ میں گزارے گئے تین دنوں میں مجھے کچھ ایسے نوجوان بھی ملے جو پنجابیوں کے حق میں بیان دینے پر آصف زرداری سے ناراض تھے۔ ان نوجوانوں نے مجھے محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ہونے والی لوٹ مار اور ہنگاموں کے متاثرین سندھیوں سے ملوایا۔ ان میں سے کئی سندھی پیپلز پارٹی کے کارکن تھے لیکن مشتعل مظاہرین کو روکنے کی کوشش میں اپنی املاک سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ شکارپور سے نوڈیرو جانے والی سڑک کے دونوں اطراف مسلم لیگ (ق) کے امیدوار برائے قومی اسمبلی غوث بخش مہر کے بینر اور بورڈ بھی سلامت ہیں لیکن انہیں میڈیا نے اہمیت نہیں دی اور صرف جلاؤ گھیراؤ دکھایا۔ سندھی نوجوانوں کا غصہ اور شکوے شکایتیں ایک سیاسی حقیقت ہیں اور اس حقیقت کو محسوس کرنے کے لئے پنجاب کے صحافیوں کو اندرون سندھ کا دورہ ضرور کرنا چاہئے۔ اندرون سندھ کے دورے سے احساس ہوتا ہے کہ جس پیپلز پارٹی کے مخالفین اس پر پاکستان توڑنے کا الزام لگاتے رہے آج پاکستان بچانے کے لئے وہ پیپلز پارٹی کتنی ضروری ہو چکی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی سندھیوں کے لئے ایک گہرا زخم تھا۔ بے نظیر صاحبہ اس زخم کا مرہم تھیں۔ اب یہ مرہم بھی نہیں رہا اور زخم مزید گہرا ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے زخم بگڑ کر ناسور بن جائے پنجاب کو اس زخم کا مرہم بننا ہوگا۔

(روزنامہ ''جنگ'' 7 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

قاتلوں کا انجام قریب ہے

حامد میر

''وہ اپنے قاتلوں کو روزانہ للکارتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ قوم کو ان خطرناک قاتلوں سے نجات دلانے کے لئے اسے اپنی جان کی قربانی دینی پڑے گی۔ قاتلوں کو اپنی بندوق کی طاقت پر اور اسے اپنی قربانی کی طاقت پر ناز تھا۔ وہ گردن تان کر بہادری کے ساتھ قاتلوں کے سامنے کھڑی تھی، اسے سامنے سے گولی کا انتظار تھا لیکن ساری دنیا نے دیکھا کہ بندوق پر ناز کرنے والے بزدل قاتل سامنے سے نہیں بلکہ پیچھے سے حملہ آور ہوئے، قاتلوں کی بندوق سے نکلنے والی گولی اس کی گردن پر لگی، اس نے جان کی قربانی دے کر ان قاتلوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا، اس کی شہادت قاتلوں کی موت بن چکی ہے، قاتل مر چکے ہیں، ان کی لاشیں میرے سامنے پڑی ہیں صرف ان کی موت کا اعلان باقی ہے۔''

مذکورہ بالا الفاظ ایک غریب سندھی عورت کے ہیں۔ یہ عورت گڑھی خدا بخش میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی قبر کے سرہانے بیٹھی اپنے سر میں خاک ڈال رہی تھی اور ماتمی انداز میں 27 دسمبر 2007ء کے سانحہ راولپنڈی پر تبصرہ کر رہی تھی۔ ہچکیوں بھری آواز میں وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ ''قاتل مر چکے ہیں اب پاکستان کو کچھ نہیں ہوگا ہماری شہید شہزادی نے پاکستان کو بچا لیا۔'' آس پاس فاتحہ پڑھنے والے لوگ اس غریب سندھی عورت کے شاعرانہ طرز تکلم پر حیران تھے۔ اس نے کہا کہ موت سب کو مارتی ہے لیکن بے نظیر بھٹو نے شہادت کے ذریعے موت کو مار دیا، اب وہ ہمیشہ زندہ رہے گی اور بہادر لوگ اسی جیسی شہادت کے لئے دعائیں کیا کریں گے۔ پھر چند لمحوں کے لئے وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے اپنے دائیں بائیں موجود حضرات و خواتین کو معنی خیز انداز میں دیکھا اور پھر مدھم آواز میں بولی۔ ''کیا تم نے سنا، شہید بی بی کچھ کہہ رہی ہے، اس کی آواز سنی تم نے، وہ اپنے قاتلوں کے نام لے لے کر انہیں للکار رہی ہے، کیا تم نے یہ نام سنے؟'' اس دوران بلوچستان سے فاتحہ خوانی کے لئے آنے والا ایک قافلہ قبر کے قریب پہنچ گیا اور اس قافلے والوں کے نعروں میں غریب سندھی عورت کی آواز گم ہوگئی۔ یہاں تین پرانی اور ایک تازہ قبر پر پھول نچھاور کئے جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ان چار قبروں نے پاکستان کو ایک زنجیر میں باندھ رکھا ہے۔ کچھ ہی دن پہلے محترمہ بے نظیر بھٹو نے یہاں اپنے والد اور دو بھائیوں کی قبروں پر پھول ڈالے اور فاتحہ خوانی کی تھی۔ آج ان کی اپنی قبر پر پھول ڈالے جا رہے ہیں۔ ان سرخ پھولوں کو دیکھ کر ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کا ہنستا مسکراتا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے، ان کی باتیں یاد آنے لگتی ہیں، ان کی آواز کانوں میں گونجنے لگتی ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ نجانے کچھ لوگ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد بھی ان کے خلاف زہریلا پروپیگنڈہ کرنے سے کیوں باز نہیں آ رہے؟ مجھے کچھ خطوط موصول ہوئے ہیں، ای میلز بھی آ رہی ہیں جن میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے خلاف کرپشن کے الزامات یاد دلائے جا رہے ہیں، امریکہ اور بھارت کے ساتھ ان کے مبینہ گٹھ جوڑ کے حوالے دیئے جا رہے ہیں۔ سرکاری ٹی وی پر ایک پروگرام کے

میزبان نے 28 دسمبر 2007ء کو اپنا انگریزی میں تحریر کردہ مضمون بھجوایا جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو اپنی زندگی میں پاکستان کی سلامتی کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث تھیں اور موت کے بعد ان کی پارٹی پاکستان کی سلامتی کے لئے خطرات پیدا کر رہی ہے۔ میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مہذب معاشروں میں اس دنیا سے چلے جانے والوں پر الزامات نہیں لگائے جاتے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کا حساب کتاب اب اگلی دنیا میں ہوگا کیونکہ ہماری دنیا میں تو ان کے ساتھ کوئی حساب کتاب نہ ہو سکا بلکہ حساب کتاب کی بجائے مفاہمتی آرڈی نینس کے ذریعہ مک مکا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اگر وہ واقعی غلطی پر تھیں تو صرف موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے قاتلوں کو کیسے للکار رہی تھیں؟ کیا کسی بے ایمان کے پاس اتنا مضبوط ایمان ہوتا ہے کہ وہ قاتل کی گولی کے سامنے ڈٹ جائے؟ اگر وہ واقعی ایسی تھیں تو 27 دسمبر کی شام صرف چند ذاتی محافظوں کے ساتھ کیوں نظر آئیں؟ کیا غلط پاکستان میں ایسی بے سروسامانی کے ساتھ گھومتے ہیں؟ اگر وہ بھارت دوست تھیں تو ان کی شہادت سے چند روز قبل 16 دسمبر کو بھارت کے نیشنل سیکورٹی ایڈوئزر ایم کے نارائین نے کرن تھاپڑ کو انٹرویو دیتے ہوئے یہ کیوں کہا کہ بھارت بے نظیر بھٹو پر اعتماد نہیں کر سکتا؟ کیا پیپلز پارٹی کا شریک چیئرمین بننے کے بعد آصف علی زرداری کی طرف سے پاکستان مخالف نعروں کی مذمت وطن عزیز کی خدمت تھی یا وطن کے خلاف سازش؟ یہ درست ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی زندگی کے آخری چند ماہ میں کچھ ایسے بیانات دیئے جن سے اختلاف کی گنجائش موجود تھی۔ خود میں نے بھی کھل کر کہا کہ امریکہ پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ پاکستان میں حقیقی جمہوریت کا فروغ امریکہ کے مفاد میں نہیں۔ میں نے کچھ سیاسی ابن الوقتوں کی پیپلز پارٹی میں شمولیت پر تنقید بھی کی اور پیپلز پارٹی کی طرف سے میری تنقید کا جواب بھی دیا گیا لیکن اس کے باوجود نہ تو محترمہ بے نظیر بھٹو نے میری نیت پر شک کیا اور نہ مجھے ان کی حب الوطنی پر شک تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ بعض اوقات اہل صحافت نے ان کے ساتھ خاصی سنگدلی اور تنگدلی کا مظاہرہ کیا لیکن انہوں نے ہمیشہ اہل صحافت کے ساتھ کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا۔ ایک دفعہ کی بات ہے کہ ایک سینئر صحافی نے محترمہ بے نظیر بھٹو اور حامد ناصر چٹھہ کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ محترمہ وزیراعظم تھیں اور چٹھہ کی جماعت پنجاب میں ان کی اتحادی تھی جہاں منظور وٹو وزیراعلیٰ تھے۔ مذکورہ صحافی صدر فاروق لغاری کے ساتھ مل کر چٹھہ صاحب کو وزیراعظم بننے کے خواب دکھا رہا تھا اور اپنے انگریزی جریدے میں آصف زرداری کے خلاف نت نئی کہانیاں شائع کر رہا تھا۔ ایک دن چٹھہ صاحب نے یہ باتیں محترمہ کو بتا دیں۔ محترمہ نے چند دنوں کے بعد ضیاء الدین، ظفر عباس، زاہد حسین اور میرے سامنے اس اخبار نویس کے ساتھ شکوہ کیا کہ آپ میرے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ موصوف صاف مکر گئے۔ محترمہ سٹپٹا کر رہ گئیں۔ انہوں نے فوراً حامد ناصر چٹھہ کو بلایا اور چٹھہ صاحب نے ہمارے ''فخر صحافت'' کا پول کھول دیا اور یوں صرف اس کا نہیں بلکہ ہم سب کا سر شرم سے جھک گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد محترمہ کی حکومت ختم ہو گئی تو وہ صحافی صاحب فاروق لغاری کی نگران حکومت میں شامل ہو کر محترمہ اور ان کے شوہر کی کھل کر مخالفت کرتے رہے۔ تین مہینے کی وزارت کے بعد جب وہ دوبارہ صحافت کی طرف لوٹ گئے تو محترمہ بے نظیر بھٹو نے ان کے ماضی کو فراموش کر دیا۔

میں ایسے کئی نام لے سکتا ہوں جو بھٹو خاندان کی کردار کشی میں آگے آگے رہے لیکن محترمہ بے نظیر بھٹو نے ان سب کو معاف بھی کیا اور پیپلز پارٹی میں خوش آمدید بھی کہا۔ بہت سے لوگ محترمہ بے نظیر بھٹو کی اس ''رحم دلی'' کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن آج یہ ماننا پڑے گا کہ بے نظیر بھٹو رحم دل

ضرور تھیں لیکن بزدل نہیں تھیں۔ بڑے بڑے دشمنوں کو معاف کرنے کا حوصلہ صرف بہادر لوگوں میں ہوتا ہے۔ بے نظیر بھٹو نے اپنی زندگی میں کئی زندہ ملزموں کو معاف کر دیا لیکن افسوس کہ ان کی شہادت کے بعد کچھ بزدل لوگ ان کے خلاف بول رہے ہیں۔ تاریخ میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے مقام کا تعین ہو چکا ہے۔ تاریخ میں ان کے قاتلوں کے مقام کا تعین بھی ہو چکا ہے لہٰذا شہادت کے بعد محترمہ کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے والے اب ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور ان کے قاتل عبرت کی مثال بنیں گے۔

(روزنامہ ''جنگ'' 3 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

ایک اور بھٹو

طاہر سرور میر

بھٹو صاحب نے کہا ''یہ بات اچھی نہیں کہ لوگوں کے بچے قربانیاں دیں اور میرے بچے نہ دیں۔'' شہید، کا یہ عہد ''پنکی''، ''میر'' اور ''شاہ'' نے پورا کیا۔ بھٹو اور ان کے بچوں (بے نظیر، مرتضیٰ اور شاہ نواز) کو قتل کیا گیا۔ پھانسی، زہر، پولیس فائرنگ اور دہشت گردی جیسے قبیح اور غلیظ منصوبوں پر عمل کیا گیا۔ اب ''پنکی'' اپنے ''پاپا'' کے پہلو میں دفن کر دی گئی ہے۔ اس سے پہلے بھٹو کے ''آنگن'' میں اس کے بیٹوں شاہنواز اور میر مرتضیٰ کے جنازوں کی فصل بوئی گئی تھی۔ اب ''پنکی'' کی قبر بھی گڑھی خدا بخش کے صابر سینے پر سجا دی گئی ہے۔

یہ 3 اپریل 1979ء کی بات ہے۔ جب ''پنکی'' نے اپنے ''پاپا'' سے کہا تھا ''الوداع پاپا۔'' بے نظیر اپنی ماں نصرت بھٹو کے ہمراہ راولپنڈی جیل میں اپنے ''پاپا'' (بھٹو صاحب) سے آخری ملاقات کر رہی تھیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے حکم سنایا ''وقت ختم ہو گیا ہے۔'' پنکی آخری بار اپنے پاپا کے سینے لگنا چاہتی تھی اس نے التجا کی ''میرے والد منتخب وزیر اعظم ہیں، میں ان کی بیٹی ہوں، یہ ہماری آخری ملاقات ہے، مجھے ان سے ملنے دو۔'' مگر انکار کر دیا گیا۔ پنکی اپنی ماں کے ساتھ پھانسی کی کوٹھڑی سے بوجھل قدموں سے واپس آ رہی تھی۔ اس کے بعد اس زندگی میں اپنے پاپا کو دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔ وہ میرے پاپا کو ''قتل'' کرنے والے تھے۔ میں اپنے پاپا کو مر کر دیکھنا چاہتی تھی مگر حوصلہ نہیں پڑتا۔ اتنے میں پاپا کی آواز سنائی دیتی ہے ''ہم جب پھر ملیں گے اس وقت تک خدا حافظ''..... پھر پاپا اور پنکی کی ملاقات 27 دسمبر کی شام 28 سال اور 27 دن بعد ہو گئی۔

بھٹو صاحب کو 4 اپریل 1979ء کو راولپنڈی جیل میں پھانسی دی گئی اور ان کی بہادر بیٹی بے نظیر کو اس سے کچھ فاصلے پر واقع لیاقت علی باغ میں قتل کر دیا گیا..... کیا کہانی ختم ہو گئی؟ آمروں نے اپنے پنجوں سے تاریخ کے دامن سے بھٹو کا نام کھرچنا چاہا مگر ان کے پلید پنجے گھس گئے..... کیونکہ جانثاروں نے، جیئے بھٹو، کا نعرہ نہ صرف خودکشیاں اور خودسوزیاں کرتے بلند کیا بلکہ اسے اپنا عشق اور ایمان جان کر لوح تقدیر پر بھی ثبت کر دیا۔ ''بھٹو'' کو ختم کرنے کا ''پلان'' 28 سال پہلے بھی ناکام ہوا تھا۔ 27 دسمبر کے ''ماسٹر مائنڈ'' بھی خسارے میں رہیں گے۔ یہ ''بھٹو'' کے خون کی تاثیر ہے کہ وہ رگوں میں بہے تو وفاقِ پاکستان کی علامت بنے اور اگر ٹپکے تو قوم کے ماتھے پر حب الوطنی کا جھومر بن کر چمک اٹھے..... محترمہ کتنے بڑے دل کی مالکہ تھیں اور بھٹو خاندان کے پاکستانی قوم پر کس قدر احسانات ہیں، قربانیوں کی اس ''ہزار داستان'' سے کوئی ابوجہل ہی بے بہرہ ہوگا۔ اسٹیبلشمنٹ اور ماضی میں اس کے ''سرغنہ'' جنرل ضیاء الحق کا جرم چھوٹا نہیں تھا۔ تیسری دنیا اور مسلم امہ کے عظیم لیڈر ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد پاکستان سے لے کر افغانستان تک امریکی اسمبلڈ ''جہاد'' کی ایسی فصل بوئی گئی جیسے شاید ہماری آئندہ نسلیں بھی کاٹتی رہیں گی۔ آمروں اور جمہوریت پسندوں میں بنیادی فرق یہی ہوتا ہے۔ آمر عوامی حقوق غصب کر کے ان کی تذلیل کرتے ہیں جبکہ جمہوریت پسند جان کی بازی لگا کر عوام

کو عزت اور انصاف مہیا کرنے کے ساتھ معاشی آسودگی کا اہتمام کرتے ہیں۔ آمروں کی منشاء ایک طرف ملک کی محب وطن لیڈر شپ (بھٹو اور بے نظیر) کو قتل کرانا۔ دوسری طرف مقبول لیڈر شپ کے سامنے ملک کو لسانی اور صوبائی حصے بخروں میں تقسیم کرنے کی مذموم خواہش رکھنے والوں کو سر آنکھوں پر بٹھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں جنرل ضیاء ''مشہور زمانہ'' علیحدگی پسند جی ایم سید کے ہاں ''حاضری'' دینے کے ساتھ ساتھ ایک لسانی جماعت کے غیر سرکاری طور پر ''بانی'' بھی رہ چکے ہیں۔ زمانہ حال میں، سب سے پہلے پاکستان، کے نام پر اس نوع کے دوسرے کارناموں کو ''عوامی طاقت کا مظاہرہ'' قرار دے دیا جاتا ہے۔

خدا کرے بھٹو خاندان اور پیپلز پارٹی پر اس طرح کا برا وقت پھر کبھی نہ آئے۔ مگر اہلیان وطن اور بھٹوز کے سیاسی مخالفین اور وہ قلمکار جو اپنے قلم کو تلوار اور نیزے بنا کر وفا اور حب الوطنی کی اس چادر پر ذیل کے زخم کھینچ رہے تھے، انصاف کریں! آصف علی زرداری سے لے کر ایک عام جیالے تک کسی ایک نے بھی بے نظیر کی لاش پر سندھ کا نوحہ نہیں پڑھا۔ البتہ الطاف حسین اور ظفر اللہ خان جمالی نے یہ کہہ دیا ہے کہ ''کب تک لیاقت باغ (پنجاب) سے منتخب وزرائے اعظم کی لاشوں کو سندھ بھیجا جاتا رہے گا۔'' بے نظیر بھٹو کی شہادت کو جمہوریت کی شہادت قرار دیا گیا ہے۔ قوم اس ذہنیت کا اندازہ کرے جسے جمہوریت سے نہ صرف خوف اور نفرت ہے بلکہ وہ عوام کے حق، حقوق اور لیڈر شپ کو اپنا قاتل تصور کرتے ہیں۔ حکومت محترمہ کے قتل کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کے حوالے سے کس قدر مخلص ہے اس کا اندازہ حکومتی، بریگیڈیئر، کے سوکھے لبوں سے حقائق کی منظر کشی کرتے ہوئے لگایا جا سکتا ہے۔ آصف زرداری اور پیپلز پارٹی نے حکومت کی حکومتی تحقیقات کو نامنظور کیا ہے۔ آصف زرداری اور پیپلز پارٹی نے پریس کانفرنس میں بتایا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو قتل کس نے کرایا۔ وزارت خارجہ کے متذکرہ ترجمان نے ہیلری کلنٹن سمیت دنیا کے دیگر رہنماؤں کی طرف سے اس مطالبہ کو یہ کہتے ہوئے مسترد کیا تھا جس میں کہا گیا تھا پاکستانی حکومت محترمہ کے قتل کی تحقیقات غیر ملکی ایجنسیوں سے کرائے۔ پیپلز پارٹی کا بھی یہی مطالبہ ہے مگر اس ضمن میں حکومتی بریگیڈیئر پیشگی فیصلہ سنا چکے ہیں کہ دہشت گرد پشتو زبان میں دہشت گردی کرتے ہیں۔ ہمارا کلچر اور ہے اور مغرب کا کلچر اور ہے۔ آج سولہ کروڑ عوام یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا قومی سانحات کے ذمہ داروں کو چھپانا ہی ہمارا کلچر ہے؟ ہماری ایجنسیوں نے آج تک کتنے ایسے سانحات کے ذمہ داروں کے بھیانک چہروں سے نقاب کشائی کی ہے۔

ہماری تاریخ حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبانے والوں سے لے کر نواسۂ رسولؐ کا سر نیزے پر اٹھانے والوں سے آلودہ ہے۔ موت کا خوف، بھٹوز، کے ارادوں کو متزلزل نہ کر سکا۔ ''بھٹوز'' ظلم کو نہیں مانتے اس لیے عوامی حقوق کا یہ علم اب ''بلاول'' کو تھما دیا گیا ہے۔ اس نوعمر لیڈر نے اپنے پہلے خطاب میں کہا ہے کہ ''میری ماں ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ جمہوریت عزت سے جینے کا بہترین اصول ہے لہٰذا میں اسی راستے پر چلوں گا جو میری ماں اور نانا کا بتایا ہوا ہے۔'' بلاول کو ظلم کے خلاف ڈٹ جانے اور جمہور سے قربان ہونے کا ورثہ منتقل ہوا ہے..... اے خدا! دعا ہے کہ اسے اس کی ماں اور نانا کے مشن کو جاری رکھنے کی توفیق کے ساتھ عمر خضر بھی عطا کرنا تاکہ دنیا دیکھ سکے آخری فتح سچ کی ہوتی ہے!!!

(روزنامہ ایکسپریس، لاہور 31 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

بھٹو اور "ہمارا ملک"

عباس اطہر

ایک عام تاثر یہ ہے کہ جاگیردار بنیادی طور پر اتنے بہادر نہیں ہوتے کہ موت سامنے کھڑی ہو اور وہ راستہ بدلنے کے بجائے سیدھے اس سے ٹکرا جائیں۔ سر شاہنواز بھٹو کی اولاد میں سے ذوالفقار علی بھٹو، اپنے سوتیلے اور بڑے بھائیوں سے بالکل مختلف شخصیت کے حامل تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک ایسی ماں کے بیٹے تھے جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ جاگیردار خاندان میں انھیں وہ عزت کبھی نہیں ملی جس کی وہ مستحق تھیں۔ اس رویے نے بھٹو صاحب کی شخصیت کے اس رخ کو پروان چڑھایا جو بغاوت اور مزاحمت سے عبارت تھا۔ 1970ء کا الیکشن جیتنے کے بعد ایک پریس کانفرنس میں پس منظر کی وضاحت کرتے ہوئے، آنکھوں میں آنسو بھر کر بھٹو صاحب نے کہا "ہر کوئی میرے والد کا حوالہ دیتا ہے جبکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں ایک غریب ماں کا بھی بیٹا ہوں۔ میں جاگیردارانہ سماج کے ظالمانہ نظام کردار سے آگاہ ہوں بلکہ میں خود ایک وقت تک جاگیردارانہ استحصال کا نشانہ بنتا رہا ہوں۔"

1935ء میں جب میری عمر سات برس تھی میرے والد اس وقت بمبئی کی حکومت میں وزیر تھے۔ ایک دن بمبئی کے گورنر لارڈ برابورن نے میرے والد کو تینوں بیٹوں کے ہمراہ چائے کی دعوت پر بلایا۔ جب میرے بڑے بھائی امداد علی جن کی عمر 21 برس تھی کا تعارف ہو چکا تو گورنر نے بھائی کے بارے میں کہا "کتنا خوبصورت اور جوان آدمی ہے" امداد علی نے ایک تربیت یافتہ ارسٹوکریٹ ہوتے ہوئے جواب دیا "میں اپنے آپ کو بہت مسرور اور مغرور سمجھتا ہوں کیونکہ میری تعریف ہمارے خوبصورت گورنر نے کی ہے۔" جب میری باری آئی تو میں نے باریک آواز میں کہا "ہز ایکسی لینسی گورنر اس لیے خوبصورت ہیں کیونکہ وہ ہمارے خوبصورت ملک کے خون پر پلتے ہیں۔" لارڈ برابورن اس جواب پر ششدر رہ گیا۔ ایک لمحے تک وہ حیرت زدہ میری طرف دیکھتا رہا اور پھر میرے والد سے کہنے لگا اور اس میں شاہنواز آپ کو ایک شاعر اور انقلابی ملا ہے۔ یہی کچھ ہے جو میں ان سارے برسوں میں رہا "ایک شاعر اور ایک انقلابی" اور جب تک میرے جسم میں سے آخری سانس نہیں نکل جاتی میں یہی رہوں گا۔ واپسی پر میرے والد نے کہا "سائیں وہ بات وہاں کرنے کی کیا ضرورت تھی" میں نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا "یہ ہمارا ملک ہے، یہ ہمارا ملک ہے، یہ ہمارا ملک ہے۔"

بھٹو کے کلاس فیلو اور قریبی دوست پیلو مودی نے اپنی کتاب "زلفی مائی فرینڈ" میں لکھا ہے۔ "زلفی جناح کا پکا پیروکار تھا۔ وہ قومی نظریے کی وکالت کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ مسلمان پاکستان کے بغیر اپنے حقوق اور مفادات کا تحفظ نہیں کر سکتے۔" پاکستان بننے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو سے محترمہ بینظیر تک بھٹوز (مرتضیٰ بھٹو سمیت) اسی ضد پر قائم رہ کر لڑتے لڑتے مارے گئے کہ "یہ ہمارا ملک ہے۔" ایوب خان کے دور میں ذوالفقار علی بھٹو نے پہلے وزیر معدنیات اور پھر وزیر خارجہ کے طور پر پاکستان کو امریکہ کے مکمل شکنجے سے نکال کر چین کی طرف راستہ بنایا۔ کشمیر کے لیے پاکستان

کی جنگ کو ''ہم ہزار سال تک لڑیں گے'' کا عنوان دیا۔ ملک ٹوٹنے کے بعد انھوں نے مغربی پاکستان کو ''نئے پاکستان'' کے طور پر دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ وہ امریکہ کی ایما سے اقتدار میں آئے تھے لیکن اسلامی کانفرنس اور ایٹمی پروگرام شروع کرنے جیسے اقدامات کر کے ''واجب القتل'' ٹھہرے۔ سزائے موت سننے کے بعد وہ چند سطری معافی نامہ لکھ کر سیاست سے دستبرداری کا اعلان کر دیتے تو اپنی جان بچا سکتے تھے لیکن ہار ماننے کے بجائے انھوں نے پھانسی قبول کر لی۔

محترمہ بینظیر بھٹو کو باپ اور ماں دونوں کی طرف سے جنگجوئی کا جذبہ ملا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو نے ایوب دور میں اپنے خاوند کی گرفتاری کے بعد سڑکوں پر نکل کر لڑائی لڑی اور ضیا دور میں سر پر لاٹھیاں کھا کر لہولہان ہونے کے باوجود حوصلہ نہیں ہارا۔ باپ کی پھانسی کے بعد محترمہ بینظیر اسٹیبلشمنٹ کی سختیاں اور جیلیں کاٹ کر ملک سے باہر چلی گئی تھیں لیکن جنرل ضیاء کی زندگی میں ہی 10 اپریل 1986ء کو واپس لوٹیں دو مرتبہ اقتدار میں آئیں۔ دوسری وزارت عظمیٰ کے دوران اپنے بھائی مرتضیٰ کو قتل ہوتے دیکھا۔ ساتھ ہی اقتدار سے نکال دی گئیں اور پھر انھیں مقدمات کے ایک طویل سلسلے میں الجھا دیا گیا۔ انھیں ایک بار پھر وطن چھوڑنا پڑا۔

گزشتہ روز لندن کی ایک غائبانہ نماز جنازہ کی ٹی وی کوریج میں، میں نے اپنے ایک دوست اور برطانیہ میں پیپلز پارٹی کے عہدیدار ریاض خان کو زار و قطار روتے ہوئے دیکھا تھا۔ آج اظہار تعزیت کے لیے انھیں فون کیا تو وہ رو رو کر یہ بتا رہے تھے کہ لندن اور پھر دبئی میں، وہ اور ان کے بہت سے ساتھی محترمہ کے پاؤں پکڑ پکڑ کر یہ فریاد کرتے رہے کہ ''دو پاکستان کو بھول جائیں، انھیں قتل کر دیا جائے گا'' لیکن وہ موت کے سفر پر روانہ ہونے کے لیے تلی ہوئی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ آصف زرداری اور بچوں نے بھی انھیں روکا ہوگا لیکن یہ بھٹو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑ جانا اپنے ایمان کا حصہ سمجھتے ہیں۔ محترمہ کو موت کا خوف ہوتا تو وہ باپ کی پھانسی کے بعد بھول جاتیں کہ یہ ''ہمارا ملک'' ہے۔ وہ اپنی جنگجویانہ فطرت سے مجبور نہ ہوتیں تو 18 اکتوبر کے بم دھماکوں کے بعد کراچی لاڑکانہ یا دبئی کی چار دیواریوں میں محدود ہو جاتیں اور پارٹی قیادت کو الیکشن لڑنے دیتیں لیکن وہ تو باقاعدہ وصیت لکھ کر اور اپنی قبر کی جگہ کی نشاندہی کر کے جنگ پر نکلی تھیں۔

(روزنامہ ایکسپریس، لاہور 30 دسمبر 2007ء)

♥ ..... ♥ ..... ♥

''بھٹو اور ہمارا ملک''

(۲)

عباس اطہر

''بھٹو اور ہمارا ملک'' کے عنوان سے میں نے اپنی پہلی قسط اس جملے پر ختم کی تھی کہ ''محترمہ بینظیر بھٹو باقاعدہ وصیت لکھ کر اور اپنی قبر کی نشاندہی کر کے جنگ پر نکلی تھیں''۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جلسہ ختم ہونے کے بعد گاڑی کی ''سن روف'' ہٹا کر کھڑی نہ ہوتیں تو اس خاص وقت پر گولی یا گولیوں سے بچ سکتی تھیں لیکن قاتل جو بھی تھے، وہ تو مسلسل ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے، واقعہ لیاقت باغ میں نہ ہوتا تو پنجاب کے کسی اور شہر میں ہو جاتا کیونکہ کسی نہ کسی وجہ سے یہ سانحہ پنجاب کے کھاتے میں ڈالنا مقصود تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو ہوں یا محترمہ بینظیر، دونوں اس خطے کی نئی جغرافیائی تقسیم کے عالمی منصوبے میں کبھی حصہ دار نہیں بن سکتے تھے نہ ہی وہ پاکستان کو مزید توڑنے کی خواہشمند طاقتوں کے آلہ کار بننے پر تیار تھے۔ بھٹو صاحب امریکہ سے مغربی پاکستان کے تحفظ کی ضمانت لیکر برسر اقتدار آئے تھے پھر ایٹمی پروگرام پر امریکہ سے لڑ گئے۔ محترمہ بینظیر 1986ء میں بھی امریکہ سے اپنی جان کا تحفظ لے کر پاکستان واپس آئیں اور اس مرتبہ بھی امریکہ اور برطانیہ ہی ان کی خیریت کے ذمہ دار بنے تھے۔ دو مرتبہ اقتدار میں رہنے کے دوران خدا جانے وہ امریکہ کے کون سے ارادوں کی راہ میں مزاحم ہوئیں کہ انہیں 9 سال کیلئے دربدر کر دیا گیا۔ امریکہ کے ساتھ بھٹو کا محبت اور نفرت کا عجیب سا رشتہ تھا۔ وہ انہیں اپنے ناگریز ہونے کا قائل بھی کر لیتے تھے لیکن اقتدار میں آ کر یہ ''ہمارا ملک ہے'' والا ایجنڈا نکال کر بیٹھ جاتے تھے اور پھر کام خراب ہو جاتا تھا۔ اسی طرح کا معاملہ میاں نواز شریف کا ہے۔ وہ اپنے ملک کے مفاد کو ایک طرف رکھ کر امریکیوں کی بات نہیں مانتے۔ 9/11 برپا ہونے پر دونوں میں جو بھی اقتدار میں ہوتا۔ وہ یقیناً امریکہ کی ایسی شرائط کو تسلیم نہ کرتا جن کے بارے میں امریکی خود بھی یہ سمجھتے تھے کہ مسترد کر دی جائیں گی۔ ''لیس مین'' نہ ہونے کی وجہ سے یہ دونوں لیڈر ہماری اسٹیبلشمنٹ کو بھی ہضم نہیں ہوتے۔

1996ء میں یہ طے ہو چکا تھا کہ محترمہ بینظیر کو اقتدار اور سیاست سے ہمیشہ کے لیے رخصت کرنا ہے تو میر مرتضیٰ بھٹو کو جو اس وقت متبادل قیادت بن سکتے تھے، قتل کرا دیا گیا۔ ذمہ دار کون تھا آج تک یہ تعین نہیں ہو سکا لیکن کوئی نہ کوئی بین الاقوامی اور قومی مافیا بھٹوز کو ملیامیٹ کر کے سندھ کے قوم پرستوں کیلئے راستہ صاف کرنا چاہتا ہے۔ یہ کوئی سازش ہے تو اس کا تعلق ان نقشوں سے جڑنے میں کوئی ہرج نہیں۔ جو اس خطے کی تقسیم نو پر مبنی ہیں اور علانیہ منظر عام پر لائے جا سکتے ہیں۔

یہ سوال اپنی جگہ معنی خیز ہے کہ وزارت داخلہ کے ایک ترجمان نے محترمہ کی شہادت کے بعد کبھی اچانک دل بند ہونے اور کبھی کنپٹی پر لیور

لگنے کی تصویریاں کیوں پیش کیں جنہیں نجی ٹی وی چینلوں نے گولی چلانے کے مناظر دکھا کر ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ اس سانحہ کی سنگینی کم کرنا مقصود تھی تو بڑی آسانی سے یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ خدا کو یہی منظور تھا یا ہمارے اس عقیدے کا حوالہ دیا جا سکتا تھا کہ موت کا دن مقرر ہے اور اس سے بچا نہیں جا سکتا۔ سامنے نظر آنے والی چیزوں کو کنفیوژ کرنے کا خدا جانے کیا مقصد ہے۔ صرف یہی کہا جا سکتا ہے۔

امور مملکت خویش خسرواں دانند

(اپنی مملکتوں کے معاملات ان کے حکمران ہی بہتر جانتے ہیں)

محترمہ بینظیر کی وصیت سامنے آنے سے پہلے ان کی جانشینی کے معاملے کو متنازعہ بنانے کی کوشش کی گئی اور ابھی تک جاری ہے یہ بھی سوچا جا رہا ہے کہ یہ پارٹی، جو وفاق کی علامت ہے، مختلف حصوں میں بٹ جائے لیکن اس معاملے کو زیر بحث لانے سے پہلے میں جانشینی کے حوالے سے کچھ مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ ان کا سیاسی ورثہ اندرا گاندھی کو منتقل ہوا۔ وہ قتل ہوئیں تو ان کے بیٹے سنجے گاندھی حادثے میں ہلاک ہو چکے تھے۔ وہ اپنے دوسرے بیٹے راجیو گاندھی کو جو ائر لائن پائلٹ تھے اور جن کا سیاست سے تعلق نہیں تھا۔ اپنے جانشین کے طور پر سامنے لا چکی تھیں۔ اندرا کا سیاسی ورثہ راجیو کو منتقل ہوا۔ پھر راجیو بم دھماکے میں ہلاک ہو گئے۔ سنجے اور راجیو دونوں نہرو خاندان کے نہیں فیروز گاندھی کے بیٹے تھے۔ جو اپنی زندگی میں اندرا گاندھی سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے۔ کانگریس نے راجیو گاندھی کو نہرو خاندان کا تسلسل تسلیم کیا اور پھر یہ وراثت اطالوی نژاد سونیا گاندھی کو منتقل ہو گئی جہاں سے یقیناً راجیو کی اولاد کو منتقل ہو گی۔ سیاسی ورثے کسی قانون وراثت کے تحت تقسیم نہیں ہوتے۔ عوامی جماعتوں اور عوام کے جذبات کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ کانگریس سونیا گاندھی کی قیادت میں اقتدار میں واپس آئی، جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عوامی جذبے وراثت کے اصول خود وضع کرتے ہیں اور سیاست میں جانیں دینے والوں کے وارثوں یا جانشینوں کا انتخاب جذباتی وابستگیوں کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ فلپائن کی فوج نے مسٹر کینو کو ائر پورٹ پر قتل کر دیا تھا۔ فلپائنی عوام نے ان کی غیر سیاسی بیوی کوری اکینو کو اپنا لیڈر چن لیا بنگلہ دیش میں شیخ مجیب الرحمٰن اور جنرل ضیاء الرحمٰن کی سیاسی وراثت بالترتیب بیگم حسینہ واجد اور بیگم خالدہ ضیاء کو منتقل ہوئی حالانکہ دونوں کا اپنی اپنی پارٹیوں میں کوئی مقام تھا نہ انہوں نے پہلے کبھی سیاست میں حصہ لیا تھا۔ سری لنکا میں وزیر اعظم بندرانائیکے کے قتل کے بعد ان کی بیٹی سیاسی وارث بنی۔ انڈونیشیا میں صدر سوئیکارنو کی حکومت کا تختہ الٹ کر انہیں نظر بند کر دیا گیا تھا اسی حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن سہارتو کے تین عشروں کے اقتدار کے بعد انڈونیشیا کے عوام ان کی بیٹی سوئیکارنو پتری کو اقتدار میں لے آئے۔ برما میں آنگ سانگ سوچی اپنے والد کی سیاسی وارث ہیں اور ظلم کا مقابلہ کئے جا رہی ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ نوبل انعام پا چکی ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں خان عبدالولی خان کا سیاسی ورثہ اسفندیار ولی کو۔ عبدالصمد اچکزئی کا محمود اچکزئی کو، اکبر بگٹی کا طلال بگٹی کو، عطاء اللہ مینگل کا اختر مینگل کو اور چودھری ظہور الٰہی کا چودھری پرویز الٰہی اور چودھری شجاعت حسین کو منتقل ہوا۔ اسی طرح ہمارے بابائے جمہوریت کے سیاسی وارث ان کے صاحبزادے منصور علی خان ہیں۔

وراثتی سیاست ہمارے خطے میں کوئی نئی بات نہیں، بیویاں اور بیٹے موجود ہوں تو براہ راست ان کو منتقل ہو جاتی ہے اور بیٹیوں کی صورت میں وہ ان کی اولاد کی طرف چلی جاتی ہے۔ محترمہ بینظیر کی شہادت تک پیپلز پارٹی ذوالفقار علی بھٹو کی وراثت تھی۔ جسے بینظیر صاحبہ نے 1979ء میں

بیگم نصرت بھٹو کے سائے میں سنبھالا اور پھر بلا شرکت غیرے اپنے دائرہ اختیار میں کر لیا۔ مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی کے بعد بھی یہ وراثت تقسیم ہو کر بھٹو کے بیٹے کی طرف نہیں گئی۔ مرتضیٰ کے قتل کے بعد غنویٰ بھٹو نے محترمہ اور زرداری کو بالواسطہ طور پر قتل کا ملزم قرار دے کر بھٹو کی سیاسی وراثت کی طرف راستہ بنانے کی کوشش کی تھی۔ ان کی صاحبزادی فاطمہ بھٹو اپنے مضامین میں بینظیر صاحبہ کو مسلسل ہدف ملامت بھی بناتی رہیں لیکن اب سانحہ لیاقت باغ پر غنویٰ بھٹو نے بلاول کی بھٹو قبیلے میں شمولیت اور چیئرمین پارٹی بننے پر اعتراض ختم کر دیا ہے ان کے بچے بھی پیپلز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے فیصلے کو چیلنج نہیں کر رہے، رہے ممتاز بھٹو تو وہ محترمہ بینظیر بھٹو کے کھلے مخالف ہیں اور اس خاندان میں شمار ہی نہیں ہوتے جو ذوالفقار علی بھٹو سے آگے چلا اور محترمہ بینظیر سے گزرتا ہوا آصف زرداری اور بلاول بھٹو زرداری تک پہنچا۔

انتخابات کے "چالیسویں" کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہے۔ اب وہ 8 جنوری کے بجائے 18 فروری کو ہونگے۔ اسی عرصے میں محترمہ بینظیر بھٹو کا 40واں بھی گزر چکا ہوگا۔ نئی انتخابی مہم چلے گی۔ نئے نعرے ایجاد ہوں، نئے الزام اور نئی گالیاں سننے میں آئیں گی اور کوئی بعید نہیں کہ نئے خودکش بمبار یا شارپ شوٹر بھی میدان میں نکلیں اور نئے جنازے اٹھیں۔ خدانہ کرے کہ محرم کے مہینے میں ایک مسلسل ماتم سے گزرتا ہوا ملک تیزی سے کسی ایسے انجام کی طرف روزانہ ہو جائے کہ رونے کیلئے آنکھوں میں آنسو نہ رہیں اور ماتم کی سکت ہی ختم ہو جائے۔

نئے معاملات پر کل بات ہوگی، آج میں محترمہ بینظیر بھٹو کی سیاسی وراثت کے حوالے اپنی بات مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ ذوالفقار علی بھٹو کا ورثہ محترمہ بینظیر کو منتقل ہوا تھا۔ حالات بہت برے تھے لیکن پیپلز پارٹی کی اصل طاقت قائم رہی۔ تقریباً 28 سال کے عرصے میں محترمہ کو تقریباً 4 سال کا اقتدار ملا۔ اس کے باوجود پیپلز پارٹی کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ بھٹو صاحب کے دور کے بڑے بڑے نام عبدالحفیظ پرزادہ، ڈاکٹر مبشر حسن، غلام مصطفیٰ جتوئی، آفتاب احمد شیر پاؤ، فاروق لغاری (صدارت حاصل کر کے بینظیر حکومت توڑنے کے بعد) غلام مصطفیٰ کھر (کبھی راضی ہوئے، کبھی ناراض ہوئے) اور دوسرے چند لیڈر محترمہ کے "انکل شکن" رویے کی وجہ سے پارٹی چھوڑ گئے۔ مرتضیٰ بھٹو کی اہلیہ غنویٰ بھٹو سمیت پیپلز پارٹی کے چھوٹے چھوٹے گروپ بھی بنے۔ لیکن 2002ء کے الیکشن تک بھی صورتحال یہ تھی کہ پیپلز پارٹی سب سے زیادہ ووٹ لے گئی۔ نشستوں کی تعداد بھی اتنی تھی کہ راؤ سکندر اقبال کی قیادت میں ایک بڑا گروپ فلور کراس نہ کرتا تو میر ظفر اللہ جمالی حکومت نہ بن سکتی

ہر بحران میں بھٹو فیکٹر پارٹی کا سہارا بنتا رہا۔ محترمہ بینظیر کی شہادت کے بعد سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ بھٹو فیکٹر کس طرح قائم رکھا جائے۔ مرتضیٰ بھٹو کا خاندان پہلے ہی الگ ہو چکا تھا۔ صنم بھٹو صاحبہ نے کبھی اپنی ذاتی زندگی پر سیاست کو ترجیح نہیں دی۔ ممتاز بھٹو یا کوئی بھی دوسرا بھٹو ذوالفقار علی بھٹو کے خاندان سے کوئی ایسا تعلق نہیں رکھتا کہ سیاسی وراثت پر دعویٰ کر سکے۔ صورتحال کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ 20 سالہ جدوجہد کے نتیجے میں ذوالفقار علی بھٹو کا سیاسی ورثہ محترمہ بینظیر بھٹو کی ذات میں اس طرح مدغم ہو چکا تھا کہ کوئی دوئی نہ رہی تھی۔ قانون وراثت سیاسی وارثوں پر لاگو نہیں ہوتا لیکن اس کے مطابق بھی محترمہ بینظیر کی وراثت ان کے بیٹے، دونوں بیٹیوں اور خاوند کے سوا کسی کے پاس نہیں جاتی۔

محترمہ نے اپنی وصیت میں آصف زرداری کو اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ آصف زرداری حکومتوں اور اپوزیشن کے ادوار میں محترمہ بینظیر کے ہر سیاسی عمل اور راز میں شریک رہے۔ امریکہ میں قیام کے دوران زرداری صاحب نے وہاں کے حکمران حلقوں میں ایک موثر

لابی بنائی جو محترمہ کی وطن واپسی کی بنیاد بنی۔ برطانیہ میں رحمان ملک نے بینظیر صاحبہ کی قبولیت کا راستہ ہموار کیا۔ یہ بین الاقوامی جوڑ توڑ بنیادی طور پر آصف زرداری کے ''کمال فن'' کا نتیجہ تھا۔ جو کارگر ثابت ہوا۔

آصف زرداری نے مجموعی طور پر 8 سال جیل کاٹی۔ اس طویل قید میں انہوں نے بہت کچھ پڑھا اور سیکھا۔ جیل کے اندر رہتے ہوئے، 2002ء کے انتخابات کے بعد امین فہیم کو وزیراعظم بنانے کی پیش کش اور بعد میں صدر مشرف کے ساتھ مفاہمت کے بالواسطہ مذاکرات میں بھی آصف زرداری کو بنیادی کردار حاصل رہا اور صدر مشرف کے بعض اہم مشیر جیل میں جا کر ان سے بات چیت کرتے تھے۔

اگر موجودہ پیپلز پارٹی کی رگ رگ سے کوئی واقف ہے تو وہ صرف آصف زرداری ہیں اور پارٹی کی قیادت انہی کے پاس جانی تھی۔ یہ الگ بات کہ انہوں نے اپنے بیٹے بلاول زرداری کا نام تبدیل کر کے انہیں پارٹی چیئرمین نامزد کرا دیا اور خود شریک چیئرمین کا عہدہ سنبھال کر آئندہ وزیراعظم کیلئے مخدوم امین فہیم کو امیدوار نامزد کر دیا۔

ہمارے ملک کی ایک رسم ہے کہ جب لڑکے والی لڑکی کا رشتہ مانگنے جاتے ہیں تو گزارش یوں کی جاتی ہے کہ آپ ہمارے بیٹے کو اپنی ''فرزندی'' میں قبول کر لیں۔ بڑی بہنوں کے خاوند عام طور پر خاندان میں بھائیوں سے برتر سمجھے جاتے ہیں اور ان کے سسرالی خاندان انہیں معتبر اور بڑا تسلیم کرتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے بھی یہ بات لکھی تھی کہ 27 دسمبر کو محترمہ بینظیر بھٹو کے جس سیاسی ورثے کا سوال اٹھا، اس میں بھٹو صاحب کے خون کے ساتھ محترمہ کا تازہ خون بھی شامل تھا اور یہ ورثہ محترمہ کے خاندان کو ہی جانا چاہئے تھا۔ جس اصول کی بنیاد پر راجیو گاندھی کا ورثہ سونیا گاندھی کو منتقل ہوا، اسی اصول کے حوالے سے محترمہ کے بچے کم عمر ہونے کی وجہ سے آصف زرداری کے اس سیاسی ورثے کے مالک بنتے تھے۔ سیدھے الفاظ میں اسے یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ''حق بہ حقدار رسید''

پیپلز پارٹی کی نئی قیادت کے فیصلے سنٹرل کمیٹی نے متفقہ طور پر کئے ہیں۔ الیکشن ملتوی ہونے کے باوجود سر پر ہے اس لیے پارٹی میں کسی پھوٹ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوگا۔ آصف زرداری بلوچ سندھی ہیں۔ وہ روانی سے اردو بولتے ہیں، انگریزی زبان انگریزوں جتنی جانتے ہیں۔ سندھی ان کی مادری زبان ہے اور پنجابیوں سے زیادہ ٹھٹھہ پنجابی بول لیتے ہیں۔ تدفین کے بعد اپنی پریس کانفرنس میں انہوں نے بھٹو کے متحدہ پاکستان سے متعلق نظریے پر اپنے ایمان کا اظہار یوں کیا تھا کہ پنجاب کی وکالت کرتے ہوئے اس حد تک آگے گئے کہ یہ بھی کہہ دیا کہ محترمہ بینظیر بھٹو کی حفاظت کرتے ہوئے جن نوجوانوں نے اپنے جانیں قربان کیں۔ وہ سارے کے سارے ایسے پنجابی نوجوان تھے جن کو انھوں نے پنجاب کی جیلوں میں اپنی قید کے دوران دوست بنایا تھا۔

آصف زرداری ذاتی طور پر ایک بہادر آدمی ہیں۔ انہوں نے طویل قید کاٹی لیکن اپنی رہائی کیلئے محترمہ بینظیر کو کسی ایسی مفاہمت پر مجبور نہیں کیا۔ جو پیپلز پارٹی کی سیاست کو درہم برہم کر سکتی ہو یا انہیں ہمیشہ کے لیے سیاسی میدان سے باہر کر سکتی۔ بھٹو کی طرح آصف زرداری ایک جنگجو انسان ہیں اور میدان میں کھڑا ہو کر لڑنا جانتے ہیں۔ سانحہ لیاقت باغ کے بعد انہوں نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ اتنے بڑے سانحے کے نتیجے میں ٹوٹنے کے بجائے مزید مضبوط ہو کر ابھرے۔

ذوالفقار علی بھٹو کی ایک نسل کا دور تمام ہوا لیکن ''نئے بھٹوز'' نے ان کا علم زمین پر نہیں گرنے دیا۔ یہ علم بلاول بھٹو زرداری کے سیاست میں آنے تک آصف علی زرداری کے ہاتھ میں آیا ہے اور کئی سال بعد سہی لیکن بالآخر محترمہ بینظیر بھٹو کی اولاد کو منتقل ہوگا۔ پچھلے 28 سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ بھٹو سیاسی طور پر فنا نہ کئے جا سکیں تو جسمانی طور پر ملیا ملیٹ کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ''نئے بھٹوز'' نے اس یقین کو بنیاد بنا کر یہ چیلنج قبول کیا ہے کہ

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

قارئین عباس اطہر وہی مشہور قلمکار ہیں جنھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے عہد میں بھٹو صاحب کی تقریر سے یہ فقرہ اخذ کیا ''ادھر ہم ادھر تم'' اور اخبار آزاد کی سرخی بنایا گو ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اس فقرہ کی وضاحت کی اور بے نظیر صاحبہ شہید نے بھی حتیٰ کہ عباس اطہر نے اس کی ایک انٹرویو میں وضاحت کر دی تھی۔ لیکن متعصب قسم کے قلمکاروں اور مفاد پرست سیاست دانوں نے اس فقرہ کو خلائق زد زبان بنا دیا اور سطحی قسم کے مصنفین نے بھی نصاب کی کتب میں اس فقرہ کو جگہ دے دی۔ بھٹو صاحب اور عباس اطہر کی وضاحت کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا۔ مقام شکر اس مضمون میں عباس اطہر نے کھل یہ لکھ دیا ہے۔ ''ذوالفقار علی بھٹو ہوں یا محترمہ، دونوں اس خطے کی نئی جغرافیائی تقسیم کے عالمی منصوبے میں کبھی حصہ دار نہیں بن سکتے تھے نہ ہی وہ پاکستان کو مزید توڑنے کی خواہشمند طاقتوں کے آلہ کار بننے پر تیار تھے۔''

عباس اطہر کی اس وضاحت کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کی طرف ''ادھر ہم ادھر تم'' کا فقرہ منسوب کرنا پرلے درجے کی تاریخی بددیانتی ہوگی۔

(روزنامہ ایکسپریس، لاہور 3-2 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

پنڈی کے رنگ نرالے ہیں کہ وہ ہر بار جمہوریت کا قتل کرتا آیا ہے

کبھی نسرین انجم بھٹی نے کہا تھا

احمد لطیف

میں ساگر مرزا سندھ دا
میری راول جج چڑھی

اور نجانے کس عالم میں اختر حسین جعفری نے مرثیہ لکھا تھا کہ وہ دسمبر میں جدا ہونے والے پیارے کی موت پر یاد آتا ہے۔

تجھ کو کس پھول کا کفن ہم دیں
تو جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی تھے

یوں تو یہ مرثیہ بے بدل شاعر ایذرا پاؤنڈ پر لکھا گیا تھا لیکن دسمبر میں ہر جدائی پر یاد آتا ہے، اختر نے کربلا سے جو اکتساب کیا اس نے ان کی نظموں کو امر کر دیا ہے ہر دور کا اپنا حسینؑ اور یزید ہوتا ہے اور ہر عہد میں کربلا کی ابتلا قوموں کو آلیتی ہے۔ حسینیت اور یزیدیت کا یہ صدیوں سے جاری ہے۔ بے نظیر عوامیت کی علامت تھی اس کی باتیں ایک ایک کر کے یاد آتی ہیں۔ لیاقت باغ میں اس نے کہا تھا کہ جان کو خطرے میں ڈال کر آئی ہوں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ لیاقت باغ، قاتل باغ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس نے ہمیشہ عوام کے محبوب راہنماؤں کو نگلا، بے نظیر کے قتل کے بعد وطن عزیز کی کیا حالت ہوگی آنے والے دنوں میں یہ خون کس طرح بولے گا یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

یہ خاندان کتنا خوش نصیب اور بدنصیب ہے کہ اس نے ہمیشہ جمہوریت کے لیے جان دی، ذاتی سطح پر دکھ اٹھائے لیکن آمریت کے آگے سر نہیں جھکایا۔ باپ نے پنڈی میں جان دے کر قوم کو سرخرو کیا اور بیٹی نے بھی اسی شہر ستم گر میں جان، جانِ آفریں کے سپرد کی، آمریت اور جمہوریت کے درمیان جو حد فاصل تھی اسے مزید گہرا کر دیا۔ بھٹو کے اس قوم پر جو احسانات ہیں تاریخ انھیں نہیں بھلا سکتی۔ جمہوریت کی اس مدھم ہوتی ہوئی لو کو اس خاندان نے کچھ ایسا رنگ دیا کہ وہ مزید روشن ہو گئی گویا بے نظیر بھٹو نے اپنے لہو کا تیل ڈال کر اس چراغ کو مزید روشن کر دیا۔

لوگوں کا جمِ غفیر لیاقت باغ کی طرف امڈا جا رہا تھا، یہ سلسلہ کئی ماہ سے جاری تھا اور آمریت کب برداشت کر سکتی تھی کہ لوگوں کے دلوں پر راج کرنے والے افراد کے گرد اگرد لوگ دائرہ بنائیں، وہ تو چاہتے ہیں کہ لوگ باہر ہی نہ نکلیں، جلسے جلوس ان کو فشارِ خون میں مبتلا کر دیتے ہیں،

دھماکوں کی منطق ہی یہ ہے کہ لوگ ڈر کر گھروں میں بیٹھ جائیں اور اندھیرے بانٹنے والے کھل کھیلیں۔ لوگوں سے خوف زدہ عمال ازل سے خوف بناتے ہیں اور اسکے لیے خبر کے ہتھیار سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بے نظیر اور نواز شریف کی آمد کے بعد کئی بار یہ خبر اڑائی گئی کہ انکی جان کو خطرہ ہے سو آج پہلے نواز شریف کے جلوس پر فائرنگ کی گئی اور پھر بے نظیر بھٹو کو گولی مارنے کے بعد فوراً بعد خودکش حملہ آور نے خود کو دھماکے سے اڑا لیا۔ اندر کی خبر رکھنے والے کہتے ہیں کہ اب انتخابات بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں، اسکے بعد کیا ہوگا، ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ناکام ریاستوں کی فہرست میں اوپر آتا ہوا ہمارا نام، مزید اوپر آ گیا ہے۔ کیا ہمیں ناکام ریاست بنانا سامراج کی خواہش ہے؟ لگتا تو یہی ہے۔ خدا ہمیں اپنی امان میں رکھے۔

جس بستی میں گل جی جیسے گلاب کا گلا دبا دیا جائے اور اس کی تین دن پرانی لاش اس کے گھر سے برآمد ہو اور سماج کے کان پر جوں تک نہ رینگے اس معاشرے کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔ جس دھرتی پر عالمی شہرت یافتہ خاتون کو قتل کر دیا جائے اس دھرتی کے بارے میں کیا رائے دی جا سکتی ہے۔ بھٹو کے قتل پر مغرب رنجیدہ تھا اور کئی لوگ پاکستانیوں کو اسی باعث مطعون کیا کرتے تھے۔ بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد جو حالت ہوگی مستقبل قریب میں اس کا پتہ چلے گا۔

بے نظیر بھٹو کی طویل جلاوطنی کے بعد پاکستان آمد پر جو کچھ ہوا اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ پاکستان میں آمدہ انتخابات خون رنگ ہوں گے، بے نظیر بھٹو کے جلوس پر خودکش حملے سے بھی یہ بات روز روشن کی عیاں ہو گئی تھی اور آج یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی۔ آج پورا پاکستان سوگوار ہے، سیاہ چادر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، یہی حال 4 اپریل کو تھا اور یہی حال آج 27 دسمبر 2007ء کو ہے۔ دسمبر جدائی کا مہینہ ہے، خزاں رسیدہ ماحول مزید حزن و ملال میں ڈوب گیا ہے خدا پاکستان کو محفوظ رکھے۔ (آمین)

(روزنامہ ایکسپریس، لاہور 28 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

کہانی ختم

عباس اطہر

محترمہ بینظیر بھٹو کی کہانی تمام ہوگئی۔

ساری سیاستیں، مخالفین حمایتیں، نفرتیں اور محبتیں۔ وہ سب کچھ جو ان کی زندگی کا حصہ تھا ماضی کا حصہ بن گیا۔

زندگی اور اس کی حقیقت بس اتنی ہے کہ کوئی نہیں جانتا گلے لمحے نے اپنے دامن میں کیا سمیٹ رکھا ہے۔

محترمہ کی 54 سالہ زندگی کے ابتدائی 24 سالوں کو چھوڑ کر باقی 30 برس ایک چار سالہ اقتدار کے سوا سیاسی اور ذاتی دکھوں کی مسلسل کہانی تھے۔ مجموعی طور پر اسے ایک دکھ بھری زندگی ہی کہا جاسکتا ہے۔ وہ 21 جون 1953ء میں پیدا ہوئیں اور 4 جولائی 1974ء تک یقیناً ایک شاندار زندگی گزاری۔ پہلے کراچی میں تعلیم حاصل کی پھر آکسفورڈ چلی گئیں۔ دوران تعلیم انہوں نے اپنے والد ذوالفقار علی بھٹو کی وزارت عظمیٰ کا زمانہ دیکھا۔ وہ انہیں اپنے جانشین کے طور پر تیار کرنا چاہتے تھے۔ وہ کچھ عرصہ پاکستان ٹیلی وژن پر خارجہ امور پر گفتگو کے ایک پروگرام میں شرکت کرتی رہیں۔ شملہ مذاکرات کے موقع پر بھٹو انہیں اپنے ساتھ لے کر گئے تھے۔ وہ آکسفورڈ میں اپنی تعلیم مکمل کر کے 24 جون 1977ء کو واپس آئیں۔ 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے حکومت کا تختہ الٹ کر بھٹو صاحب کو وزیراعظم ہاؤس سے حراست میں لے لیا۔ چند دن بعد وہ رہا ہو کر کراچی چلے گئے اور پھر انتقام کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ بھٹو قتل کیس میں گرفتار کیے گئے۔ ضمانت پر رہا ہو کر کراچی واپس آئے تو ایک رات 70 کلفٹن پر دھاوا بول کر پورے گھر کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد انہیں مارشل لا ضابطے کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ چلا، لاہور ہائیکورٹ سے سزائے موت ہوئی۔ پھر سپریم کورٹ سے اس کی توثیق عمل میں آئی۔ 4 اپریل کی رات کو وہ بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ سہالہ ریسٹ ہاؤس سے حراست میں نظر بند تھیں۔ جبکہ چند میل کے فاصلے پر ان کے عالیشان باپ کو راولپنڈی جیل میں پھانسی دی جارہی تھی۔ انہیں تدفین سے پہلے اپنے آپ کو بہادر باپ کی بہادر بیٹی ثابت کیا اور بیگم نصرت بھٹو کی معیت میں انتخابی مہم شروع کر دی۔ انتخابی جلسوں میں پیپلز پارٹی صاف جیتتی نظر آتی تھی۔ جس کی وجہ سے ضیاء الحق کو انہیں متوی کرنا پڑا۔

جس سیاسی زندگی کا خاتمہ 27 دسمبر کی شام کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ہوا اس کی ابتداء یہ تھی کہ ''میں چھوٹے جیلر کے سامنے بے بس کھڑی تھی اور میرے ہاتھوں میں بچے کھچے سامان کی ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی اور بس۔ کولون شالیمار کے عطر کی خوشبو ان کے کپڑوں سے ابھی تک آرہی تھی میں نے ان کی قمیض کو اپنے ساتھ بھینچ لیا اور مجھے اچانک کینیڈی یاد آگئی۔ جس نے ریڈ کلف میں اپنے سینیٹر والد کے قتل کے بعد اس کا لباس پہن لیا تھا۔''

انھوں نے باپ کا لباس تو نہیں پہنا لیکن ان کا پرچم اٹھا کر اپنی جنگ جاری رکھی۔ چھ مرتبہ نظر بندی کاٹی، جس میں مچھ جیل کی قید سخت بھی شامل تھی، ظلم کی ایک طویل سلسلے سے گزر کر وہ وطن چھوڑ گئیں لیکن لندن میں بیٹھ کر پارٹی کی قیادت کرتی رہیں۔ 9 اپریل 1986ء کو جلاوطنی ختم کر کے لاہور واپس آئیں اور ان کا شاندار استقبال ملک کی تاریخ کی حصہ تھا۔ 1988ء کے انتخابات میں سب سے زیادہ نشستیں لینے والی پارٹی کی سربراہ کے طور پر انہیں وزارت عظمیٰ مل گئی۔ یہ اقتدار 18 ماہ بعد ختم ہوگیا۔ 1993ء میں وہ زیادہ طاقت سے منتخب ہو کر دوبارہ اقتدار میں آئیں لیکن یہ دوسری حکومت صرف ڈھائی سال چل سکی اور انہیں کرپشن کے ان گنت مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مقدمے میں سزا سنائے جانے سے ایک دن پہلے وہ ملک سے باہر چلی گئی تھیں۔ یہ جلاوطنی 18 اکتوبر کو ختم ہوئی اور انہوں نے اس طرح کراچی میں لینڈ کیا کہ مزار قائداعظم تک لاکھوں لوگ جمع تھے۔ جلاوطنی کے زمانے میں بے نظیر کے سب سے چھوٹے بھائی شاہنواز بھٹو کی پراسرار موت ہوئی، دوسرے اقتدار خاتمے سے پہلے دوسرے بھائی مرتضیٰ بھٹو کو کراچی کی سڑک پر قتل کر دیا گیا۔

سینیٹر ایڈورڈ کینیڈی نے اپنے دو بڑے بھائیوں کے قتل کے بعد امریکی صدارت کی خواہش ہمیشہ کیلئے ترک کر دی تھی لیکن بے نظیر کی بہادری اس کے باوجود برقرار رہی کہ کراچی کے استقبال کے دوران دو بم دھماکوں میں وہ بال بال بچی تھیں۔ موت کا خوف سر پر مسلسل منڈلاتا رہا لیکن انہوں نے اپنی انتخابی مہم جاری رکھی۔ وہ دونوں کی طاقت پر جیتنے اور تیسری بار اقتدار میں آنے کے لیے پُرامید تھیں۔ اقتدار شاید اس لئے ہمیشہ ان کی ریاست کا ہدف رہا کہ وہ اپنے مقتول باپ کے مشن سے کسی قیمت پر دستبردار ہونے کیلئے تیار نہیں تھیں۔ پاکستان کے حوالے سے ذوالفقار علی بھٹو کے کچھ خواب تھے جس میں ہمارا ایٹمی پروگرام شامل تھا۔ انہی خوابوں کی تعبیر کے سلسلے میں محترمہ نے پاکستان کو میزائل ٹیکنالوجی کا تحفہ دلوایا۔

بھٹو، پیپلز پارٹی اور بے نظیر کے لیے میں نے اپنے عقیدت بھرے جذبات کبھی نہیں چھپائے۔ میں بے نظیر صاحبہ پر نکتہ چینی بھی کرتا رہا ہوں۔ خاص طور پر اس حوالے سے کہ انہوں نے موجودہ حکمران سے مفاہمت کو اپنی سیاست اور زندگی کی مجبوری سمجھ لیا تھا اور ایک عالی خاتون ہونے کے باوجود وہ اندازہ نہیں لگا سکیں کہ ملک کے اندر موجود بھٹو کی مخالف طاقتیں ان کا وجود برداشت نہیں کرتیں اور ان کا آخری سیاسی سفر ایک ناگہانی موت پر آ کر ختم ہو سکتا ہے۔

میں بہت کچھ لکھنا اور بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن قلم ساتھ دے رہا ہے نہ دماغ۔ میرے سامنے ٹیلی وژن سکرین پر محترمہ بے نظیر بھٹو کا بند تابوت باہر لایا جا رہا ہے جو دنیا سے اس طرح رخصت ہوئیں کہ گردن اور سر پر گولیوں کے دو زخم تھے اور دل پر باپ دو بھائیوں کے قتل کے داغوں کے علاوہ ایک ایسی ماں کا بوجھ تھا جو مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد ایک چلتی پھرتی لاش میں تبدیل ہو چکی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ایک ہارے ہوئے ملک کو نئی زندگی دی۔ ہم نے اس کے خاندان کا آخری سیاسی چراغ بھی گل کر دیا۔ ہم بھی کیا لوگ ہیں۔ خدا ہم پر رحم کرے۔

(روزنامہ ایکسپریس، لاہور 28 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

شہادت کا سرخ دوشالہ

زاہدہ حنا

کل خوابوں کی روشنی سے دمکتا ہوا آسمان کی طرف دیکھتا ہوا سوالی چہرہ تھا، دعا کے لیے اٹھے ہوئے آرزومند ہاتھ تھے۔ فضاؤں میں گونجتی ہوئی اس کی آواز تھی۔ جو وجد کے عالم میں زندگی کا نعرہ مستانہ لگاتی لاکھوں لوگ اس آواز کے آہنگ پر رقص کرتے تھے۔

آج خواب دیکھتی ہوئی وہ آنکھیں بے خواب ہوئیں، دعا مانگتے وہ ہاتھ شل ہوئے، دلوں میں امید کے چراغ جلاتی ہوئی وہ آواز بجھ گئی۔

اس نے سندھ کے سرمد، صوفی عنایت اور ذوالفقار علی بھٹو کی راہ پر چلتے ہوئے شہادت کا سرخ دوشالہ اوڑھا اور اپنے جاں نثاروں کے شور و شین اور گریہ و بین کی گونج میں تہہ خاک نیند کرنے چلی گئی ۔

اب زمیں کا پیار باقی ہے فقط
آسماں کی مہربانی دیکھ لی

اس کا سوگ صرف اس کا ماتم داروں نے ہی نہیں منایا، ملک کے کروڑوں دل فگاروں کی آنکھوں نے اسے بہ چشم نم رخصت کیا۔ اگر اس کے چاہنے والوں کا یہ عالم تھا کہ نے صبر ہے، نے ہوش ہے، نے تاب و تواں ہے، تو وہ بھی تھے جو اس سے سیاسی اور نظریاتی اختلاف رکھتے تھے مگر وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔

''جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے''

بے نظیر بھٹو کہنے کو پیپلز پارٹی کی رہنما تھیں۔ لیکن ان کے سفاکانہ قتل نے سارے ملک کو دہشت زدہ اور دل زدہ کر دیا، اس قتل کی گونج ساری دنیا میں سنی گئی اور ملکوں ملکوں ان کا سوگ منایا گیا۔ ایسے جیتے جاگتے، خواب دیکھتے اور خواب دکھاتے ہوئے رہنماؤں کی پیدائش کسی بھی سماج کے لیے وقت کی عطا اور اس کی جود و سخا ہوتی ہے لیکن ہمارے یہاں وہ ''حاکم شام'' پائے جاتے ہیں جو ہر دس بیس برس بعد ایسے رہنماؤں کو اپنے اور اپنے ادارے کے اقتدار پر سے صدقہ دیتے ہیں۔ ہمارا ایک منتخب وزیر اعظم تنازع عدالتی فیصلے کی سولی پر چڑھایا گیا، ہماری دو مرتبہ وزیر اعظم منتخب ہونے والی قومی رہنما کو قتل کیا گیا، پھر اس کا قتل نامہ ''القاعدہ'' کے نام درج ہوا، اور دو مرتبہ منتخب ہونے والا ہمارا تیسرا وزیر اعظم جلاوطنی اور ذلت و توہین کے جہنم میں بلایا گیا، اس پر قاتلانہ حملہ کرایا جاتا ہے اور اس کے سامنے بھی صبح و شام اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کی جاری کردہ ''مبینہ ہٹ لسٹ'' لہرائی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اپنے اقتدار مطلق کا اعلان ہے۔ اس بات پر اصرار ہے کہ جمہوریت، آئین اور آزاد عدلیہ کا نام لے کر بلڈی سویلینز ہمارے اقتدار کے لیے خطرہ نہ بنیں ورنہ ہم ایک ایک کو درس عبرت بنا دیں گے۔

وزارت داخلہ کے ترجمان اپنے خشک ہونٹوں پر ہر پانچ سیکنڈ بعد زبان پھیر کر کیسی کمال کہانیاں سناتے ہیں۔ پھر کہا گیا کہ اس خوف ناک دھماکے سے ان کی حرکت قلب بند ہوگئی۔ میڈیا نے کہا کہ انہیں گولی کا نشانہ بنایا گیا، ان کی پارٹی کے رہنما مخدوم امین فہیم اور ناہید خان نے اس بات کی تصدیق کی لیکن وزارت داخلہ کے ترجمان فرماتے ہیں کہ یہ بیت اللہ محسود کا کام ہے۔ وہ میڈیا کو پشتو میں ہونے والے ایک گفتگو سنواتے ہیں، ساتھ ہی اس کا ٹرانسکرپشن صحافیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ چند ایکس رے لہرائے جاتے ہیں، بی بی جس لینڈ کروزر میں سفر کر رہی تھیں اس کی کھلنے والی چھت کے لیور کی تصویر دکھائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ دھماکے سے لڑکھڑا کر بی بی جب گاڑی کے اندر گریں تو یہ لیور ان کے سر پر لگا اور اس کی وجہ سے ان کی جان گئی، اسپتال سے ڈاکٹر مصدق کی ''تصدیق شدہ'' نئی رپورٹ بھی آ جاتی ہے جس میں گولیوں کے بجائے کسی اٹھنی ٹکڑے سے لگنے والی ضرب کا ذکر ہے۔

کوئی وزارت داخلہ کے ان ترجمان سے پوچھے کہ جب ساری ''کارگزاری'' ایک لیوری کی تھی تو پھر بیت اللہ محسود اپنے نوجوانوں کے کس کارنامے پر مولوی صاحب سے گفتگو کر رہے تھے اور دونوں کے درمیان مبارک باد کا تبادلہ ہو رہا تھا؟ بی بی کی وہ آخری جھلکیاں جن میں ایک ہاتھ نمودار ہوتا ہے، ایک پستول گولیاں اگلتا ہے اور انہیں خاموش کر دیا جاتا ہے، وہ کس کا ہاتھ تھا؟ اور اسی پستول کی گولیوں نے ان کی جان لی یا کہیں بلندی پر بیٹھا ہوا کوئی ماہر نشانہ باز رائفل پر لگی ہوئی ٹیلی اسکوپ میں ان کا سر اور ان کی گردن دیکھ رہا تھا؟ جون ایف کینیڈی کا قتل اور اس کی تفصیلات ہم میں سے کون بھلا پایا ہے؟ وہ بھی تو ریاست کے اندر قائم ریاست کی کارگزاری تھی۔ اس قتل پر آج بھی امریکی انٹیلی جنس ایجنسی کے تاریک سائے ہیں۔

بی بی کے قتل کے حوالے سے ہمیں وہ کہانیاں کیوں سنائی جا رہی ہیں جن پر کوئی ذہنی معذور ہی یقین کر سکتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ پستول یا رائفل کی لبلبی پر انگلی تو کسی نامعلوم شخص کی تھی لیکن اس انگلی کو حکم ان سے ملا تھا جو ملک پر اپنا دائمی اقتدار چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ ہر حد عبور کر سکتے ہیں، کسی بھی انتہا تک جا سکتے ہیں۔

حکومت کا اعتبار پہلے ہی کب رہا تھا، بے نظیر بھٹو کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے بعد اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس کی بات سنی جائے گی، اسے وزن دیا جائے گا تو یہ محض اس کی خوش فہمی ہے۔ ان کا قتل کسی سے بھی منسوب کیا جائے، اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری کی ٹیپ چلوا دی جائے تب بھی لوگ کسی بیان، کسی آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ کا اعتبار نہیں کریں گے..... لوگ سب کچھ جانتے ہیں، سب کچھ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جہاں بم کا دھماکہ ہوا وہ جگہ تھوڑی ہی دیر میں کسی محنت اور مہارت سے دھو دی گئی۔ پریشر پائپوں نے خون کے دھبے دھو دیئے، قاتل کے قدموں کے نشان دھو دیے لیکن کیا خون کے دھبے واقعی دھوئے جا سکتے ہیں.....؟ اس پر سہ طرفہ تماشا یہ ہے کہ بے نظیر جیسی قومی رہنما کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ آصف زرداری کی ''خواہش'' پر ہوا۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ بیان درست ہے یا نہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومت ناپسندیدہ سیاسی جماعتوں کے اراکین کی اتنی تابع دار کب سے ہوگئی کہ اس نے پوسٹ مارٹم جیسے بنیادی فرض سے روگردانی کی؟

اور اب بش بہادر سے لے کر چوہدری برادران تک سب ہی کے بیانات آ رہے ہیں کہ انتخاب مقررہ تاریخ پر ہونے چاہئیں۔ چوہدری

برادران تو پیپلز پارٹی کے سوگوار رہنماؤں اور کارکنوں کو یاد دلا رہے ہیں کہ بی بی چونکہ انتخابات میں حصہ لے رہی تھیں اس لیے انہیں ان کی اس خواہش کو وصیت سمجھ کر اس کا احترام کرنا چاہیے اور انتخابات کا بائیکاٹ نہیں کرنا چاہیے۔

کوئی ان سے پوچھے کہ کون سے انتخابات؟ وہ جو اقتدار پر ناجائز قابضین کو اگلے پانچ برسوں کے لیے اس ملک کے سولہ کروڑ لوگوں کی زندگیوں کا ایک مالک و مختار بنا دے؟ کس کی نگرانی میں ہونے والے انتخابات؟ ان کی نگرانی میں جنہوں نے ہر قدم اور ہر مرحلے پر دھاندلی، بددیانتی اور خیانت کا ثبوت دیا ہے؟

اس وقت انتخابات میں حصہ لینا بے نظیر کے شہید خون سے غداری ہے، ان انتخابات میں حصہ لینا بش بہادر کی بچھائی ہوئی بساط کا مہرہ بننا ہے۔ صرف بے نظیر کے جاں نثار ہی نہیں ملک کا ہر باضمیر شہری ان لوگوں سے نفرت کر رہا جو اس ظالمانہ قتل پر مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہیں، سوگ کا اعلان کر رہے ہیں، اخباروں میں تعزیتی اشتہارات شائع کرا رہے ہیں اور لوگوں کے زخموں سے نمک کرتے تھے کیا انہیں ان کی رخصت پر رشک نہیں آیا؟ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ان کے ماتم دار تابوت سے سر ٹکرا کر دھاڑیں مار رہے تھے، بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ ان کے تابوت کو چھونے کی آرزو میں ایک دوسرے پر گر پڑتے تھے۔ ان کے جاں نثار 60 اور 80 گز کے تاریک گھروں اور تنگ گلیوں میں رہنے والے غریب اور غیرت مند لوگ تھے۔ شفیق احمد گوگا اور ظہیر احمد جیسے لوگ۔ شمع جل بجھی اور پروانے بھی اس پر نثار ہو گئے۔ گم نام قبروں میں سو گئے اور اپنے گھر والوں کو فاقوں اور ذلتوں کے سپرد کر گئے۔ اس آس میں کہ شاید کبھی اچھے دن ان کے دروازے پر بھی دستک دیں گے۔

بے نظیر کو ان کے چاہنے والے "چاروں صوبوں کی زنجیر" کہتے تھے۔ میاں نواز شریف ان کا اس سے بڑا اعتراف اور کیا کرتے کہ کل انہوں نے گلوگیر آواز میں انہیں "چاروں صوبوں کی زنجیر" کہا۔ وہ طویل جلاوطنی کے بعد واپس آئی تھیں اس وعدے کے ساتھ کہ ملک میں جمہوریت، رواداری، خوشی، خوش حالی اور انسانوں کے درمیان مساوات قائم کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں گی۔

بے نظیر نے شہادت کا سرخ دوشالہ اوڑھا اور ہم سے رخصت ہوئیں، انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب یہ زندہ رہ جانے والوں کا فرض ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور ان کے خوابوں کی تعبیر کو ممکن بنائیں، دکھے ہوئے دلوں پر مرہم رکھیں..... کہ یہی بے نظیر بھٹو کے غم کے شایان شان ہے۔

(روزنامہ ایکسپریس، لاہور 30 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

آمریت کو للکارنے والی بینظیر آواز خاموش ہوگئی!

تنویر قیصر شاہد

15 جولائی 1969ء کو ذوالفقار علی بھٹو پر سانگھڑ میں، جبکہ ملک میں ایک فوجی جرنیل کی حکومت تھی، حملہ ہوا تو بھٹو صاحب نے کہا تھا Bhuttos die young اور پھر انہوں نے مزید کہا تھا "اس حقیقت کے باوجود میں انشاءاللہ تاریخ پاکستان میں اپنا کردار ادا کر کے جاؤں گا۔"

ذوالفقار علی بھٹو کی زبان سے نکلنے والے یہ الفاظ تاریخ ساز ثابت ہوئے۔ وہ جب جنرل ضیاءالحق کے دور اقتدار میں پھانسی پر لٹکائے گئے تو بھٹو صاحب کی عمر صرف 51 سال 2 ماہ 29 دن تھی۔ بھٹو کو ایک غیر جمہوری دور اور ایک جمہوریت دشمن حکمران کے دور میں جس طرح راستے سے ہٹایا گیا اس نے بھٹو کی سزائے موت کو نہ صرف ہمیشہ کے لئے متنازعہ بنا دیا بلکہ ان کی بے وقت موت نے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک ایسی خلیج کو جنم دیا جو آج تک پاٹی نہیں جا سکی۔ بھٹو خاندان گزشتہ تیس برس سے مسلسل مسائل اور مصائب و آلام کا شکار ہے۔ اس خاندان نے اتنی خوشیاں نہیں دیکھی ہوں گی جتنے دکھ اور غم اسے دیکھنا نصیب ہوئے ہیں۔ زیڈ اے بھٹو کی بے وقت اور غیر فطری موت کے بعد ان کے دونوں صاحبزادگان کو جلاوطنی کی زندگی کے عذاب سے گزرنا پڑا اور ان کی بڑی صاحبزادی محترمہ بے نظیر بھٹو اور اہلیہ محترمہ نصرت بھٹو کو قید و بند اور جیل کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑی۔ وہ بیمار بھی تھیں پھر بھی جنرل ضیاءالحق نے انہیں قید کی سزا دیئے رکھی۔ بھٹو ابھی کال کوٹھڑی میں ہی تھے کہ ان کی اہلیہ اور سابق خاتون اول محترمہ نصرت بھٹو کا لاہور میں پولیس نے سر پھاڑ دیا تھا۔ نصرت بھٹو کا خون آلود چہرہ آج بھی لاتعداد لوگوں کو یاد ہے۔

بھٹو مرحوم کی آل اولاد یہ تشدد، زیادتیاں اور صعوبتیں برداشت کرتی رہی لیکن اس نے جمہوریت کی آواز بلند کرنا اور غیر جمہوری حکمرانوں کے خلاف پرچم بلند کرنا نہ چھوڑا لیکن نصرت بھٹو، بینظیر بھٹو، مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو شاید نہیں جانتے تھے کہ ان کے باپ کا خاتمہ کرنے والی قوتیں مسلسل ان کے تعاقب میں بھی ہیں۔ جنرل ضیاءالحق کے دور میں فرانس کے شہر کینز (Canes) میں جب شاہنواز بھٹو کو زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا تو یہ موت پراسرار ہونے کے باوجود زبان حال سے بہت کچھ عیاں کر رہی تھی۔ شاہنواز کو جب قتل کیا گیا تو بھٹو مرحوم کے اس سب سے چھوٹے صاحبزادے کی عمر محض بیس سال تھی۔ نوجوان شاہنواز بھٹو کا قتل محترمہ بینظیر بھٹو اور ان کی والدہ محترمہ کے لئے صدمہ جانکاہ تھا جس نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی اور نصرت بھٹو وقت سے پہلے ہی بوڑھی ہوگئیں۔ بھٹو خاندان کو تیسرا بڑا صدمہ اس وقت سہنا پڑا جب 1996ء میں کراچی کی ایک معروف شاہراہ پر مرتضیٰ بھٹو کو قتل کر دیا گیا۔ وہ اس وقت رکن اسمبلی بھی تھے اور ایک وزیراعظم بہن کے بھائی بھی لیکن ان کے تعاقب میں لگی قوتوں نے اس سب کے باوجود نہایت چالاکی اور مشاقی سے مرتضیٰ بھٹو کو مار ڈالا اور محترمہ بینظیر سکتے میں آ گئیں۔ جس وقت مرتضیٰ بھٹو کو قتل کیا گیا، اس وقت ان کی عمر 45 سال تھی یعنی انہوں نے پچاس سال بھی عمر نہ پائی۔ ان کے قتل کا سانحہ اسرار کی اتنی تہوں میں گم ہو چکا ہے کہ آج تک قاتلوں کا سراغ نہیں

لگایا جاسکا۔ بلکہ اس پولیس افسر کو بھی مار ڈالا گیا جو مرتضیٰ بھٹو پر فائرنگ میں مبینہ طور پر ملوث تھا۔ مرتضیٰ بھٹو کو مارنے والوں نے نہایت چالاکی سے بےنظیر بھٹو اور مرتضیٰ کے بچوں کے درمیان غلط فہمیوں اور ناپسندیدگی کی دیوار کھڑی کردی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مرتضیٰ بھٹو کی صاحبزادی فاطمہ بھٹو کھلم کھلا اپنے انٹرویوز اور کالموں میں اپنی پھوپھی بےنظیر بھٹو پر الزامات کی بارش کرتی رہی ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کے خاندان کے بارے میں یہ بات بجا طور پر کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے قربانیوں کی لازوال داستانیں رقم کی ہیں اور جمہوریت کی جدوجہد میں مرکزی اور ہراول دستے کا کردار ادا کیا ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے بھٹو کو راستے سے ہٹانے اور بےنظیر بھٹو کے ملک سے چلے جانے سے یہ فرض کرلیا تھا کہ اب بھٹو مرحوم کی پارٹی ''پاکستان پیپلز پارٹی'' کا خاتمہ ہوچکا ہے لیکن جب محترمہ بےنظیر بھٹو محمد خان جونیجو کی وزارت عظمیٰ اور جنرل ضیاء الحق کی صدارت کے دور میں فاتحانہ انداز میں لاہور میں اتریں تو کل عالم نے دیکھا کہ بھٹو مرحوم کا جادو ابھی مدہم نہیں پڑا ہے اور ان کے چاہنے والے بھٹو مرحوم کی شخصیت، آدرشوں، نعروں اور پیغامات کو محترمہ بےنظیر بھٹو کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے آزو بازو میں بسنے والے لوگ اگرچہ بےنظیر کے خلاف نعرہ زن رہے اور ان کی نہایت بھونڈے انداز میں بے بنیاد کردار کشی بھی کرتے رہے لیکن بےنظیر بھٹو ان سب سے بے نیاز ہوکر اور جمہوریت کی شمع تھامے مسلسل آگے بڑھتی رہیں۔ بھٹو مرحوم کی پارٹی اور بےنظیر بھٹو صاحبہ کی مقبولیت کا جادو اور بھی واضح اس وقت ہوا جب جنرل ضیاء الحق کے اقتدار اور زندگی سے رخصت ہونے کے بعد 1988ء میں انتخابات کا رن پڑا تو محترمہ بےنظیر بھٹو جیت سے ہمکنار ہوکر وزیراعظم بن گئیں۔ یہ کامیابی دراصل بھٹو مرحوم کے آدرشوں کی کامیابی اور آرزوؤں کے برآنے کا نام تھا۔

محترمہ بےنظیر بھٹو کو یہ منفرد اور بےمثل اعزاز نصیب ہوا کہ وہ عالم اسلام کی پہلی منتخب وزیراعظم تھیں۔ وہ روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ سیاست کا ڈھنگ انہوں نے اپنے والد گرامی سے سیکھا۔ والد گرامی زیڈ اے بھٹو بھی ان کی اسی لئے اسی انداز میں تربیت کرتے رہے کہ انہیں مستقبل میں پاکستان کی باگ ڈور سنبھالنا ہے۔ وہ اکثر غیر ملکی دوروں میں انہیں اپنے ساتھ لے جاتے تاکہ عالمی لیڈروں سے ان کی ملاقات کے دوران بیٹی کا تعارف بھی ہوجائے اور وہ عالمی امور کے داؤ پیچ سے بھی آگاہ ہوسکیں۔ بھٹو صاحب جب شملہ معاہدہ، جس کے تحت افواج پاکستان کے 90 ہزار جنگی قیدی رہا ہوئے، کرنے بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی سے ملنے گئے تو محترمہ بےنظیر بھٹو ہر حساس میٹنگ میں بھٹو صاحب کے ساتھ ساتھ تھیں۔ محترمہ بےنظیر بھٹو کو بڑے چاؤ سے ان کے والد گرامی نے دو اعلیٰ ترین درسگاہوں میں تعلیم دلوائی۔ برطانیہ کی آکسفورڈ یونیورسٹی سے انہوں نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کی اور وہاں کی طلباء یونین کی وہ صدر بھی منتخب ہوئیں۔ یہ اعزاز پہلی بار بےنظیر بھٹو کی شکل میں کسی ایشیائی طالب علم کے حصے میں آیا تھا۔ اعلیٰ مغربی درسگاہوں سے محترمہ بےنظیر بھٹو نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وزیراعظم باپ سے حکومت کرنے کے اسرار و رموز سیکھے۔ علم اور تجربہ ان کے ہم رکاب تھا۔ جس نے انہیں دنیا کے بہترین اور قابل رشک مدبرین کی صفوں میں شامل کردیا تھا۔ وہ 1988ء میں پہلی بار وزیراعظم بنیں تو ایک زمانے نے ان پر رشک کیا۔ ان کے بعد اگرچہ ترکی میں تانسو چیلر اور بنگلہ دیش میں حسینہ واجد اور بیگم خالدہ ضیاء بھی مسلمان ممالک کی وزیراعظم بنیں تھیں لیکن ان تینوں میں سے کوئی خاتون محترمہ بےنظیر بھٹو سے یہ منفرد اعزاز چھین نہ سکی۔

محترمہ بےنظیر بھٹو کے پہلی بار وزیراعظم بننے سے ملک میں مذہبی قوتوں اور جماعتوں نے ان کے خلاف محاذ کا طومار باندھا لیکن وہ مسلسل

آگے بڑھتی رہیں۔ ان کی وجہ سے دنیا میں پاکستان کا معتدل روشن خیال چہرہ سامنے آیا۔ تقریباً تین سال بعد صدر غلام اسحاق خان نے ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا لیکن اگلے تین سال بعد 1993ء میں وہ دوبارہ وزیراعظم بن گئیں۔ 1993ء سے لے کر 1996ء تک ان کا پونے تین سالہ اقتدار ان کے پہلے اقتدار سے کہیں زیادہ بہتر، باوقار اور یادگار تھا۔ وہ ابھی مزید کارہائے نمایاں انجام دینا چاہتی تھیں کہ صدر فاروق لغاری، جنہیں خود محترمہ بینظیر بھٹو نے صدر بنایا تھا۔ نے ان کا اقتدار ختم کر دیا۔

محترمہ بینظیر بھٹو کا شاندار سیاسی کردار اور ملک کے لئے ان کی خدمات کو جریدہ عالم سے محو نہیں کیا جا سکے گا۔ وہ نواز شریف کی وزارت عظمیٰ کے دور میں جلاوطن ہو گئی تھیں لیکن اب ایک طویل عرصہ بعد 18 اکتوبر 2007ء کو وطن عزیز تشریف لے آئی تھیں۔ ان کے وطن آنے سے قبل انہیں بعض اطراف سے دھمکیاں دی گئیں کہ ان پر خودکش حملہ کیا جائے گا لیکن محترمہ بینظیر بھٹو ان دھمکیوں کی پرواہ کئے بغیر 18 اکتوبر کو کراچی اتر گئیں۔ جس روز وہ شہر قائداعظم میں آئیں، اسی شب ان پر کراچی میں قاتلانہ حملہ کیا گیا جس میں 150 سے زائد لوگ جاں بحق ہوئے لیکن محترمہ محفوظ رہیں۔ اس حملے کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہ خودکش حملہ تھا لیکن محترمہ بینظیر بھٹو بار بار حکومت کے بعض اہم انٹیلی جنس افسروں کی جانب انگشت نمائی کرتی تھیں۔ محترمہ بینظیر بھٹو مسلسل دھمکیوں اور قاتلوں کی زد میں تھیں۔ راستے سے ہٹانے کے لئے جتنی دھمکیاں محترمہ بینظیر بھٹو کو ملیں، اتنی دھمکیاں انتخابات کی مہمات میں شریک کسی دوسرے سیاستدان کو نہ ملیں۔ اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ مخصوص قوتیں جنہوں نے زیڈ اے بھٹو، میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہنواز بھٹو کو قتل کیا تھا، اب وہی قوتیں محترمہ بینظیر بھٹو کو بھی قتل کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن بینظیر صاحبہ ان سے بے نیاز ہو کر مردانہ وار انتخابی مہمات میں شریک ہو رہی تھیں۔ اس دوران ان کے ایک سکیورٹی مشیر رحمٰن ملک نے گزشتہ روز ہی یہ بیان ریکارڈ کرایا تھا کہ حکومت پاکستان نے بینظیر بھٹو کی سکیورٹی کو یقینی بنانے کے لئے جو سکیورٹی آلات فراہم کئے تھے۔ وہ ناکارہ اور فرسودہ تھے۔

ان شکایتوں کے باوجود محترمہ بینظیر بھٹو اپنے قافلے کو آگے ہی آگے بڑھاتی رہیں۔ گزشتہ سے پیوستہ روز، 26 دسمبر 2007ء کو جب محترمہ بینظیر بھٹو پشاور میں جلسہ عام سے خطاب کر رہی تھیں، ان کے عقب میں ایک دھماکہ ہوا۔ یہ دراصل بینظیر بھٹو پر دوسرا قاتلانہ حملہ تھا، لیکن وہ پھر بھی محفوظ رہیں۔ وہ اپنے دائیں بازو پر بندھے امام ضامن کے سہارے منزلوں پر منزلیں مارتی آگے بڑھتی رہیں۔ گزشتہ روز محترمہ بینظیر بھٹو راولپنڈی کے مشہور پارک لیاقت باغ میں جلسہ عام سے خطاب کرنے آئیں۔ جوش و خروش میں بھرے پی پی پی کے کارکنوں نے انہیں دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہا۔ سورج ڈوب چکا تھا اور شام کا اندھیرا دھیرے دھیرے راولپنڈی پر اتر رہا تھا۔ محترمہ بینظیر بھٹو جو زبردست مقرر تھیں، جلسہ عام سے خطاب کرنے سٹیج پر آئیں۔ ابھی ان کے منہ سے "جیئے بھٹو" کے الفاظ ہی نکلے تھے کہ کانوں کے پردے پھاڑنے والا ایک دھماکہ ہوا۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا اور بھگدڑ مچ گئی۔ یہ خودکش حملہ تھا یا ٹائم بم، کسی کو کچھ معلوم نہیں لیکن اس دھماکے نے محترمہ بینظیر بھٹو کے دل کی رگیں بند کر دیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ان کی موت کی تصدیق ہو گئی۔ اس وقت شام کے ساڑھے 6 بجے تھے جب ان کی روح نے ان کے بدن کو الوداع کہا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون!!

پاکستان کی دوبار وزیراعظم بننے والی محترمہ بینظیر بھٹو اس دنیا میں تقریباً 54 برس گزارنے کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملی ہیں۔ اللہ ان

کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس کے اعلیٰ درجات سے نوازے جس جگہ ان کی شہادت ہوئی ہے اسی جگہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان کو شہید کیا گیا تھا اور قاتل اکبر نے خود کو گولی ماری تھی۔ جس جگہ محترمہ بینظیر بھٹو کو شہید کیا گیا ہے اس سے محض دو کلومیٹر کے فاصلے پر وہ جیل تھی جہاں ان کے والد گرامی اور منتخب وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو تختہ دار پر کھینچا گیا۔ والد بھی شہید، بیٹی بھی شہید۔ لیاقت علی خان کے قاتل نہیں پکڑے گئے، مرتضیٰ بھٹو کے قاتل ہنوز روپوش ہیں، اب بینظیر بھی مار ڈالی گئی ہیں۔ ان کے قاتلوں کو کون بے نقاب کرے گا؟ انکے تینوں بچے (بلاول، آصفہ اور بختاور) اپنی بینظیر ماں بینظیر بھٹو سے پلک جھپکتے میں محروم کر دیئے گئے ہیں۔ وہ کون ظالم ہیں جنہوں نے یہ سفاک اور بہیمانہ اقدام کیا ہے؟ جبکہ بینظیر بھٹو شدت پسندی کے سخت خلاف تھیں اور گزشتہ کئی برس سے اس عفریت کی تباہ کاریوں کے بارے میں بیانات دیتی آ رہی تھیں۔ ملک کا شدت پسند طبقہ اور القاعدہ کے ارکان اور وابستگان ان کے دشمن خیال کیے جاتے تھے۔ حقیقت ہے کہ محترمہ بینظیر بھٹو پاکستان کی واحد سیاستدان تھیں جو ملک بھر میں مقبول تھیں۔ ان کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا "چاروں صوبوں کی زنجیر، بینظیر بینظیر" تو یہ محض پی پی پی کا نعرہ ہی نہیں تھا، حقیقت کا عکاس بھی تھا۔ اسے اتفاق ہی کہا جائے گا کہ محترمہ بینظیر بھٹو کو بھی پنجاب ہی میں شہید کیا گیا اور ان کے والد کو بھی پنجاب ہی کے اسی شہر میں پھانسی دی گئی تھی۔

پاکستان کے 16 کروڑ عوام محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت پر افسردہ، غمزدہ اور دل گیر ہیں۔ اب زیڈ اے بھٹو کی اولاد میں سے صرف ایک بیٹی صنم بھٹو رہ گئی ہیں۔ اللہ ان کی حفاظت کرے لیکن یہ الفاظ لکھتے ہوئے ہم محترمہ بینظیر بھٹو کے لئے سوگوار بھی ہیں اور اشک بار، اب اس دنیا میں کوئی دوسری بینظیر بھٹو نہیں رہ گئیں!!! ان کی موت پر جناب فیض رسول فیضان نے ایک قطعہ کہا ہے:

قوم کو کر کے سوگوار گئیں
جیتے جی ورکروں کو مار گئیں
بھر کے اپنا لہو الیکشن میں
بے نظیر اگلے گھر سدھار گئیں

(روزنامہ پاکستان، لاہور 28 دسمبر 2007)

♥.....♥.....♥

بھٹو خاندان، جہد مسلسل

یہ گھرانا بار بار نشانہ کیوں بنتا ہے؟

شیخ مجید

27 دسمبر 2007ء پاکستان کی الم ناک تاریخوں میں ایک اور سیاہ تاریخ بن کر ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گی کہ اس روز صرف ایک سیاسی راہنما محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کا خون نہیں کیا گیا بلکہ ایک تاریخ، تدبر، قومی وحدت، روشن سوچ، غریب عوام اور محنت کشوں کی امید، بین الاقوامی شناخت، جمہوری اور اخلاقی اقدار کو شہید کیا گیا ہے۔ ابھی بارہ مئی اور اٹھارہ اکتوبر کے سانحات ہی سے قوم سنبھل نہیں سکی تھی، ابھی پاکستان پیپلز پارٹی ان واقعات کی تحقیقات کے لیے سراپا احتجاج تھی، ابھی تک حکومت پوری قوم کو اس حوالے مطمئن نہیں کر سکی تھی اور سرکاری تحقیقات پر ہر طرف سے تحفظات کا اظہار کیا جا رہا تھا کہ یہ الم ناک سانحہ رونما ہو گیا۔ اب تک اس سانحے پر حکومت کی جانب سے روایتی انداز اختیار کیا گیا ہے اور معاملات سلجھانے کی نیت ظاہر نہیں ہو رہی بلکہ جان بوجھ کر حقائق کو پوشیدہ کیا جا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے اب تک کے تمام سانحات میں حکومت نے کیا ہے اس سانحے کے فوری بعد جائے حادثہ سے ثبوت ختم کرنے کے لیے صفائی کر دی گئی۔

ماضی میں جس طرح دہشت گردی کا ہر واقعہ الذوالفقار نامی تنظیم پر ڈال دیا جاتا تھا اور اس طرح تحقیقات کے بجائے فائل بند کر دی جاتی تھی، اسی طرح اب ایک اور آسان راستہ ڈھونڈ لیا گیا ہے کہ ہر کام القاعدہ کے کھاتے میں ڈال دیا جائے اور ہر سانحہ کو خودکش حملہ قرار دے کر تحقیقات سے بچتے ہوئے کیس داخل دفتر کر دیا جائے۔ لیکن اس الم ناک سانحے کے معاملے میں تمام تر کوشش کے باوجود دنیا کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونکی جا سکے گی۔ اس سانحے کے بارے میں مختلف حوالوں سے کی گئی رپورٹنگ اور ملکی اور غیر ملکی کیمرہ مینوں کے فوٹیج کو کس طرح چھپایا جا سکے گا؟ غالباً اپنے آٹھ برسوں میں پہلی بار جنرل (ر) پرویز مشرف کی حکومت پہاڑ کے نیچے آئی ہے۔

حکومت سمجھ نہیں پا رہی کہ یہ قتل کسی عام سیاست دان کا نہیں ہوا۔ یہ سانحہ ایک ایسی قائد کے ساتھ پیش آیا ہے جو نہ صرف پاکستان کے کروڑوں غریب عوام کی رہبر اور نجات دہندہ کے طور پر جانی جاتی تھیں بلکہ پوری دنیا کے عوام اور حکومتیں انھیں ایک بین الاقوامی مدبر، سیاسی راہ نما، اور کرشماتی شخصیت کے طور پر ان کا احترام کرتے ہیں۔ تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے اپنا ہنگامی اجلاس منعقد کر کے اس سانحے پر اظہار تعزیت کیا اور حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا کہ وہ فوری طور پر اس سانحے کی شفاف تحقیقات کرے۔ سلامتی کونسل اب تک دو ملکوں کے درمیان جنگ یا کسی ملک پر جارحیت کے واقعات ہی پر ایسے اجلاس منعقد کرتی رہی ہے۔ کیا اس سے حکومت کو محترمہ بے نظیر بھٹو کے عالمی قد کاٹھ کا اندازہ نہیں ہو رہا؟

کچھ اہم حلقوں کی جانب سے یہ اشارہ بھی سامنے آیا ہے کہ جس انداز سے اس سانحے کی پردہ پوشی کی کوشش کی جارہی ہے اس سے خود حکومت کا کردار مشکوک ہوتا جارہا ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو جس انداز سے اب سیاسی طور پر متحرک تھیں اور جس طرح روزانہ جلسوں سے خطاب کررہی تھیں اس سے حکومتی حلقوں میں بے چینی بڑھ رہی تھی، کہ آٹھ جنوری کے عام انتخابات کے طے شدہ نتائج بگڑ رہے تھے اور یہ خطرہ محسوس ہورہا تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی اندازے سے کہیں زیادہ نشستیں لے جائے گی۔ شاید اسی خوف نے کچھ قوتوں کو مجبور کردیا کہ اب سب کچھ ختم کردیا جائے۔ اس سے قبل کچھ ذرائع نے اٹھارہ اکتوبر کے سانحہ پر بھی اسی قسم کی آراء کا اظہار کیا تھا کہ جب بے نظیر بھٹو کے استقبال کے لیے کراچی میں عوام کا طوفان امڈ آیا تو پھر کہیں سے فیصلہ ہوا کہ سب کچھ ختم کردیا جائے۔ یہ تو عوام، پاکستان پیپلز پارٹی اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی خوش قسمتی تھی کہ اس روز محترمہ سمیت پی پی پی کی پوری قیادت محفوظ رہی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر بھٹو فیملی ہی بار بار نشانہ کیوں بنتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید، جو ایوبی آمریت کے خلاف میدان عمل میں آئے، انھوں نے اس وقت ترقی پسند سیاسی قوتوں سے، جن میں طلباء، محنت کش، دانش ور اور زندگی کے ہر طبقے تعلق رکھنے والے جمہوریت پسند عوام شامل تھے، اپنا سیاسی اور نظریاتی رشتہ قائم کیا، اور دنیا نے دیکھا کہ ایک نوزائیدہ سیاسی پارٹی پورے پاکستان کے عوام کی دلوں کی دھڑکن بن گئی۔

بھٹو کے حکومت میں آنے کے بعد ان کے بہت سے فیصلے سامراجی قوتوں اور اسٹیبلشمنٹ کو پسند نہیں آئے اور آخر کار انھیں تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ ان کے بعد کچھ عرصے کے لیے سیاسی قیادت کا بوجھ بیگم نصرت بھٹو کے کاندھوں پر رہا اور پھر پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت محترمہ بے نظیر بھٹو نے سنبھال لی۔ اسی دوران پیرس میں نوجوان شاہنواز بھٹو کو زہر دے کر شہید کیا گیا اور میر مرتضیٰ بھٹو کو اسٹیبلشمنٹ نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت ہی میں شہید کردیا۔ جدید سیاسی تاریخ میں ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے کہ ایک مخصوص خاندان ہی کو نشانہ بنایا جائے، ایسے سیاسی گھرانوں میں امریکا کا کینیڈی، بھارت میں (نہرو خاندان) نیپال کا شاہی خانوادہ اور پاکستان میں بھٹو خاندان شامل ہیں۔

جہاں تک محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کی سیاسی زندگی کا تعلق ہے تو اس میں ذوالفقار علی بھٹو شہید کی صاحبزادی ہونے کے ساتھ اور بھٹو شہید کی کرشماتی شخصیت کا عمل دخل اپنی جگہ ایک حقیقت ہے مگر اپنی کامیابیوں میں خود محترمہ بے نظیر کی علمی و سیاسی بصیرت کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ ہر مسئلے اور ہر معاملے میں محترمہ کا وژن، گہرائی، ٹھہراؤ اور ثابت قدمی نے ان کی شخصیت میں ایک کرشماتی نکھار پیدا کیا۔ سیاست کے پُرخار میدان میں، خاص طور پر پاکستان جیسے ملک میں، جہاں برداشت اور تحمل نہ ہو، ایسے ماحول میں سیاست کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اگر وہ معمولی ہوش و حواس کی مالک ہوتیں تو اٹھارہ اکتوبر کے واقعے کے بعد اگلے ہی روز وہ ملک سے جاسکتی تھیں۔ وہ اٹھارہ اکتوبر کے سانحے کے کچھ روز بعد اپنے بچوں کی پریشانی کی وجہ سے انھیں تسلی دینے دبئی گئیں اور اگلے دن جب ملک میں ایمرجنسی لگی تو وہ فوراً واپس آگئیں اور بڑی بہادری کے ساتھ سیاسی جدوجہد میں مصروف ہوگئیں۔ انھیں بہ خوبی معلوم تھا کہ ان کی جان کو ہر لمحے خطرہ ہے لیکن اس کے باوجود وہ بدامنی سے دوچار صوبہ سرحد اور بلوچستان کے مختلف علاقوں سمیت ملک بھر کے مختلف شہروں میں جلسوں سے خطاب اور مختلف سیاسی راہنماؤں سے ملاقاتیں کرتی رہیں۔ یہ صرف محترمہ بے نظیر بھٹو جیسی نڈر لیڈر ہی کرسکتی تھیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان جیسے ملک میں ایک خاتون ہوتے ہوئے روشن خیال سیاسی نظریات کے ساتھ جدوجہد کی۔ اگرچہ انھیں ہر قدم پر رکاوٹوں کا سامنا تھا، لیکن انھوں نے ایسے وقت میں جمہوری جدوجہد کو آگے بڑھایا کہ جب ملک میں بدترین فوجی آمریت کا دور تھا۔ پاکستان کے عوام ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ جب ہمارے ملک پر جنرل ضیاء الحق کی فوجی بربریت مسلط تھی اور ایک نعرہ لگانے پر پندرہ کوڑے اور تین سال قید کی سزا ہوتی تھی۔ ایسے پُرآشوب دور میں یہ محترمہ ہی تھیں جنھوں نے پارٹی کارکنوں کو منظم کرتے ہوئے اس مشکل ترین جدوجہد کا آغاز کیا۔ جب انھیں عوامی حمایت سے اقتدار ملا بھی تو وہ کیسے حالات تھے۔ محترمہ نے قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کی، لیکن سب سے بڑے صوبے میں کیا ہوا؟ پی پی پی کو قومی اسمبلی کی نشستوں کی اکثریت حاصل ہوئی مگر لسانی رنگ پیدا کر کے پنجاب کی صوبائی اسمبلی کی نشستیں چرا لی گئیں۔ ان کے لیے یہ موقع تھا کہ وہ اس ادھورے اقتدار کو لات مار دیں لیکن انھوں نے ان غریبوں کے لیے بہرطور اقتدار میں آنے کا فیصلہ کیا جو انھیں وزیراعظم دیکھنے کے بے تابی سے منتظر تھے۔ ضیاء دور میں لاتعداد محنت کش اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھو چکے تھے اور صرف اس آس میں زندہ تھے کہ محترمہ اقتدار میں آئیں گی تو انھیں بحال کریں گی، ملک میں ٹریڈ یونین پر پابندی تھی اور ہر مزدور کو یہ امید تھی کہ محترمہ ہی یہ پابندی ختم کریں گی، بے روزگار نوجوانوں کو آس تھی کہ محترمہ ہی انھیں روزگار دے سکتی ہیں، بے زمین کسان بھوک، بیماری اور تنگ دستی میں امید لگائے بیٹھے تھے کہ صرف محترمہ ان کا آسرا ہیں۔ ملک میں ہر سطح پر ناامیدی تھی لیکن سب کو آس تھی کہ محترمہ اقتدار میں آئیں گی اور ان کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ محترمہ نے ان حالات میں اقتدار کے لیے حامی بھری۔ اس موقع پر انھوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ جنرل ضیاء الحق کے گیارہ برسوں میں پاکستان کے محنت کش، کسان، طالب علم اور دیگر غریب عوام محرومی کا شکار رہے ہیں اور ان سے ان کے بنیادی حقوق چھین لیے گئے ہیں، لہٰذا ان کے لیے یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا۔ حالانکہ اس وقت نہ صرف غیروں نے بلکہ اپنوں میں سے بھی بہت سوں نے محترمہ پر تنقید کی کہ یہ فیصلہ درست نہیں ہے۔ برسر اقتدار آنے کے فیصلے کی بابت محترمہ کی نیت اور سوچ کا اظہار بہ حیثیت وزیراعظم ان کی پہلی نشری تقریر سے ہوتا ہے جس میں انھوں نے کہا کہ وہ پی آئی اے سمیت ان تمام محنت کشوں کو ملازمتوں پر بحال کرنے کا اعلان کرتی ہیں، جنھیں جنرل ضیاء الحق نے مارشل لا کے مختلف ضابطوں کے تحت برطرف کر دیا تھا۔ انھوں نے تمام اداروں کی ٹریڈ یونینوں سے پابندی ختم کرنے، عوام کو سہولتوں اور نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کرنے کا بھی اعلان کیا۔ یوں انھوں نے ملک میں پھیلی مایوسی اور بے چینی کو خوشیوں میں تبدیل کر دیا۔ انھوں نے خارجی سطح پر تمام پڑوسی ملکوں سے برابری کی بنیاد پر اچھے تعلقات اور بڑی طاقتوں سمیت تمام ممالک سے دوطرفہ سیاسی، سفارتی اور تجارتی بنیادوں پر تعلقات کو آگے بڑھانے کے عزم کا اعلان کیا۔ ذرا سوچیے! کہ کیا پاکستان میں کوئی انقلاب آ گیا تھا، کیا یہ سب کسی مسلح جدوجہد کے ذریعے ہو گیا تھا؟ نہیں، بلکہ یہ سب ایسے انتخابات میں کامیابی کے ذریعے ہوا تھا جن کے خاصے نتائج ''چوری'' کر لیے گئے تھے۔

اگر محترمہ اقتدار نہ سنبھالتیں تو ملک میں ایک نیا بحران جنم لے سکتا تھا اور گیارہ سال کی مسلسل جدوجہد پر مہم جوئی کی وجہ سے پانی پھر سکتا تھا لیکن بھٹو شہید کی سیاسی وارث نے اپنے عظیم باپ کی سیاسی تربیت اور اپنے وژن کا درست استعمال کرتے ہوئے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ جس قدر بھی غریب عوام اور محنت کشوں کے لیے حاصل کیا جا سکتا ہے وہ حاصل کیا جائے۔ آپ دیکھیں کہ ان کے مقابل موجود قوتیں کس قدر مضبوط تھیں، مخالف

سیاسی جماعتیں، سب سے بڑے صوبے میں مخالف جماعت کا اقتدار، ایجنسیاں اور اسٹیبلشمنٹ، جو ہمیشہ سے پیپلز پارٹی کی دشمن تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اصل مقتدر قوتوں کے لیے ایک خاتون وزیر اعظم کو سیلوٹ کرنا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی محترمہ نے ہمت نہیں ہاری اور جتنا بھی وقت مل سکا انھوں نے محنت کشوں، کسانوں اور غریبوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا۔ چونکہ اسٹیبلشمنٹ اور اصل مقتدر قوتوں نے محترمہ کو پانچ سال پورے نہیں کرنے دیے اور وہی ایک بھونڈا الزام جو سیاست دانوں کو بدنام کرنے کے لیے ہمیشہ لگایا جاتا ہے کہ سیاست داں کرپٹ ہیں محترمہ پر لگا کر وقت سے پہلے ہی ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ دنیا جانتی ہے کہ ایک سیاست داں ہی نے یہ ملک بنایا، وہ بھی سیاست داں ہی تھے جنھوں نے ہتھیار ڈالنے والے سورماؤں کو دشمن کی قید سے نجات دلائی، ملک کا ہزار قبہ آزاد کرایا، ملک کے تحفظ کے لیے تمام تر تحفظات کے باوجود اسے ایٹمی قوت بنایا، ٹوٹے ہوئے ملک کا اعتماد بحال کیا، ملک کی ایک سمت متعین کی، لیکن صلہ کیا دیا گیا؟ قوم کے محسن کو تختہ دار پر چڑھا دیا گیا اور ملک کو ایک بار پھر آمریت کی نذر کر دیا گیا۔

محترمہ جب عوام کی قوت کے ساتھ دوبارہ اقتدار میں آئیں تو ملک میں ایک بار پھر جمہوری آزادیوں کا تصور نمایاں ہوا، مگر دوسرا دور بھی برداشت نہ کیا جا سکا۔ غور کریں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو جو بذات خود پاکستان کے روشن مستقبل کی ضمانت تھیں، جنھیں دوست دشمن سب چاروں صوبوں کی زنجیر کہتے تھے آج ان کے قتل کے بعد کیا ایک بار پھر ملک کی وحدت کا سوال نہیں پیدا ہو گیا؟ کیا ایک بار پھر محنت کشوں کی امیدوں کو اندھیروں میں نہیں دھکیل دیا گیا؟ ملک میں پھیلی دہشت گردی اور بے چینی میں عوام کی امید تھی کہ محترمہ یہ حالات ٹھیک کر دیں گی۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے الیکشن 2008ء کے اپنے مثالی انتخابی منشور کے ابتدائیے میں واضح طور پر کہا ہے کہ ملک میں جب پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت تھی تو ہمیں دنیا کی ابھرتی ہوئی کیپٹل مارکیٹ کہا جاتا تھا۔ 1996ء میں عوامی منتخب حکومت کی برطرفی کے بعد سے پاکستان کو دہشت گردی، انتہا پسندی اور جارحیت کے حوالوں سے پہچانا جاتا ہے۔

تاریخ کے اس موڑ پر محترمہ بے نظیر بھٹو کو شہید کرنے والوں نے ملک کے عوام سے ان کی امید چھیننے کی کوشش کی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ آج پاکستان شاید ایک بار پھر 1979ء کے دور میں پہنچ گیا ہے کہ جب ملک کے پہلے منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو فوجی آمریت نے تختۂ دار پر چڑھا کر ملک کے عوام میں محرومی اور مایوسی پیدا کر دی تھی اور اس خلاء کو محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھٹو شہید کی طرح اپنی کرشماتی لیڈر شپ سے پُر کیا تھا۔ آج پھر ہر طرف مایوسی اور ناامیدی پیدا کرنے والے بھول گئے ہیں کہ بھٹو خاندان ہی دراصل پاکستان کے محنت کشوں، کسانوں اور مفلوک الحال عوام کی امیدوں کا چراغ ہے وہی ان کا نجات دہندہ ہے، وہ انھیں محرومی اور مایوسی کے دلدل میں نہیں دھنسنے دے گا۔

چیئرمین ماؤزے تنگ نے ایسے ہی موقع کے لیے کہا تھا کہ غم کو طاقت میں بدل دو۔ ماضی میں بھی پاکستان کے عوام نے گڑھی خدا بخش بھٹو سے ہی اور اس غم سے طاقت حاصل کی تھی۔ کل بھٹو شہید اپنے سیاسی فلسفے کے ساتھ عوام کی قیادت کر رہے تھے، آج خود محترمہ بے نظیر بھٹو شہادت کا درجہ حاصل کر کے شہید بھٹو کے پہلو میں موجود ہوتے ہوئے بھٹو خاندان کے ایک روشن چراغ کی طرح اور بھٹو شہید کے آدرش کے ساتھ عوام کی راہنمائی کریں گی اور محرومی اور مایوسی کے بجائے مفلوک الحال غریب عوام کی ڈھارس اور ان کی مشکلات کے حل کا سبب بنیں گی۔

پاکستان پیپلز پارٹی آج ایک رویہ اور شناخت بن گئی ہے، اسی طرح بھٹو ایک روشن علامت ہے، کسی نے ٹھیک کہا ہے:

یہ بازی خون کی بازی ہے
یہ بازی تم ہی ہارو گے
ہر گھر سے بھٹو نکلے گا
تم کتنے بھٹو مارو گے

(روزنامہ ایکسپریس، لاہور 2 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

روح کی آواز

عظیم سرور

لندن میں جب بی بی نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تو ان کی روح ان کو بتا رہی تھی کہ وہاں کچھ ہونے والا ہے۔ انہوں نے کئی لوگوں سے اس کا تذکرہ کیا۔ ہر ایک نے کہا "بی بی، نہ جاؤ" لیکن جانے والے کہاں رکتے ہیں۔ وہ کب کسی کی سنتے ہیں وہ تو آنکھیں بند کر کے چلے جاتے ہیں۔ یوں جیسے وہ دانستہ ان کا جانا بوجھا رستہ ہو۔ بی بی نے کئی لوگوں کو اپنی روح کی آواز کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے ان خدشات کے بارے میں تحقیقات بھی کیں اور یہ بھی کہا۔

لاؤ تو قتل نامہ میرا، ہم بھی دیکھ لیں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

پھر انہوں نے ایک خط میں اس محضر نامے میں لکھے گئے ناموں کی نشاندہی بھی کی۔ اپنے دوستوں کو ای میل بھی لکھے ان میں بھی ناموں کے ساتھ اپنی روح کی آواز کی بات کی۔ 18 اکتوبر کو کراچی روانگی سے پہلے دبئی ایرپورٹ پر بھی انہوں نے اس بات کا تذکرہ کیا۔ وہ کہتی تھیں کہ میرے قتل کی سازش ہو رہی ہے لیکن میں پاکستان کو بچانے کے لئے اور پاکستان کے عوام کی خاطر پاکستان ضرور جاؤں گی۔ 18 اکتوبر کی رات کا خوفناک دھماکہ 160 انسانوں کی جان لے گیا۔ یہ دھماکا بی بی کے لئے ایک دھمکی تھا یا ایک ناکام کوشش تھی؟

ملک میں انتخابات کا اعلان ہو گیا۔ 8 جنوری کی تاریخ پولنگ کے لئے مقرر ہوئی اور پیپلز پارٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ ملک میں عوام کی حکومت کے لئے ووٹ ہی کی طاقت حاصل کی جائے گی۔ بی بی نے الیکشن کی مہم کا آغاز اس طرح کیا کہ وہ پورے پاکستان کو ایک لڑی میں پرو رہی تھیں۔

الیکشن کا آغاز انہوں نے کوئٹہ کے جلسے سے کیا۔ مطلب بلوچستان کے زخموں پر مرہم رکھنا تھا۔ پھر اس کے بعد انہوں نے لاڑکانہ میں جلسہ کیا اور سندھیوں کو پاکستان کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے پشاور میں جلسہ کر کے صوبہ سرحد میں ہونے والی کارروائیوں کی مذمت کی۔ اس کے بعد ان کا جلسہ پنجاب کے شہر راولپنڈی میں ہوا۔ میں نے پہلی بار ٹیلیویژن پر ان کی پوری تقریر سنی۔ اس تقریر میں انہوں نے اپنی مہم کا سلسلہ قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ قائم کرتے ہوئے کہا کہ قائداعظم نے ووٹ کی طاقت اور عوام کے ساتھ سے پاکستان بنایا۔ انہوں نے کہا کہ ہم بھی عوام ہی کی طاقت سے پاکستان کو بچائیں گے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں صاف الفاظ میں کہا کہ ہم کسی کو اپنے ملک میں داخل نہیں ہونے دیں گے ہم اپنے مسئلے خود حل کریں گے۔ انہوں نے باجوڑ، وزیرستان اور سوات میں ہونے والی کارروائیوں کی مذمت کی۔ ایٹمی طاقت کے حوالے سے انہوں نے اپنے والد کی قومی خدمات کا تذکرہ کیا اور پھر میزائل ٹیکنالوجی کے لئے اپنی کوششوں کا ذکر کیا۔ بی بی نے بھارت کے ایٹمی

قوت بننے کے موقع کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ ذوالفقار علی بھٹو تھے جنہوں نے کہا تھا کہ ''ہم گھاس کھالیں گے لیکن ایٹم بم بنائیں گے'' راولپنڈی کے لیاقت باغ میں کی جانے والی ان کی آخری تقریر پاکستان کے اتحاد اور یکجہتی کے لئے ایک پراثر تقریر تھی۔ اس تقریر کے بعد وہ بہت خوش تھیں۔ وہ اپنے کارکنوں اور ساتھیوں سے باتیں کرتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ لیاقت باغ کے پرجوش کارکن ان کی گاڑی کے گرد جمع ہو گئے تھے انہوں نے گاڑی کی سن روف کھولی اور کھڑے ہو کر کارکنوں کے نعروں کے جواب میں ہاتھ ہلانے لگیں۔ ایسے میں تین گولیوں کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی ایک دھماکا ہوا اور گاڑی کے گرد لاشیں گر گئیں۔

اس دھماکے کے ذریعے لیاقت باغ کی تاریخ کو دہرایا گیا۔ 1951ء میں جب سید اکبر نے لیاقت علی خان پر گولیاں چلائیں تو فوری طور پر سید اکبر کو بھی گولی مار کر خاموش کر دیا گیا تھا۔ یہاں بھی یہی ہوا کہ جیسے ہی قاتل نے گولیاں چلائیں اور گولی ہدف پر لگ گئی تو فوری طور پر دھماکے کے ذریعے اس کو بھی اڑا دیا گیا۔ جائے حادثہ پر بھگدڑ مچ گئی۔ لاشیں اور زخمی ہٹانے کے فوراً بعد فائر بریگیڈ کی گاڑیاں لا کر جائے حادثہ کو پانی کے پریشر سے صاف کرایا گیا۔ سی این این یہ منظر دکھاتے ہوئے تبصرہ کر رہا تھا کہ جائے وقوعہ سے سارے نشانات مٹانے کی یہ کارروائی مجرمانہ کارروائی ہے۔ CNN پر یہ منظر دیکھتے ہوئے فیض کا مصرعہ یاد آ رہا تھا

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ

اس المناک سانحے کے بعد لوگوں نے اپنے اپنے حساب چکانے شروع کر دیئے۔ وہ جارج بش جو 7 سال میں آج تک یہ تو پتہ نہ چلا سکے کہ اسامہ، ایمن یا ملا عمر کہاں ہیں لیکن ان کو یہ فوری پتہ چل گیا کہ یہ کارروائی القاعدہ نے کی ہے۔ ہمارے حکمرانوں نے بھی اپنی تقریر میں کہا کہ یہ انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کی کارروائی ہے۔ عوام کے تمام طبقوں کا بھی یہی خیال تھا کہ یہ کارروائی دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کی کارستانی ہے لیکن ان کی نظر میں دہشت گرد اور انتہا پسند امریکہ ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال را کی طرف جاتا تھا اور کچھ اسے موساد کی کارستانی بھی بتاتے تھے۔ پاکستانی وزارت داخلہ نے کہا کہ یہ کارروائی بیت اللہ محسود نے کی ہے۔ وزارت داخلہ کے ایک ترجمان نے پریس کانفرنس میں ریکارڈنگ بھی سنا دی۔ ساتھ ساتھ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ محترمہ کا انتقال سن روف کا لیور سر میں لگنے سے ہوا ہے۔

وزارت داخلہ کے نمائندہ ریٹائرڈ بریگیڈیئر صاحب نے اس پورے سانحے کی جو تھیوری بیان کی اس کو پریس کانفرنس میں موجود شاید ہی کسی صحافی نے تسلیم کیا ہو۔ پیپلز پارٹی کے نمائندوں نے بھی اس تھیوری کو رد کر دیا۔ اس عرصے میں راولپنڈی جنرل ہسپتال کے ڈاکٹر کی پریس کانفرنس بھی کروا دی گئی۔ انہوں نے بھی کہا کہ یہ سانحہ سن روف کا لیور سر میں لگنے کی کارروائی ہے۔ ایک صحافی کہہ رہا تھا ''یہ بیان بیت اللہ محسود کو بچانے کے لئے دیا گیا ہے چنانچہ سزا کے طور پر اب سن روف کے لیور کو پھانسی دی جائے گی۔''

ہمارے برادر ملک سعودی عرب کے شاہ عبداللہ نے اپنے تعزیتی بیان میں اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان میں جنگل کا قانون نافذ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ شاہ عبداللہ پاکستان سے بہت محبت کرتے ہیں وہ شاہ فیصل کی طرح دل کی گہرائیوں سے پاکستان کے بہی خواہ ہیں۔ اس لئے انہوں نے اس سانحے میں اس درد کو بھی محسوس کیا ہے لیکن ہم بہت ادب کے ساتھ عرض کریں گے کہ پاکستان میں تو 50 سال سے جنگل کا

قانون نافذ ہے لیکن اب پاکستان میں کچھ دردمند، کچھ جج اور وکیلوں کی پوری برادری اور طالب علم کوشش کر رہے ہیں کہ پاکستان کو آئین اور قانون کی سرزمین بنا دیا جائے۔ بے نظیر بھٹو نے بھی اپنی آخری تقریر میں اس درد کا اظہار کیا تھا۔ اگر ان کے خون سے پاکستان میں آئین کا راج قائم ہو جائے۔ قانون کی طاقت کو تسلیم کر لیا جائے اور الیکشن کمیشن کو بااختیار ادارہ بنا دیا جائے تو ہم سمجھیں گے بے نظیر کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ یوں ان کی روح بھی شاداں و فرحاں ہوگی۔ پھر ان کی لیاقت باغ والی تقریر کے الفاظ ایک حقیقت کا روپ دھار لیں گے کہ

قائداعظم نے پاکستان بنایا　　قائد عوام نے آئین بنایا
اور بینظیر نے پاکستان بچایا　　بینظیر نے آئین بچایا

(روزنامہ "جنگ" 31 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

دختر مشرق کا آخری سفر

اشتیاق بیگ

طیارے کے پائلٹ نے بھرائی ہوئی آواز میں طیارے کی روانگی کا اعلان کیا۔ سسکیوں اور آہوں کی گونج میں طیارہ فضا میں بلند ہوا طیارے کی منزل محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کے گاؤں نوڈیرو کے قریب کا ایئر پورٹ تھا۔ یہ طیارہ خصوصی طور پر چارٹرڈ کیا گیا تھا تاکہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی تدفین میں بیرون ممالک سے آئے ہوئے ان کے رشتہ دار، دوست اور پارٹی کے سینئر رہنما شرکت کر سکیں۔ طیارے میں ہر آنکھ اشک بار تھی میں نے مردوں کو بھی دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے دیکھا۔ میری برابر والی نشست پر محترمہ بے نظیر بھٹو کی کزن اور ان کے شوہر علی جعفری کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے میں نے دوسروں کو حوصلہ دینے اور صبر کی تلقین کرنے کی کوشش کی لیکن خود اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکا دل میں پھیلنے والے طوفان کو روکنا بہت مشکل تھا۔ میری پچھلی نشست پر انسانی حقوق کی رہنما عاصمہ جہانگیر اور سینیٹر رضا ربانی ایک دوسرے سے مل کر رو رہے تھے میری اگلی نشست پر بے نظیر کی کئی دوست جو دبئی اور لندن سے تدفین میں شرکت کے لئے آئی تھیں زار و قطار رو رہی تھیں جنہیں میرے بھائی اختیار بیگ دلاسہ دے رہے تھے۔ اس پرواز کے اکثر لوگ دو ماہ قبل بے نظیر بھٹو کی پاکستان آمد پر بھی ان کے ہمراہ تھے اس وقت ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے آج کی یہ پرواز 18 اکتوبر کی اس پرواز سے یکسر مختلف تھی جب ایسے ہی ایک طیارے میں محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے دوستوں، ساتھیوں، پارٹی کے کارکنوں اور مداحوں کے ساتھ نعروں کی گونج میں پاکستان کے لئے روانہ ہو رہی تھیں۔ آج ان کے وہی ساتھی آنکھوں میں اشک لئے دختر مشرق کو ابدی سفر پر روانہ کرنے کے لئے جا رہے تھے میں بحیثیت کالم نویس جمہوریت کے اس سفر میں محترمہ کے ہمراہ تھا۔ نہ جانے کیوں اس موقع پر یہ شعر میرے لبوں پر آ رہا تھا

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم
جو چلے تو جاں سے گزر گئے

دو ماہ قبل بے نظیر بھٹو صاحبہ کی پاکستان واپسی کے سفر کے وہ مناظر میری نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ جب وہ آٹھ سال کی جلاوطنی کے بعد جمہوریت کی بحالی کے لئے پاکستان واپس آ رہی تھیں جمہوریت کے اس سفر میں، میں بھی محترمہ کے ہمراہ تھا۔ سفر کے دوران ایک موقع پر مجھے ان سے بات کرنے کا موقع ملا میں نے محترمہ سے کہا کہ میں اسے اپنے لئے اعزاز سمجھتا ہوں کہ جمہوریت کی بحالی کے اس سفر میں آج میں بھی آپ کے ساتھ شریک ہوں۔ میں نے ایک کالم نویس کی حیثیت سے ان سے یہ سوال کیا کہ پاکستان میں آپ کی جان کو خطرات لاحق ہیں کیا وہ کوئی خوف محسوس کر رہی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں خوش ہوں کہ میں جمہوریت کی بحالی کے لئے اپنے ملک پاکستان جا رہی ہوں۔ انہوں نے

مجھے یہ بھی بتایا کہ مجھے اطلاعات ملی ہیں کہ وہاں میری جان کو خطرہ ہے اور مجھ پر حملہ ہوسکتا ہے لیکن میں موت سے نہیں ڈرتی میں اپنے ملک کے غریب عوام کے پاس جارہی ہوں۔ میں نے حکومت کو ان خطرات سے آگاہ کردیا ہے اب میری حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے۔ کوئی سچا مسلمان اپنی بہن کی جان نہیں لے سکتا کیونکہ اسلام عورت کے احترام کا درس دیتا ہے نہ کہ اس کے قتل کا۔

پاکستان کو ایسے کڑے وقت میں میری ضرورت ہے میں پاکستان کے لئے اپنی جان تو قربان کرسکتی ہوں لیکن پاکستان کو مفاد پرستوں کے ہاتھوں قربان ہوتے نہیں دیکھ سکتی انہوں نے ایسا ہی کیا وہ پاکستان پر قربان ہوگئیں۔ دو گھنٹے کے اس سفر میں میں نے ان کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے بھی کسی خوف اور گھبراہٹ کے آثار نہیں دیکھے میں نے ان کے چہرے پر اس وقت ایک ایسا سکون دیکھا جسے اس وقت نہ سمجھ سکا لیکن آج ان کی شہادت کے بعد مجھے یہ سمجھ آیا کہ یہ بے خوفی اور سکون اللہ تعالیٰ شہادت سے قبل اپنے ان بندوں کو عطا کرتا ہے جنہیں اللہ کی قربت نصیب ہونے والی ہوتی ہے۔

بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد ان کی اور محترمہ کی تدفین میں ایک قدر مشترک یہ تھی کہ اس وقت کا آمر اور آج کی حکومت دونوں یہ چاہتے تھے کہ تدفین جلد سے جلد ہوتا کہ لوگوں کی بڑی تعداد اس میں شریک نہ ہوسکے۔ چونکہ ذرائع نقل وحمل بند تھے اس لئے میرا خیال تھا کہ شاید تدفین میں صرف چند ہی لوگ پہنچ پائیں گے لیکن میں نے ہزاروں لوگوں کو پبلک ٹرانسپورٹ اور ٹرینوں کی آمدورفت بند ہونے کے باوجود پیدل نوڈیرو کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے کچھ نوجوانوں کو اپنے بوڑھے والدین کو کندھوں پر بٹھائے پیدل جائے تدفین کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ جب محترمہ کی نماز جنازہ ان کے آبائی قبرستان گڑھی خدا بخش میں ادا کی جارہی تھی تو لاکھوں کا مجمع وہاں موجود تھا، ہر طرف رقت آمیز مناظر تھے۔ میں نے وہاں موجود لوگوں کی آنکھوں میں شدید غم وغصہ اور ناراضگی کے جذبات دیکھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ بے نظیر کو اپنے علاقے میں ایک شہزادی کی حیثیت حاصل تھی لوگ ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے وہ غریبوں کی شہزادی (Peoples Princess) تھیں۔ لوگ مجھ سے یہ سوال کررہے تھے کہ ہمارے ساتھ ہی یہ ظلم کیوں ہوا کہ ہمارے لئے دو بار لاشوں کے تحائف کیوں بھیجے گئے۔ میں اپنے لئے اسے ایک اعزاز سمجھتا ہوں کہ میں ان کے جمہوریت کے سفر میں ان کے ساتھ تھا اور مجھے یہ بھی اعزاز حاصل ہوا کہ میں نے ان کے آخرت کے سفر میں ان کی میت کو کندھا دیا۔ ایک بات جو میں اپنے قارئین سے شیئر کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی میت کو کندھا دیتے ہوئے مجھے اپنے کندھوں پر کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوا اللہ اپنے نیک بندوں کو موت کے بعد گناہوں سے ہلکا پھلکا کردیتا ہے۔ اکتوبر میں جب بے نظیر بھٹو پر قاتلانہ حملے کے بعد وہ اپنے آبائی گاؤں لاڑکانہ آئیں اپنے والد کی قبر پر حاضری دینے گئیں اور اپنے والد بھٹو شہید کی قبر کے پہلو میں بیٹھ کر انہوں نے دو گھنٹے اپنے والد کے ایصال ثواب کے لئے تلاوت قرآن پاک کی، اٹھتے وقت انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میری موت کے بعد مجھے اسی جگہ اپنے والد کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ انہیں شاید اندازہ ہوگیا تھا کہ بہت جلد بھٹو کی بیٹی اپنے باپ کی آغوش میں ہوگی۔

تدفین کے وقت محترمہ کی قبر پر مٹھی بھر مٹی ڈالتے ہوئے میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہر باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد اس سے زیادہ ترقی کرے آج بے نظیر نے اپنے باپ کی اس خواہش کو پورا کردکھایا۔ بے نظیر نے ایک عورت ہوتے ہوئے بھی جس بہادری سے جمہوریت کی خاطر

اپنی جان قربان کی اور وہ امر ہو گئیں مرنے سے پہلے بے نظیر بھٹو کے آخری الفاظ "جیے بھٹو" تھے۔ قبر پر فاتحہ پڑھتے ہوئے ایک موقع پر میری نظریں بلاول کی نظروں سے ملیں تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھیں مجھ سے یہ سوال کر رہی ہوں کہ میری والدہ کو شہید کیوں کیا گیا ان کا کیا قصور تھا ہمارے ہی خاندان کے ساتھ ایسا ظلم کیوں؟ میں وہاں کھڑا شہید کی ضعیف ماں نصرت بھٹو کے متعلق سوچ رہا تھا جنہیں اپنے شوہر اور دو بیٹوں کی شہادت کا صدمہ سہنا پڑا شاید وہ اپنی چہیتی بیٹی بے نظیر کی شہادت کا غم برداشت نہ کر پائیں۔ میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی قبر کے پاس کھڑا بھٹو خاندان کی قبریں دیکھ رہا تھا اس خاندان نے پاکستان کے لئے بے پناہ قربانیاں دیں اور مجھے یہ لوگ کسی اور ہی دنیا کے باسی لگے جنہیں اللہ تعالیٰ نے کسی خاص کام کے لئے اس دنیا میں بھیجا تھا اور پھر انہیں شہادت کی موت کا عظیم رتبہ دیا۔

بے نظیر کو اپنے قتل کا خدشہ یقین کی حد تک تھا اکتوبر میں ان پر قاتلانہ حملے کے بعد انہوں نے سی این این کے وولف بلٹزر (Wolf Blitzer) کو ایک درمیانی واسطے کے ذریعے ایک ای میل روانہ کی جس میں ان سے یہ وعدہ لیا کہ اسے اس وقت منظر عام پر لایا جائے جب وہ اس دنیا میں نہ ہوں اس ای میل میں انہوں نے اپنی سیکورٹی کے خدشات کا اظہار کیا تھا اور اپنے قتل کے ذمہ داروں کا ذکر کیا تھا۔ ایک دوست ملک نے بے نظیر بھٹو کو خبردار کیا تھا کہ دسمبر کے آخری دنوں میں ان پر قاتلانہ حملہ ہو سکتا ہے یہ اطلاعات بھی صحیح ثابت ہوئیں۔ بے نظیر نے دوست ملک کی یہ اطلاع بھی حکومت کو دے دی تھی۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ اپنی سیکورٹی کے متعلق بے نظیر بھٹو بار بار حکومت سے اپنے خدشات کا اظہار کرتی رہیں لیکن راولپنڈی میں ان کے آخری جلسے کے بعد جب وہ روانہ ہوئیں تو صرف ایک انسپکٹر اور چند پولیس اہلکار وہاں موجود تھے دو مرتبہ پاکستان کی وزیر اعظم منتخب ہونے والی مقبول رہنما کے لئے یہ وہ حفاظتی اقدامات تھے جو حکومت نے کئے۔ موت کے بعد بھی جب انہیں دفن کیا جا رہا تھا تو وہاں بھی سیکورٹی کے کوئی اہلکار موجود نہیں تھے۔ میں نے نوڈیرو میں بے نظیر کے گھر کے باہر دیوار پر ان کی تصویر کے ساتھ یہ نعرہ لکھا ہوا دیکھا

یہ بازی خون کی بازی ہے
یہ بازی تم ہی ہارو گے
ہر گھر سے بھٹو نکلے گا
تم کتنے بھٹو مارو گے

یہ نعرہ میں پہلے بھی دیکھتا تھا لیکن اس وقت میں اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا آج بے نظیر بھٹو کی تدفین میں شریک میں نے لاکھوں بھٹو دیکھے تو مجھے اس نعرے کا مفہوم سمجھ میں آیا۔ ہر آمرانہ دور میں بھٹو خاندان نے آمریت کا مقابلہ کیا۔ اگر بھٹو چاہتے تو ضیاء الحق سے سمجھوتا کر کے ملک سے باہر جلاوطنی کی زندگی گزار سکتے تھے۔ بھٹو نے ایوب، یحییٰ اور ضیاء الحق کی آمریت کا مقابلہ کیا اور شہادت کے وقت اپنی بیٹی کو یہ درس دے گئے کہ آمروں کے آگے کبھی نہ جھکنا بھٹو کی بیٹی نے باپ کی نصیحت پر عمل کیا اور آمروں کے آگے جھکنے کے بجائے بہادری سے ایک عورت ہوتے ہوئے اپنی جان دے دی اور شہادت سے پہلے اپنے بیٹے بلاول کو وہ درس دے گئیں جو ان کے باپ نے ان کو دیا تھا۔ اگر وہ چاہتیں تو وطن واپسی کے بعد کراچی میں ہونے والے حملے کے بعد وطن سے واپس دبئی جا سکتی تھیں اور وہاں ایک اچھی زندگی گزار سکتی تھیں بے نظیر کی شہادت بھٹو خاندان کی

قربانی کا ایک سلسلہ ہے جس کو ذوالفقار، شاہ نواز اور مرتضیٰ جاری رکھتے آئے ہیں اب بے نظیر نے بھی اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ آمریت کی یہ ایک اور شکست ہے۔

میں جو مارا گیا تو رویا زمانہ خون کے آنسو
انہیں پتہ چلا میری موت نے قوم کو یتیم کر دیا

(روزنامہ ''جنگ'' 2 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

محترمہ بے نظیر کی شہادت کی تفتیش اور قلمکاروں کے تحفظات

بے نظیر بھٹو کی شہادت

قاتلوں کا سراغ کیسے ملے گا؟

طارق اسمٰعیل ساگر

کسی بھی بڑے طوفان کے بعد تباہی کے جو مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں وہ اس طوفان کا منطقی ردعمل ہوتا ہے جس سے نمٹنے کے لیے زندہ قومیں اپنے تمام اسباب بروئے کار لاتی ہیں اور ملک کی تعمیر نو کی تدبیر کرتی ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت بھی ایک بڑا قومی المیہ تھا۔ اس سانحہ کا منطقی ردعمل گو کہ بڑا بھیانک تھا لیکن آج بھی یہ سوال جواب طلب ہے کہ لوٹ مار، گھیراؤ جلاؤ اور دیگر مجرمانہ نوعیت کی وارداتوں کے مرتکب کیا صرف پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کے ہی کارکن تھے؟ حکومت کی طرف سے اس کا جواب یقیناً ہاں میں ہوگا لیکن وہ حکومت جس کی کریڈیبلٹی عوام کے نزدیک ختم ہو چکی ہو، اس کی بات اگر سچ بھی ہو تو کوئی اس پر کان دھرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہاں تو معاملہ ہی الٹ دکھائی دے رہا ہے اور غیر جانبدارانہ رپورٹس سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کا ردعمل سوگوار اور غصہ میں بھرے کارکنوں کا ردعمل تو تھا لیکن یہ ''گھیراؤ جلاؤ'' کرنے والے کوئی اور تھے جنھوں نے بڑے منظم انداز سے سینکڑوں ویگنوں کو جلایا، بینکوں کو لوٹا اور بعض اطلاعات کے مطابق خواتین کی بے حرمتی کے مرتکب بھی ہوئے۔ یہ لوگ کون تھے؟ یقیناً ہماری باخبر ایجنسیوں کو اس کا علم ہوگا۔ یہ الگ بات ہے بہت سے دیگر معاملات کی طرح اس مسئلے پر بھی عوام کو اندھیرے میں رکھ کر انتخابی نتائج کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی انتہائی بھونڈی اور خوفناک مہم چلائی جا رہی ہے اور بدبختی کی انتہا تو یہ ہے کہ اپنی گرتی ساکھ کو سنبھالا دینے کے لیے اس نوعیت کی بیان بازی اور اشتہاری زبان استعمال کی جا رہی ہے جس کا مقصد سوائے صوبائی اور لسانی فسادات کو ہوا دینے کے اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ شاید اس بدقسمت قوم نے یہ دن بھی دیکھنے تھے جب ہمارے سیاستدان اپنی ذاتی دشمنیاں اور تعصبات کی تسکین کے لیے ملکی سالمیت سے کھیل رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم کرے اور چند روزہ غلامانہ قسم کے اقتدار کی ہوس میں مبتلا ہمارے ان سیاستدانوں کو توفیق عطا کرے کہ وہ اپنی انا اور افلاطونی سیاست کو ایک طرف رکھ کر ملکی سالمیت کے حوالے سے سوچنا شروع کریں۔

بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ہمارے ارباب اختیار نے جس بے رحمی سے پاکستان کی ساکھ کو داؤ پر لگایا ہے وہ بھی ایک قومی المیے سے کم نہیں۔ شہادت کے اگلے ہی روز وزارت داخلہ کے ترجمان بریگیڈیئر ریٹائرڈ جاوید اقبال چیمہ نے خدا جانے کیوں عالمی اور پاکستان پریس کو اکٹھا کر کے عجیب و غریب قسم کا بیان داغ دیا کہ محترمہ کی موت ان کی گاڑی کے لیور سے ہوئی اور ان کو بیت اللہ محسود نے قتل کروایا ہے۔ جب وہ اپنا بیان

مکمل کر رہے تھے، باخبر اور حالات پر نظر رکھنے والوں کو دکھائی دے رہا تھا کہ انھیں شاید مکمل بریفنگ دی ہی نہیں گئی یا پھر وہ اپنی دانست میں عوامی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اس نوعیت کا بیان دے رہے ہیں جو مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ان کے اس بیان کا تو پریس کانفرنس ہی میں موجود صحافیوں نے تیا پانچہ کر دیا تھا لیکن اس کے بعد سے آج تک مسلسل عجیب و غریب قسم کے سرکاری بیانات آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبان دو مرتبہ اپنی رپورٹس تبدیل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر مصدق نے کہا ہے کہ انھوں نے کبھی لیور کے ذریعے موت واقع ہونے کی بات نہیں کی۔ اگلے روز گاڑی بنانے والی کمپنی کا بیان آ گیا کہ انھیں معاف ہی رکھا جائے کیونکہ لیور سے موت واقع نہیں ہو سکتی، جس کے بعد گولیاں چلانے والوں کے ویڈیو کلپس عالمی نشریاتی اداروں نے جاری کر دیے اور حکومت نے بھی گولی سے موت ہونے کی تصدیق کرنا شروع کر دی۔ اس کے بعد لیزر بیم کا تذکرہ ہوا اور اب پیپلز پارٹی نے ہسپتال کے ڈاکٹروں کی وہ رپورٹ جاری کر دی ہے جس میں موت کی وجہ گولی لگنا بتایا گیا ہے۔ صدر محترم نے اپنے ایک ٹی وی انٹرویو میں فرمایا ہے کہ گولی لگنے سے بھی ممکن ہے ان کی موت واقع ہوئی ہو جس کے بعد آپ نے یہ کہہ کر سارا ابہام ختم کر دیا کہ بے نظیر بھٹو اپنی موت کی خود ذمہ دار ہیں، نہ وہ گاڑی میں کھڑی ہوتیں اور نہ ان کی شہادت ہوتی۔ اس پر بی بی سی نے تبصرہ کیا ہے کہ اب تو صدر محترم نے فیصلہ سنا ہی دیا پھر سکاٹ لینڈ یارڈ والے کیا جھک مار رہے ہیں۔

جہاں تک حکومتی موقف کا تعلق ہے تو حکومت نے شہادت کے اگلے ہی روز یہ کیس ختم کر دیا تھا جب بریگیڈیئر چیمہ صاحب نے اخبار نویسوں کو قاتلوں کے نام بھی بتا دیے، ان کی ریکارڈنگ بھی فراہم کر دی اور موت کی وجہ بھی بیان کر دی لیکن صدر محترم کی طرف سے ممکنہ گولی کی بات اور بیت اللہ محسود اور طالبان کی طرف سے شدت سے اس کی مخالفت اور حکومتی بیان کو جھوٹ اور مضحکہ خیز قرار دے کر بندر کی بلا طویلے کے سر منڈھنے کی کوشش اس لیے ناکام بنا دی کہ امریکہ بہادر بھی جانتا ہے کم از کم ابھی طالبان کو اتنی زیادہ سیاست نہیں آئی جتنی ہمارے حکمرانوں نے سیکھ لی ہے اور وہ اگر کوئی ایسی حرکت کریں تو اس کا الزام بڑے فخر سے اپنے سر لیتے ہیں جبکہ یہاں معاملہ ایسا نہیں تھا اس لیے امریکہ نے واضح کر دیا کہ اس قتل میں القاعدہ یا طالبان کے ملوث ہونے کے امکانات دکھائی نہیں دے رہے۔ اس مضحکہ خیز صورتحال سے امریکہ آخر کیوں فائدہ نہ اٹھائے۔ بی بی سی کی ایک خبر کے مطابق ایک امریکی اخبار نے بتایا ہے کہ وائٹ ہاؤس کے اعلیٰ سطحی اجلاس میں پاکستان کے قبائلی علاقہ میں امریکی فوجیں اتارنے پر غور کیا گیا ہے۔ اخبار کے مطابق اس میٹنگ میں پاکستانی سرزمین پر سی آئی اے اور امریکی فوج کو پاکستان کے قبائلی علاقوں میں دہشت گردوں کے خلاف جارحانہ مگر خفیہ کارروائی کرنے پر غور کیا گیا۔ نیویارک ٹائمز کے مطابق امریکی سیکورٹی مشیروں کی میٹنگ اس پس منظر میں ہو رہی ہے جب القاعدہ نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے بعد پاکستان میں کارروائیاں بڑھا دی ہیں اور پاکستان کے سیکورٹی ادارے ان کے خلاف موثر کارروائی کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس میٹنگ میں پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد پاکستان میں پیدا ہونے والی صورتحال اور 18 فروری کو ہونے والے انتخابات پر بھی غور کیا گیا۔ امریکی سیکورٹی مشیروں کی اس میٹنگ میں کئی مشیروں کا موقف تھا کہ اس وقت پاکستانی صدر جنرل (ر) پرویز مشرف انتہائی غیر مقبول ہو چکے ہیں اور انھیں امریکی فوج اور سی آئی اے کی طرف سے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں کارروائیوں کی کھلی چھٹی دینے پر اعتراض نہیں ہوگا۔

امریکہ نے پاکستانی قبائلی علاقوں میں امریکی کارروائی سے متعلق صدر پرویز مشرف کو کوئی تجویز ابھی نہیں دی ہے۔ امریکہ کے پالیسی

سازوں کا خیال ہے کہ پاکستان کے نئے آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی امریکی تحفظات پر زیادہ ہمدردانہ رویہ رکھیں گے۔ امریکی مشیروں کا خیال ہے کہ اس وقت پاکستان کے قبائلی علاقوں تک اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کا بہترین موقع ہے۔ ایک گمنام امریکی مشیر نے نیویارک ٹائمز کو بتایا ''شدت پسند قوتیں کئی سالوں تک افغانستان پر توجہ دینے کے بعد اب افغانستان سے بھی بڑے انعام، پاکستان پر اپنی توجہ مرکوز کر چکی ہیں۔

امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس جو اس میٹنگ میں موجود نہیں تھے، کچھ ہفتے پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ القاعدہ نے اپنی توجہ پاکستان پر مرکوز کر لی ہے۔ ماضی میں عمومی طور پر امریکہ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں آپریشن کرنے سے باز رہا ہے اور القاعدہ کے رہنماؤں پر اکا دکا حملوں کے علاوہ اس نے پاکستانی علاقے پر کوئی بڑی کارروائی نہیں کی ہے۔ امریکی ذرائع مانتے ہیں کہ انھوں نے پاکستانی ایجنسی باجوڑ کے ڈمہ ڈولا میں ایمن الظواہری کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی جس میں وہ بال بال بچ گئے تھے۔ امریکی فوجی عہدیداران اور سفارتکار اس بات کو اب بھی مانتے ہیں کہ اگر پاکستان کے قبائلی علاقے میں امریکی فوج نے آپریشن کیا تو اس سے نامقبول صدر پرویز مشرف پر مزید دباؤ بڑھ جائے گا اور پاکستانی فوج میں بھی نفرت بڑھے گی اور شدت پسند مضبوط ہوں گے۔

اور آخر میں بی بی سی کا وہ تبصرہ بھی ملاحظہ فرمالیں جو اس نے صدر محترم کے انٹرویو کے حوالے سے کیا ہے۔ بی بی سی کے مطابق ''صدر پرویز مشرف نے امریکی ٹی وی چینل سی بی ایس کو انٹرویو دیتے ہوئے اور باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ بے نظیر بھٹو اپنی موت کی خود ذمہ دار ہیں، انھیں گاڑی سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ صدر کے اس ارشاد کی روشنی میں نہ صرف بے نظیر بھٹو کیس بلکہ کئی دیگر تاریخی معمے بھی حل ہو گئے ہیں۔ مثلاً خلیفہ راشد حضرت عمر بن خطابؓ اگر نماز فجر کے لیے مسجد جانے سے مستقبل پرہیز کرتے تو کبھی بھی ایرانی غلام ابولؤلو فیروز کے خنجر کا شکار نہ ہوتے۔ اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس واقعہ کے باوجود احتیاط نہ برتی اور محافظوں کے بغیر مسجد جاتے رہے۔ ظاہر ہے انھیں ایک نہ ایک روز ابن ملجم کے زہر میں بجھے خنجر کا نشانہ تو بننا ہی تھا۔ سابق وزیر اعظم لیاقت علی خان کو کیا سوجھی کہ 16 اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی کے کمپنی باغ میں بھرے جلسے سے خطاب کے شوق میں سید اکبر کے ریوالور کے سامنے آ گئے۔ اسی لیے آج تک لیاقت علی کے قتل کا ذمہ دار سوائے ان کے کوئی اور نہ ٹھہرایا جا سکا۔ سابق صدر جنرل ضیاء الحق کو کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ وہ 17 اگست 1988ء کو C-130 طیارے میں سفر کریں۔ شاید اسی لیے آج تک ان کی موت کا ذمہ دار خود انھیں سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح میر مرتضیٰ بھٹو کو یہ کیا سوجھی کہ وہ 20 ستمبر 1996ء کو اپنے گھر لوٹتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ کیا وہ اگلے دن تک واپسی کے لیے صبر نہیں کر سکتے تھے۔ شاید اسی لیے آج تک ان کے قتل کی ذمہ داری کسی اور پر نہیں ڈالی گئی اور اب سے چند ماہ قبل سپریم کورٹ کے ایڈیشنل رجسٹرار حماد رضا اگر اپنے ہی گھر کے بیڈ روم میں سونے سے پرہیز کرتے تو آج ہمارے درمیان ہوتے۔ اور خود صدر پرویز مشرف کو 14 دسمبر 2003ء کو راولپنڈی کے جھنڈا چیچی پل پر سے گزرنے کی کیوں ضرورت پڑی۔ اگر پل کے ساتھ ساتھ خدانخواستہ ان کی گاڑی بھی اڑ جاتی تو ذمہ دار کون ہوتا؟ لگتا ہے کہ صدر پرویز مشرف کو اس وقت کسی نے یہ بتانے کی جرأت نہیں کی کہ غلطی آپ کی ہے ورنہ اس حملے کے دس روز بعد 25 دسمبر کو سڑک پر نکل کر دوسرے خودکش حملے کا نشانہ نہ بنتے۔ ہمیں حیرت ہے کہ صدر کی غلطی پکڑنے کے بجائے تحقیقاتی ایجنسیوں نے 18 افراد کو نہ صرف پکڑا بلکہ کورٹ مارشل کے ذریعے ان میں سے پانچ کو سزائے موت اور تین کو سزائے قید بھی سنا دی گئی۔ لیکن اب جبکہ صدر پرویز مشرف اس نتیجے پر پہنچ ہی گئے ہیں کہ بے نظیر بھٹو کا قتل خود بے نظیر بھٹو کی غلطی کے سبب ہوا ہے تو یہ بحث فضول ہے کہ انھیں بیت اللہ محسود

نے مارا، کسی ایجنسی کا شکار ہوئیں یا اپنوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ صدر کو چاہیے کہ سکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم کو بھی اب جلد از جلد واپس روانہ کر دیں تا کہ قوم اور قومی خزانہ اور زیر بار نہ ہوں۔

(سنڈے میگزین نوائے وقت، لاہور)

♥ ..... ♥ ..... ♥

شواہد کہتے ہیں کہ کچھ چھپانے کی کوشش ہو رہی ہے

ارشاد احمد حقانی

محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کی تحقیقات کرانے کے سوال پر بھی اختلاف رائے موجود ہے۔ بظاہر حکومت کا رجحان یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ باہر سے ماہرین کو بلانے اور تحقیقات ان کے ذریعے کرانے کی طرف مائل نہیں ہے۔ ممتاز امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ کی اطلاع کے مطابق راولپنڈی جنرل ہسپتال کے ڈاکٹروں نے انکشاف کیا ہے کہ پاکستانی حکام نے ان ڈاکٹروں پر آخری موقع پر خاموش رہنے کے لیے دباؤ ڈالا جو شہید بینظیر بھٹو کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسری جانب 2002ء میں ڈینیل پرل کے لاپتہ ہونے کے کیس کے اعلیٰ تفتیش کار جمیل یوسف نے کہا ہے کہ حکومت پاکستان نے جائے وقوعہ سے خون کے دھبے اور نشانات مٹا کر بدترین غفلت کا مظاہرہ کیا ہے۔ تفصیلات کے مطابق راولپنڈی جنرل ہسپتال کے ڈاکٹروں کے مطابق پاکستانی حکام اپنے ساتھ بینظیر بھٹو قتل کیس سے متعلق ہسپتال کا میڈیکل ریکارڈ بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ سے بات چیت کرتے ہوئے ان ڈاکٹروں نے کہا کہ حکام نے ان پر انتہائی شدید دباؤ ڈالا کہ 27 دسمبر 2007ء کو ہونے والے جان لیوا حملے میں بینظیر بھٹو کو پہنچنے والی چوٹ اور موت کی وجوہات کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔ معاملے کی حساسیت کے باعث نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بینظیر بھٹو کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں میں سے ایک نے بتایا کہ جیسے ہی ہم نے بینظیر بھٹو کی موت کا وقت جاری کیا، اسی لمحے حکومتی حکام اس کیس سے متعلق ہسپتال کا ریکارڈ لے کر چلے گئے۔ امریکی اخبار کے مطابق جس وقت مذکورہ ڈاکٹر سے اس کیس سے متعلق انٹرویو کیا جا رہا تھا، اس وقت وہ پسینے میں شرابور تھے۔ انھوں نے بتایا کہ حکومت نے ہمیں کہا ہے کہ اس بارے میں بات کرنا بالکل بند کر دیں اور ہم (ڈاکٹروں) میں سے بہت سے اسے اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد یہ ڈاکٹرز سمجھتے ہیں کہ وہ بھی سیاست کے خوفناک طوفان میں پھنس چکے ہیں۔ اخبار کے مطابق، حقیقتاً کیا واقعہ پیش آیا، اس کے پاکستان میں بہت سنگین نتائج ہو سکتے ہیں۔ کسی بندوق بردار کا انتہائی قریب سے بینظیر بھٹو پر فائر کرنا یہ بتاتا ہے کہ قاتل ایک ایسے شہر میں، جہاں پاکستانی فوج کا ہیڈ کوارٹر ہے، حکومت کی فراہم کردہ سیکیورٹی کو توڑنے کے قابل ہو چکا تھا، جس سے بینظیر کے حامیوں کے اس دعوے کو تقویت ملتی ہے کہ حکومت انھیں مناسب تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہو چکی تھی۔ اگر الزام بندوق بردار کو دیا جائے تو اس سے یہ سوال بھی اٹھے گا کہ حکومت اتنے دن تک اس کے برعکس دعوے کیوں کرتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ بینظیر بھٹو کے حامیوں نے بین الاقوامی تحقیقات کرانے کا مطالبہ کیا ہے۔ حکومت نے بار بار اس الزام کو مسترد کیا ہے کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسی دوران راولپنڈی میں طبی اہلکار اس مسئلے پر زیادہ تر خاموش ہی رہے ہیں۔ راولپنڈی جنرل ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر فیاض احمد خان نے بتایا کہ ہمارے ڈاکٹرز انتہائی جذباتی اور سیاسی مسائل کے درمیان پھنس گئے ہیں۔ ہم جس مصیبت میں پھنسے ہیں، وہ ہمارے طبی پیشے کے لیے ایک بدترین

صورتحال ہے۔ 2002ء میں امریکی صحافی ڈینیئل پرل کے لاپتہ ہونے کے کیس کے مرکزی تفتیش کار جمیل یوسف نے کہا ہے کہ حکومت پاکستان نے جائے وقوعہ کو عام لوگوں کے لیے بند نہ کر کے بدترین غفلت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سے قبل کہ شواہد جمع کیے جاتے، بینظیر بھٹو کے قتل کے بعد فائر بریگیڈ نے دھماکے کی جگہ سے خون کے تمام نشانات اور ملبے دھو کر مٹا دیے تھے۔ انھوں نے کہا کہ جب اس نوعیت کے قتل کے کیس سے نمٹ رہے ہوتے ہیں تو اس میں فارینسک کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ متعدد عینی شاہدین کے مطابق پولیس نے تاحال ان سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی۔ دھماکے میں شدید زخمی ہونے والے 19 سالہ کامران نذیر نے بتایا کہ اسے اس وقت شدید دھچکا پہنچا، جب پولیس نے اس سے تفتیش ہی نہیں کی حالانکہ وہ واقعے کا عینی گواہ ہے، کسی نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ آخر ہوا کیا۔ پیپلز پارٹی کے ترجمان بابر اعوان نے کہا کہ سچ یہ ہے کہ کسی بھی قسم کی کوئی تحقیقات ہو ہی نہیں رہی۔ انھوں نے کہا حملے کے بعد انھوں نے بینظیر کی لاش دیکھی تھی اور واضح طور پر گولیوں کے نشانات کی شناخت کی تھی، جو گولی کے داخل ہونے اور نکلنے کے تھے۔ بابر اعوان نے کہا کہ ہسپتال میں سرجری کے پرنسپل پروفیسر محمد مصدق خان سخت گھبرائے ہوئے تھے لیکن بالآخر انھوں نے مجھے بتایا کہ بینظیر بھٹو کی موت گولی کے زخم سے ہوئی ہے۔ آخر وہ اتنے پریشان کیوں تھے۔ انھوں نے مجھے خود بتایا کہ ان پر شدید دباؤ ہے کہ میں بینظیر بھٹو کی موت کی وجہ سے متعلق کوئی بات نہ کروں۔ راولپنڈی جنرل ہسپتال کے بورڈ ممبر اطہر من اللہ نے اختتام ہفتہ پر صحافیوں کو بینظیر بھٹو کی میڈیکل رپورٹ ای میل کی ہے۔ یہ رپورٹ اس دستاویز سے علیحدہ ہے جس کے بارے میں ڈاکٹرز نے انکشاف کیا کہ حکام نے وہ ضبط کر لی ہے۔ اس رپورٹ میں بینظیر بھٹو کے سر میں ایک گہرا زخم بتایا گیا ہے، جس میں سے مغز بہہ کر نکل رہا تھا۔ دریں اثناء سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر چوہدری اعتزاز احسن نے کہا ہے کہ وکلاء عدلیہ کی بحالی اور آزادی کے ساتھ ساتھ اب بینظیر بھٹو شہید کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے بھی جدوجہد کریں۔ ایک پیغام میں انھوں نے کہا کہ بینظیر کی شہادت کی تحقیقات اس وقت تک شفاف نہیں ہو سکتی جب تک پیپلز پارٹی اور قوم کو اعتماد حاصل نہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ بینظیر بھٹو کی شہادت کے ذمہ دار حکمران اور ان کے حواری ہیں۔ ہم قوم کے ساتھ مل کر خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لیں گے۔

(روزنامہ جنگ، لاہور 3 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

شہادت کی تحقیقات، مزید پیچیدگیاں

ارشاد احمد حقانی

محترمہ بے نظیر بھٹو کی موت کا کون ذمہ دار ہے اور اس نے یہ کارروائی کس طرح کی، یہ ایسا معمہ ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کے ذرائع کا کہنا ہے کہ صدر پرویز مشرف کے اس اعتراف کے بعد کہ بے نظیر کو گولی لگنے کا امکان موجود ہے۔ اقوام متحدہ کی تحقیقات ضروری ہو گئی ہیں۔ امریکی ٹی وی کے ساتھ انٹرویو میں صدر مشرف نے پہلی بار تسلیم کیا کہ ہو سکتا ہے کہ بے نظیر کو گولی لگی ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ گاڑی میں کھڑے ہونے سے قتل کی ذمہ داری بے نظیر خود ہیں کوئی اور نہیں، پیپلز پارٹی کے ڈاکٹر بابر اعوان کا کہنا ہے کہ حکومت آئے روز بیان تبدیل کر رہی ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حکومت بہت کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس عام تاثر کے برعکس کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کے تفتیش کار بے نظیر بھٹو کے قتل کے ممکنہ ماسٹر مائنڈز کا بھی سراغ لگائیں گے۔ تفتیش کے لئے اب تک جو دائرہ کار متعین کیا گیا ہے اس کے مطابق برطانوی تفتیش کاروں کو موت کی وجہ جاننے سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ایک سرکاری ذریعہ نے بتایا کہ اگر تحقیقات کے وسیع اختیارات دیئے گئے تو یہ ملکی خودمختاری پر سمجھوتا کرنے کے مترادف ہوگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ دونوں پاکستانی اور برطانوی پولیس کی ٹیموں نے کیس کی تفتیش شروع کر دی ہے جس میں اول الذکر کا کردار قائدانہ ہوگا لیکن ابھی تک کسی واضح دائرہ کار کا تعین نہیں ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ذہن میں کیس کی تفتیش کے دوران کوئی واضح کام اور محدودات نہیں ہوں گے۔ کابینہ کے پچھلے اجلاس میں بھی اس بات پر غور کیا گیا کہ دائرہ کار کا تعین کرتے ہوئے ملکی خودمختاری کو ذہن میں رکھا جائے، چاہے تفتیش عام پبلک اور پیپلز پارٹی کے سوالوں کے جواب دینے میں ناکام ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ترجمان ایڈن لڈل کے مطابق پانچ رکنی سکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم کے پاس اب تک وجہ موت کے تعین کے علاوہ کسی اور بات کی تفتیش کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اگر پاکستانی حاکم چاہیں تو ان کی ٹیم اس افسوسناک واقعہ کے ماسٹر مائنڈ کا بھی سراغ لگا سکتی ہے۔ لڈل نے اس بات کی بھی تصدیق کی کہ دائرہ کار کا ابھی تک تعین نہیں ہوا ہے۔

پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے قتل کی تحقیقات بھی سکاٹ لینڈ یارڈ پولیس نے کی تھی لیکن نتائج کبھی سامنے نہیں آئے اس بار بھی دوبارہ ایسا ہی ہوتا نظر آ رہا ہے۔ برطانوی ہائی کمیشن کے ترجمان نے کہا ہے کہ یہ پاکستان کی حکومت پر منحصر ہوگا کہ وہ انہیں اپنے نتائج کے بارے میں میڈیا کے سامنے پریس کانفرنس کی اجازت دیتی ہے یا نہیں، تاہم انہوں نے کنفرم کیا کہ برطانیہ اس کیس کی تحقیقات کیلئے ایک پیسہ بھی نہیں لے گا کیونکہ یہ برطانوی حکومت کے مطالبہ پر کی جا رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستانی حکومت نے سکاٹ لینڈ یارڈ کو نہیں کہا تھا کہ بلکہ یہ پیشکش برطانوی وزیراعظم گورڈن براؤن نے کی تھی اور یہاں حکومت نے نتیجتاً اسے قبول کر لیا۔ اس پس منظر میں انکی پولیس ٹیم کیس کی تحقیقات کیلئے یہاں پہنچی ہے۔

مشترکہ تحقیقات ٹیم موت کی وجہ اس تناظر میں دریافت کرے گی کہ بے نظیر مرحومہ کی بلٹ پروف گاڑی بنانے والی کمپنی پہلے ہی حکومت کے اس الزام کو مسترد کر چکی ہے کہ بے نظیر کی موت گاڑی کا سن روف لیور سر میں لگنے کے نتیجے میں ہوئی۔ کمپنی نے بیان دیا تھا کہ گاڑی کا لیور پلاسٹک کا بنا ہوا تھا نہ کہ لوہے یا اس قسم کی کسی اور سخت چیز کا۔ ایک پاکستانی تحقیقاتی افسر جو کہ بے نظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات کر رہا ہے نے بھی اس بیان کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ انہوں نے بے نظیر بھٹو کی گاڑی کے لیور پر خون کے دھبے نہیں دیکھے۔ ایک دوسرے حکومتی ذرائع کے مطابق بے نظیر کے قتل کی بین الاقوامی تحقیقات کا ایشو کابینہ کی آخری میٹنگ میں بھی زیر بحث آیا تھا۔ اس میٹنگ کی سوچ یہ تھی کہ تحقیق کاروں کو بہت کھلے اختیارات دے کر ملک کی خودمختاری پر سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا۔ صرف انکی مدد لی جائے گی اور ان سے فنی اور فورینزک آلات کی مدد لی جائے گی جو کہ ہم پاکستان میں نہیں رکھتے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت سکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم کو بھی پوری آزادئ عمل دینے کے حق میں نہیں ہے اسی لئے بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ بے نظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات بھی اسی طرح بے نتیجہ رہے گی جس طرح لیاقت علی خان کی تحقیقات بے نتیجہ رہی تھیں۔ ادھر "بے نظیر بھٹو اپنی موت کی خود ذمہ دار ہیں۔ انہیں گاڑی سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا" صدر کے اس ارشاد کی روشنی میں نہ صرف بے نظیر کیس بلکہ کئی دیگر تاریخی معمے بھی "حل" ہو گئے ہیں۔ مثلاً کہا جا سکتا ہے کہ خلیفہ راشد حضرت عمر بن خطاب اگر نماز فجر کے لئے مسجد جانے سے مستقل پرہیز کرتے تو کبھی بھی ایرانی غلام ابولولوء فیروز کے خنجر کا شکار نہ ہوتے۔ حضرت علیؓ نے اس واقعہ کے باوجود احتیاط نہ برتی اور محافظوں کے بغیر مسجد جاتے رہے۔ ظاہر ہے انہیں ایک نہ ایک روز ابن ملجم کے زہر میں بجھے خنجر کا نشانہ تو بننا ہی تھا۔ لیاقت علی خان کو کیا سوجھی کہ 16 اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی کے کمپنی باغ میں بھرے جلسے سے خطاب کے شوق میں سید اکبر کے ریوالور کے سامنے آ گئے۔ ضیاء الحق کو کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ وہ سی 130 طیارے میں سفر کریں۔ شاید اسی لئے آج تک ان کی موت کا ذمہ دار خود انہیں سمجھا جاتا ہے۔ چھ ماہ قبل سپریم کورٹ کے ایڈیشنل رجسٹرار حماد رضا اگر اپنے ہی گھر کے بیڈ روم میں سونے سے پرہیز کرتے تو آج ہمارے درمیان ہوتے۔ خود صدر مشرف کو 14 دسمبر 2003ء کو راولپنڈی کے جھنڈا اچھی پل پر سے گزرنے کی کیوں ضرورت پڑی۔ اگر پل کے ساتھ ساتھ خدانخواستہ ان کی گاڑی بھی اڑ جاتی تو ذمہ دار کون ہوتا۔ لگتا ہے صدر مشرف کو اس وقت کسی نے یہ بتانے کی جرأت نہیں کی کہ غلطی آپ کی ہے، ورنہ اس حملے کے دس روز بعد 25 دسمبر کو سڑک پر نکل کر دوسرے خودکش حملے کی زد میں نہ آتے۔ حیرت ہے صدر کی غلطی پکڑنے کے بجائے تحقیقاتی ایجنسیوں نے آٹھ افراد کو نہ صرف پکڑا بلکہ کورٹ مارشل کے ذریعے ان میں سے پانچ کو سزائے موت اور تین کو سزائے قید بھی سنا دی گئی، لیکن اب جبکہ صدر پرویز مشرف اس نتیجے پر پہنچ ہی گئے ہیں کہ بے نظیر بھٹو کا قتل خود بے نظیر کی غلطی کے سبب ہوا ہے تو یہ بحث فضول ہے کہ انہیں بیت اللہ محسود نے مارا، کسی ایجنسی کا شکار ہوئیں یا اپنوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ صدر کو چاہیے کہ سکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم کو بھی اب جلد از جلد روانہ کر دیں تاکہ قوم اور قومی خزانہ اور زیر بار نہ ہوں۔

(روزنامہ "جنگ" 8 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

بے نظیر بھٹو کو کس نے اور کیوں قتل کیا؟

احمد لطیف

بے نظیر بھٹو کو قتل کر دیا گیا، کون بے نظیر؟ وہی جسے دنیا دختر مشرق اور بنت بھٹو کے طور پر جانتی ہے، گھر والے اس گلابی گڑیا کو پیار سے پنکی کہا کرتے تھے، وہ فاطمی کی بڑی بوا تھی، وہی فاطمہ جو بھٹو کے مقتول بیٹے مرتضی بھٹو کی بیٹی ہے، جس نے کچی آنکھوں سے اپنی بوا کے دور میں، اپنے باپ کو گولیوں سے چھلنی ہوتے دیکھا تھا۔ یہ کیسا خاندان ہے، جس کا کوئی بھی فرد طبعی موت نہیں مرا، یہ گھرانا جنازے اٹھا اٹھا کر تھک گیا ہے۔

بھٹو، جسے کم عمری میں بھی یہ احساس تھا کہ انگریز گورنر کی خوب صورتی اور اس کے گالوں کی لالی اسی باعث قائم ہے کہ وہ ''ہمارے ملک'' کی ہواؤں میں زندہ ہے اور جب والد گرامی نے اس انداز تکلم سے مستقل باز پرس کی تو وہ پھر بھی خاموش نہیں رہا اور تین بار کہا، یہ ہمارا ملک ہے، یہ ہمارا ملک ہے، یہ ہمارا ملک ہے۔ جسے کم عمری میں بھی یہ احساس ہو کہ ''ملک'' کیا ہوتا ہے اور جو غریب کے دکھ درد کو اس لئے جانتا ہو کہ وہ غریب ماں کا بیٹا تھا اس کی بیٹی کیسے لوگوں سے دور رہ سکتی تھی، اسے اسی بات کی سزا دی گئی کہ وہاں لوگوں کا پنڈ چھوڑ نہیں رہی تھی اور مقتدر حلقے ایسی سیاست یہاں اگانا چاہتے تھے جو مخصوص انداز میں مخصوص لوگوں کے مفادات کی نگہداشت کرے۔ وہ بھٹو کی وارث تھی، حقیقی وارث، جو زرداری ہونے کے بعد بھی بھٹو ہی رہی اور بھٹو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسی کی طرح جمہوریت کی خاطر ہنسی خوشی جان، جان آفریں کے سپرد کر گئی۔ یہ بھٹو کا شیوہ ہے کہ وہ عوام کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، جیسے جل بن مچھلی زندہ نہیں رہ سکتی اور تڑپنے لگتی ہے، یہی حال بھٹو کا ہے۔ وہ بار بار عوام کے پاس جاتے ہیں اور عوام سے دشمن انہیں روکتے ہیں، یہ سلسلہ برسا برس سے جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ ''بھٹو'' ایک رویے کا نام ہے اور اس کو کسی طور ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ظالموں نے بہت زور لگایا، بھٹو کو عبرت کا نشان بنانے کی دھمکی بھی دی گئی اور عبرت کا نشان بنا بھی دیا گیا لیکن بھٹو کو پاکستانی سیاست سے نکالا نہیں جا سکا۔ اسے بار بار دیوار کے ساتھ لگانے کی کوشش کی گئی، وہ پھر ابھر کر سامنے آیا۔ لگتا ہے بلاول نانا کی روایات لے کر آگے بڑھے گا۔ ہمارے ہاں نانا کی روایت بہت قوی ہے۔ زرداری نے اپنے بیٹے کو بھری محفل میں بلاول بھٹو زرداری کہا اور لگتا ہے کہ مظلوم ہمیشہ نانا کی روایت لے کر آگے بڑھتے ہیں اور بلاول کے ساتھ ساتھ بختاور بھی آگے آئے گی، زرداری کی سرپرستی میں بھٹو کا قافلہ آگے بڑھتا رہے گا۔ اس کے ساتھ ایک اور رو بھی پہلو بہ پہلو چل رہی ہے جو وراثتی اعتبار سے بھٹو کی وارث ہے لیکن بوجہ ابھر کر سامنے نہ آ سکی، وہ ہے غنوئی بھٹو، فاطمہ بھٹو اور ذوالفقار علی بھٹو جونیئر کی رو، نام کی تاثیر ساتھ ساتھ چلتی ہے لوگوں نے جن کے نام پر نام رکھے ہوتے ہیں، ان کی محبت بہت بے پایاں ہوتی ہے۔ محبت کے انداز بھی عجیب ہیں، اسی سے محبت کا انداز لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ روایت صدیوں سے جاری ہے، باپ دادا کے نام پر بچوں کے نام رکھے جاتے ہیں، یہ سب کچھ اس خاندان کی اہمیت اور ناگزیریت کے حوالے سے درج کیا جا رہا ہے، اس ذکر کو ایک روشن روایت ہی سمجھا جائے، وہ روایت جس

پر چل کر بے نظیر بھٹو نے جان دے دی۔

بھٹو کو مارنے کے لئے ضیاء الحق نے بہت زور لگایا اور حالات نے ثابت کیا کہ زندہ بھٹو کو مارنا تو آسان تھا لیکن مردہ بھٹو کو کسی طور مارا نہیں جا سکا اور سچ ہے کہ شہید کبھی مرا نہیں کرتے۔ مقتدرہ قوتوں سے ایک مردہ نہیں سنبھالا جا رہا تھا اب تو ایک خاتون کی لاش اسے بھوت بن کر ڈرائے گی اور وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر واویلا کریں گے۔

جمعرات، 27 دسمبر 2007ء کی سہ پہر تھی، بے نظیر بھٹو سرخ اور سفید پھولوں سے لدی ہوئی پر جوش تقریر کرنے کے بعد سٹیج سے اتریں، گاڑی تک گئیں، راجہ بازار کو جانے والی کالج روڈ پر بنے وی آئی پی کار پارکنگ سے گاڑی نکالی، ابھی مڑی ہی تھیں کہ پر جوش لوگوں کے ہجوم کو دیکھ کر انہوں نے ان کے پر جوش نعروں کا جواب دینے کے لئے گاڑی کے سن روف سے سر نکالا ہی تھا کہ پھر وہ کچھ ہو گیا، جس کو نہیں ہونا چاہیے تھا، حالانکہ بے نظیر بھٹو سمیت سب کو پتا تھا کہ ان کی جان کو خطرہ ہے، اس سے پہلے بھی ان پر کئی ایک جان لیوا حملے ہو چکے تھے لیکن یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکیں۔

5 بج کر 35 منٹ پر انہیں جنرل اسپتال لایا گیا، بم دھماکہ سے ان کی گاڑی کے ٹائر پھٹ چکے تھے، گاڑی رموں پر کچھ دور تک چلائی گئی لیکن لوگوں نے سمجھا کہ اس طرح انہیں جلد اسپتال نہیں پہنچایا جا سکے گا، پھر پولیس کی موبائل وین میں انہیں جنرل اسپتال راولپنڈی پہنچایا گیا، بھگدڑ مچ چکی تھی، انسانی اعضاء ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے، رش اس قدر تھا کہ ڈاکٹر مصدق کو اسپتال کی دیوار سے سیڑھی لگا کر اسپتال پہنچایا گیا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر جو معذوروں کے کوٹا پر بھرتی ہوا تھا وہ بھی اوپر نہ جا سکا، محترمہ کو روایتی طور پر مساج کرنے کی کوشش کی گئی، ایکسرے لئے گئے، کوئی خاتون ڈاکٹر اس وقت موجود نہ تھی، جب لیڈی ڈاکٹر کو لایا گیا تو وہ بھی بے نظیر تک نہ پہنچ سکی۔ ان کی نبض اور بلڈ پریشر صفر ہو چکا تھا، کچھ کا کہنا ہے کہ وہ راستے میں ہی دم توڑ چکی تھیں، ڈاکٹروں نے 6 بج کر 16 منٹ پر ان کی موت کی تصدیق کر دی۔ اس کے بعد ایسا شور مچا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، ٹیلی ویژن کی سکرینوں پر آ کر ایسی ایسی بودی تاویلیں پیش کی گئیں کہ آج کئی روز گزرنے کے بعد بھی گرد بیٹھی نہیں، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

پہلا موقف، دوسرا موقف، تیسرا موقف، اگلے سیدھے عذر، وزارت داخلہ کے ترجمان کے پپڑی لگے ہونٹ، ہونٹوں پر پھرتی زبان دنیا نے دیکھی، پشتو میں ریکارڈ کی گئی گفتگو بھی دنیا نے سنی، اس سے پہلے ویڈیو فوٹیج بھی دنیا نے دیکھی، ان باتوں پر تبصرے ہوئے اور اب ایسا شور ہے کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اشتہار نما خبر بھی چھپی کہ جس کسی کو پتا ہے وہ عینی شاہد کے طور پر اپنا بیان ریکارڈ کرائے، پیپلز پارٹی کے کارپردازان کہتے ہیں کہ بے نظیر بھٹو کو جدید لیزر گن سے نشانہ بنایا گیا۔ پوسٹ مارٹم سے متعلق زرداری کا کہنا تھا کہ بے حرمتی ہو گی اس لئے پوسٹ مارٹم نہیں کرایا، اس دور میں بھی جدید تعلیم یافتہ لوگ اس طرح کی باتیں کریں گے تو تحقیق کیسے ہو گی، جس طرح حکومت نے اپنی طرف سے تحقیق مکمل کر لی اور اپنی آخری رائے بھی دے دی، اسی طرح بے نظیر بھٹو کے لواحقین نے بھی فیصلہ سنا دیا کہ بے نظیر بھٹو نے اپنے قاتلوں کی نشان دہی قبل ازیں اپنی طرف سے بھجوائی گئی ای میل میں کر دی تھی۔ حکومت کی طرف سے بار بار تبدیل کیا جانے والا موقف شک میں مبتلا کرتا ہے، سات ڈاکٹروں کی طرف سے

جاری کردہ رپورٹ لاہور بھجوادی گئی ہے۔ راولپنڈی کے پولیس چیف کا کہنا ہے کہ حکومت پنجاب کی طرف سے حکومت سندھ کو تمام کارروائی سے آگاہ کردیا گیا ہے۔ وزارت خارجہ کے ترجمان نے سختی سے ان مطالبات کو رد کردیا، جن میں کہا گیا تھا کہ یو این او کی طرف سے بے نظیر بھٹو کے قتل کی تحقیق کرائی جائے، اس کی نظیر کے طور پر انہوں نے حریری کیس کا حوالہ بھی دیا لیکن حکومت نے ایسے کسی مطالبے کو ماننے سے انکار کردیا۔

سن روف لیور اور گولی لگنے سے متعلق زرداری نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ میری دو بہنیں ڈاکٹر ہیں اور انہوں نے بے نظیر بھٹو کے زخموں کو دیکھا ہے، وزارت داخلہ کے ترجمان نے ہماری گاڑی نہیں دیکھی، اگر دیکھ لیتے تو انہیں پتا ہوتا کہ سن روف میں ربڑ لگا ہوا ہے، لیور نہیں، بہرحال حکومت موقف کو نہ صرف بے نظیر بھٹو کے لواحقین اور پیپلز پارٹی کے لیڈر مسترد کرچکے ہیں بلکہ عام لوگ بھی حکومت کے اس بودے موقف کو رد کرچکے ہیں۔

اس قتل میں کچھ اتفاقات بھی ہوئے، ڈاکٹر تصدق خان نے بے نظیر بھٹو کو ابتدائی طبی امداد دی اور ان کے والد ڈاکٹر صادق خان نے نواب زادہ لیاقت علی خان کو طبی امداد دی۔ ان کا کہنا ہے کہ میرے دو بیٹے بھی ڈاکٹر ہیں اور خدانہ کرے کہ انہیں بھی کسی ایسے اتفاق سے سابقہ پڑے، بہرحال حکومت کی طرف سے باقاعدہ درخواست پر پوسٹ مارٹم ہوتا ہے اور وہ بھی ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر اسپتال میں ہوا کرتا ہے، رش اس قدر تھا کہ کوئی بھی کام قاعدے کے مطابق نہ ہوسکا۔ بے شک صدر کی طرف سے عالمی اداروں کی جانب سے کی جانے والی آفرز کو درخور اعتنا جانا گیا ہے اور یہ امکان بھی ظاہر کیا گیا کہ اگر ایسا ہوجائے تو پاکستان کی وہ روایت ٹوٹ جائے گی کہ کسی بھی بڑے قومی سانحے کا آج تک سراغ نہیں لگایا جاسکا اگر پیپلز پارٹی کو مطمئن کردیا جائے اور عام پاکستانی بھی ان اقدامات کو مان لے تو ممکن ہے وطن عزیز میں ایک نئی روایت جنم لے۔

بے نظیر کو کس نے قتل کیا اور کیوں قتل کیا، یہ سوال اتنا اہم ہے کہ اس پر بہت غور کرنے کی ضرورت ہے، جس طرح بے نظیر مقامی لیڈر نہ تھیں، اسی طرح یہ معاملہ بھی مقامی نوعیت کا نہیں ہے۔ امریکہ نے بھٹو کو عبرت کا نشان بنادینے کی دھمکی دی تھی اور انہوں نے نہ صرف بھٹو کو عبرت کا نشان بنایا بلکہ اس خاندان کو ہی صفحہ ہستی سے مٹادیا لیکن قدرت کے فیصلے بھی اٹل ہوا کرتے ہیں، اب نہ صرف بے نظیر بھٹو کی اولاد موجود ہے بلکہ بھٹو کا پوتا اور پوتی بھی سام راج کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہیں۔ ہمارے ہاں نانا کی روایت کو آگے لے کر چلنے کا چلن بھی موجود ہے، دونوں صورتوں میں بھٹو زندہ رہے گا۔ سام راج عوامی امنگوں کی ترجمان جس سوچ کو ختم کرنا چاہتا ہے، وہ ختم نہیں ہوگی۔ اگر سادہ انداز میں بھی اس قتل کی تفتیش کی جائے تو کئی ایک معاملات مشکوک دکھائی دیتے ہیں۔ طے ہوا تھا کہ حکومت پنڈال سے باہر کے معاملات دیکھے گی اور بے نظیر کے جاں نثار اندر کی حفاظت خود کریں گے، جاں نثاروں نے تو اپنا فرض پورا کیا لیکن قاعدے کے مطابق حکومت پنجاب نے وی آئی پی پروٹوکول کے لئے ایلیٹ فورس کا جو دستہ بنا رکھا ہے، جو ہر وی آئی پی موومنٹ کے دوران گاڑیوں کے گرداگرد ہیومن شیلڈ بنانے کا پابند ہے وہ اصول یہاں کیوں روا نہیں رکھا گیا۔ گاڑی کی آمدورفت کے سلسلے میں بھی جو طے شدہ معاملہ ہے، اس کو بھی بروئے کار نہ لایا گیا، یعنی گاڑی ایک روٹ سے آتی ہے تو جاتے ہوئے اچانک روٹ بدل کردیا جاتا ہے، اس پر بھی عمل نہیں کیا گیا۔ پیپلز پارٹی کی قیادت اور جاں نثاروں نے تو اپنی ذمہ داری پوری کی لیکن حکومت نے جو ذمہ داری قبول کی تھی، اس کو نہ نبھایا جاسکا۔

بے نظیر عالمی ضمانتیں لے کر پاکستان آئی تھیں، وہ ضامن اب کہاں ہیں، وہ اس معاملے کو کیوں نہیں اٹھاتے، حالانکہ ہر طرف سے اس کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ بے نظیر کے قتل کو پاکستانیت کا قتل بھی کہا گیا ہے اور بلاول کو بے نظیر کی طرح چاروں صوبوں کی زنجیر کہا جا رہا ہے اگر بھٹو خاندان ایک ہو جاتا ہے اور بلاول کے ساتھ ساتھ فاطمہ، بختاور اور ذوالفقار علی بھٹو جونیئر بھی سامنے آتے ہیں اور مل کر پاکستان کو بچانے کی سعی کرتے ہیں تو پاکستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ یہ خاندانی رنجشوں کو ہوا دینے کا وقت نہیں، ننھیال اور ددھیال کا معاملہ نہیں یہ تو پاکستان کی سالمیت کا معاملہ ہے۔ قتل کو قتل کی طرح لینا چاہیے اور اسے مقامی نہیں عالمی سانحے کی طرح بھی لینا چاہیے۔ رہا معاملہ خاندانی قضیے کا تو اس کا صرف ایک حل ہے کہ سب مل جائیں۔ بھٹو عوام کی وراثت ہے اور خونی رشتے اس میں مقدم ہوتے ہیں، ایک احترام بھی ہوتا ہے لیکن جمہوریت کی جو شمع بھٹو نے اپنے خون سے روشن کی تھی، وہ عوام کی امانت ہے اور عوام کو اسے آگے لے کر چلنا ہے، شمع سے شمع جلانی ہے، اگر ایسا نہ سوچا گیا تو جو آوازیں سنائی دے رہی ہیں، خاکم بدہن، وہ پوری ہو جائیں گی، سام راج کے منصوبے مکمل ہو جائیں گے۔

تھانہ سٹی کے ایس ایچ او اس مقدمہ کے مدعی ہیں، مقدمہ نمبر 471، 7-A-T-A، 120B، 302، 324، 427 اور 436 کی دفعات کے تحت درج کر لیا گیا ہے۔ پیش رفت اس طرح نہیں ہوئی جس طرح ہونی چاہیے، بے نظیر کا مقدمہ عام نوعیت کا نہیں ہے، یہ اور اس طرح کے مقدمات جس سرعت کا تقاضا کرتے ہیں، اس کو بروئے کار نہیں لایا گیا، جو ابتدائی نقوش تھے، بات ان سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ ہوتا یوں ہے کہ وقوعہ سے پہلی کی گئی شکایات کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے، کمیٹیاں بنائی گئیں، اس میں عبدالمجید ایڈیشنل آئی جی، سی آئی ڈی، مشتاق سکھیرا ڈی آئی جی، سی آئی ڈی، وقار احمد چوہان، ریجنل ایس پی انویسٹی گیشن، طاہر ایوب، اس کے علاوہ حساس اداروں کے سپیشل انویسٹی گیشن سیل بھی کام کر رہے ہیں، وزارت داخلہ بھی اپنے طور پر سرگرم ہے لیکن بار بار کا تبدیل کیا ہوا موقف معاملات کو اُلجھا رہا ہے، تادم تحریر کوئی خاطر خواہ سرگرمی دکھائی نہیں دیتی، سوائے اس کے حکومت معاملات کو بگاڑنا چاہتی ہے اور وہی روایت دوہرا رہی ہے جس کے تحت ہر قومی سانحے کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بے نظیر کا قتل اتنی آسانی سے دبایا نہیں جا سکتا، یہ اس لئے بھی ہوگا کہ نہ صرف یہ کہ لواحقین سرگرم ہیں بلکہ عوام بھی اس میں خاص دلچسپی رکھتے ہیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان کی سلامتی پر مامور قوتیں اس معاملے کو اس طرح لیں جس طرح کا یہ تقاضا کرتا ہے، یعنی بے ں طیر پر حملہ پاکستان کی سالمیت پر حملہ ہے۔ اسے اسی سرگرمی سے روکنا چاہیے۔

اگر حکومت کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہر طرح کے معاملات کو خود حل کر سکتی ہے تو اس کے لیے بھی جس سرگرمی کی ضروری ہے وہ بھی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ دہشت گردی کے خلاف شروع کی گئی جنگ چوں کہ عالمی جنگ ہے، اس لیے بھی عالمی طاقتوں کو اس میں دلچسپی لینی چاہیے۔ حکومت کو ان مطالبوں پر پریشان نہیں ہونا چاہیے، اگر حکومت مقامی اور عالمی مطالبات کو مان لے تو اس کی نیک نامی میں اضافہ ہوگا۔

(روزنامہ ''سنڈے ایکسپریس'' 6 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

پاکستان سمیت مشرق وسطیٰ کی سرحدوں کو تبدیل کرنے کا نیا فارمولا

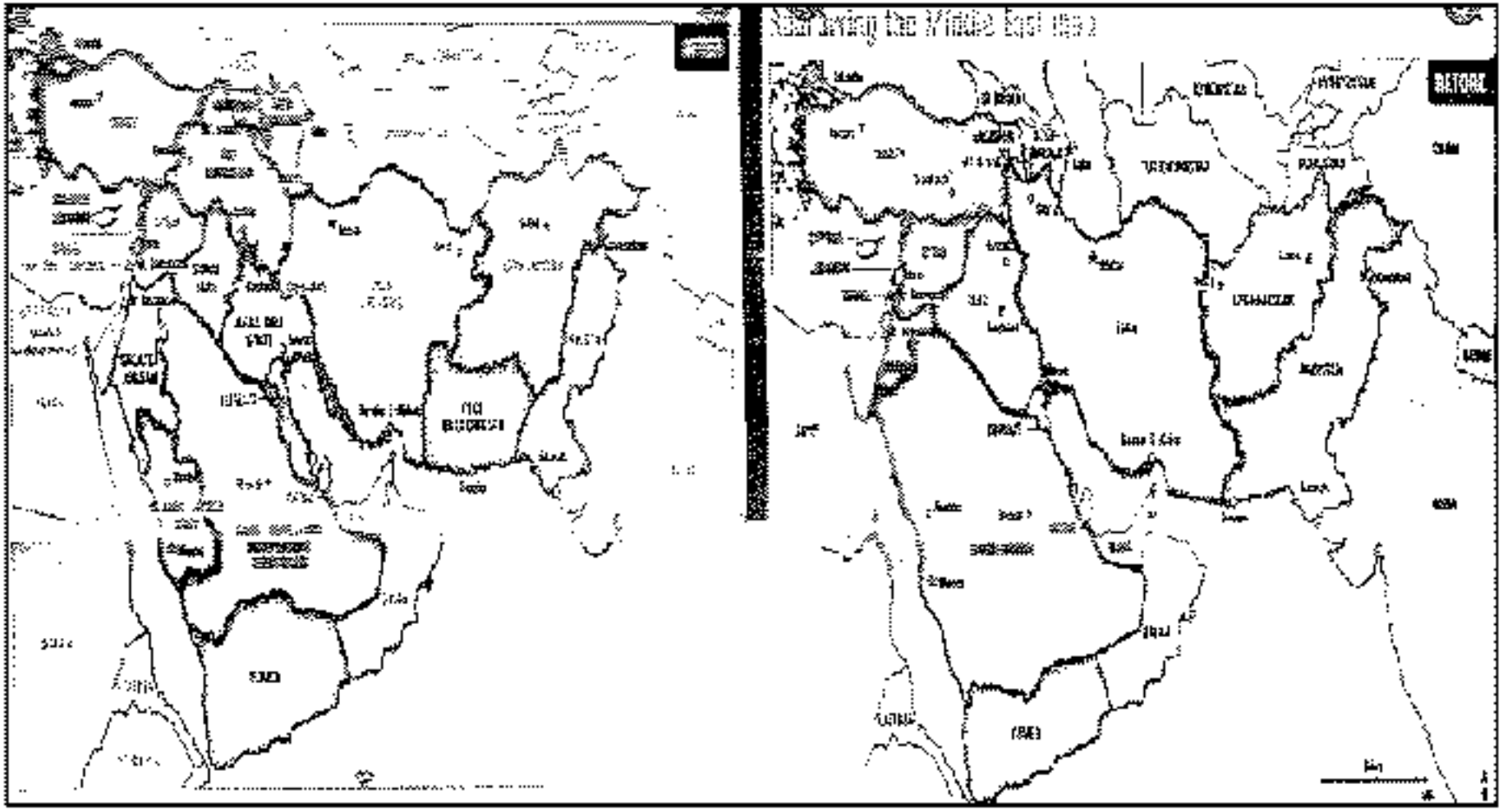

بے نظیر کی شہادت کے اثرات

1-وفاق کو کمزور کرنا2-پاکستانی ایٹمی اثاثوں کو غیر محفوظ قرار دینا

پاکستان سمیت مشرق وسطیٰ کی سرحدوں کو تبدیل کرنے کا نیا فارمولا

امریکی فوجی میگزین AFJ کی رپورٹ

فاروق اے حارث

امریکی وزیر خارجہ اور بش کی دست راست کنڈولیزا رائس نے مشرق وسطیٰ کے حالیہ بحران کو ''ایک نئے مشرقی وسطیٰ کی پیدائش'' کی خبر قرار دیا ہے۔ گو کہ مسلم دنیا میں اس خبر کو کوئی خاص اہمیت وفوقیت نہیں دی گئی لیکن پاکستان کی سلامتی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے ضمن میں یہ ایک انتہائی خطرناک صورتحال ہے جیسا کہ یہ منصوبہ پورے مشرق وسطیٰ میں بیک وقت بے نقاب ہو چکا ہے۔ جسے امریکہ کے ماہانہ فوجی میگزین (Armed Froces Joumal)AFJ میں ایک آرٹیکل کی صورت میں باقاعدہ شائع کیا گیا۔AFJ کی بنیاد1863ء میں رکھی گئی یہ امریکہ کی فوجی قیادت کے لیے جاری شدہ ایک ماہانہ رسالہ ہے جو ایک سو چالیس سال سے زائد عرصہ پر محیط اپنے ملک کے دفاعی معاملات پر مکمل تبصرے اور تجزیے شائع کر رہا ہے۔AFJ ان کی فوجی ٹیکنالوجی، غیر ممالک پر قبضے، افواج کی صف بندی، حکمت عملی، جنگی چالوں اور ہدایت ناموں کو مکمل کوریج کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یہ رسالہ خاص خاص جنگوں، امریکی ساحلوں کے محافظین اور نیشنل گارڈز کی بہتری اور ترقی کو بھی کوریج دیتا ہے۔

جون2006ء کو شائع ہونے والا یہ آرٹیکل، جیسا کہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ کسی ایرے غیر روزنامے کی کوئی من گھڑت کہانی نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کے خاص اور حساس علاقوں کے خلاف صف آرائی کا ایک گھناؤنا منصوبہ ہے جس سے پاکستان کی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہیں اور ضرورت اس امر کی ہے کہ ان دھمکیوں اور صف بندیوں کے تمام پہلوؤں پر غور وفکر کیا جائے اور فوری کارروائی کے ذریعے اس خطرے کا جڑ سے خاتمہ ممکن بنایا جائے۔ جاری اس اکیسویں صدی کے اندر امریکہ کی مشرق وسطیٰ، افریقہ اور ایشیاء کے بارے میں جو حکمت عملی اپنائی گئی ہے اس کے خاص 6 پہلو درج کیے جاتے ہیں جس سے امریکہ کے گھناؤنے عزائم کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

1- اسرائیل کی حفاظت، دفاع اور مشرق وسطیٰ میں کمزور اور بے ضمیر حکومتوں کا قیام۔

2- اسلام کی سیاسی وفوجی تباہی اور اس پر کنٹرول۔

3- ایندھن کے ذخائر پر قبضہ۔

4- تمام دنیا کے تجارتی راستوں پر کنٹرول، تیل کی پائپ لائنوں اور پانی کی لائنوں جیسے گلف، سوئز، باس فورس، افریقہ، جبرالٹر اور ملاکا اسٹریٹس پر قبضہ۔

5- روس پر قبضہ۔

6- چین کا محاصرہ اور قبضہ۔

اب ہمارے اردگرد کے حالات وواقعات مندرجہ بالا ان حقائق کی طرف واضح اشارہ کر رہے ہیں کہ امریکہ اپنے ان مذموم ارادوں کی طرف کس تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ بلوچستان اور وزیرستان پر فوج کشی درحقیقت امریکی منصوبہ سازوں کی سازشوں کا نتیجہ ہے جس کے تحت پاکستانی افواج کو اپنے ہی پشتون بھائیوں کے ساتھ لڑایا جا رہا ہے بلوچستان میں نیم قومی حلقوں کا امریکہ کو مقامی امداد حاصل کرنے سے روکنا چاہیے جس کی طرف ابھی تک ہم نے کوئی توجہ نہیں دی اور دوسری طرف یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ امریکہ نے ابھی تک بلوچستان لبریشن آرمی (BLA) کو ایک دہشت گرد تنظیم تسلیم یا قرار نہیں دیا۔ آخر کیوں؟ ایم کیو ایم کے کردار کو بھی BLA اور انڈیا کے ساتھ خطرناک تعلقات کی بناء پر فوری طور پر ختم ہونا چاہیے اور یہی وہ وقت ہے کہ پاکستان کو اپنے دفاع کے لیے اب زیادہ دیر آنکھیں بند نہیں رکھنی چاہیں اور ہوش کے ناخن لیتے ہوئے اسے مکمل طور پر اب جاگ جانا چاہیے۔ لہٰذا ان نقشوں کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو ایک عظیم تر اسرائیل قائم کیا جا رہا ہے اور حالیہ بحران اس سمیت اٹھنے والا پہلا قدم ہے۔ ٹونی بلیئر نے بھی یکم اگست 2003ء کو لاس اینجلس میں ورلڈ اکنامک فورم کونسل میں حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے جو کچھ کہا اور دعوے کیے وہ بھی دلچسپ اور اہم ہیں۔ اپنے خطاب میں بلیئر نے بڑے واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ ''بش اور میں جس بات کو بہت عرصہ سے چھپا رہے ہیں وہ یہی ہے کہ یہ جنگ نہ تو دہشت گردی کے خلاف ہے اور نہ ہی کسی نظام حکومت کی تبدیلی کے لئے بلکہ یہ جنگ مسلم دنیا پر مغربی اقدار لاگو کرنے کے لئے چھیڑی گئی ہے اور جو مسلمان اس کی مخالفت کریں گے ہمارے نزدیک وہ دہشت گرد، انتہا پسند اور باغی ہیں جن کا مقابلہ کرنا ہوگا اور انہیں کچلنا ہوگا۔ ٹونی بلیئر نے اپنے اس خطاب میں کشمیر، چیچنیا، افغانستان اور فلسطین کی مثالیں دیں جہاں انتہا پسند مغربی اقدار کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس نے اس بات پر بھی زور دیا کہ مغرب مسلم دنیا کے ان مغرب زدہ حکمرانوں کی مدد کرے گا جو ان کے اتحادی ہونے کے باعث مغربی اقدار کو فروغ دینے میں ہماری مدد کر رہے ہیں اور جو ''قدامت پسند'' اسلام کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ مزید یہ کہ ان اسلام مخالف قوتوں کی جارحانہ سیاسی پالیسیاں جو سندھ میں جاری ہیں ایم کیو ایم ان کے ساتھ مل کر پاکستان کو کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے جس میں ایس BLA اور دوسری علیحدگی پسند تحریکوں کی مدد حاصل ہے۔ انڈین ایکسپریس نے اپنی 22 ستمبر کی اشاعت میں سعید نقوی کا ایک آرٹیکل شائع کیا جس میں اس نے لندن کے ایکشن ہال میں ہونے والی ایک میٹنگ کے دوران آزادی حاصل کرنے کے مطالبے کا ذکر کیا جس کے شرکاء سندھ، بلوچستان اور پختونستان کے بڑے بڑے راہنما تھے اور اس معاملہ میں اگر حکومت یا انتظامیہ کے لوگ اس بات کا دعویٰ کریں کہ اس میٹنگ

میں ''را'' کے خریدے ہوئے چند افراد تھے تو یہ بات انتہائی مضحکہ خیز اور غلط ہوگی اس لیے کہ وہ واقعی اونچے درجے کے لیڈران تھے۔ اپنے اس مضمون میں نقوی نے کہا کہ اس میٹنگ میں بنگلہ دیش بننے کے بعد دوسری مرتبہ دوقومی نظریے کو دفن کر دینے کی بات کی گئی۔ پاکستان کے پاس آج صرف ایک موقع ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف کام کرنے والے امریکی ایجنٹوں کو اپنے اداروں اور علاقے سے پاک وصاف کرے اور اپنی سرحدوں اور دفاع کو ناقابل تسخیر بنائے۔ تاریخ ہمارے حکمرانوں اور ہماری قوم کے مستقبل پر مکمل نظر رکھے ہوئے ہے اور چونکہ ہماری نوجوان نسل کا مستقبل یہودیوں، نصرانیوں اور صیہونیوں کے ہاتھ فروخت کیا جارہا ہے لہٰذا اس کا تدارک اب انتہائی لازم قرار دیا جاچکا ہے۔ آیئے اب رالف پیٹر کے اس مکروہ آرٹیکل کی طرف توجہ دیتے ہیں جو اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ AFJ میں شائع کیا گیا۔ جس کا عنوان ہے ''بہتر (یعنی تبدیل شدہ) مشرق وسطیٰ کیسا ہوگا'' رالف پیٹر لکھتا ہے کہ ''بین الاقوامی سرحدیں کبھی بھی مکمل نہیں ہوتیں بلکہ سب سے زیادہ ناانصافی ان افریقیوں کے ساتھ ہوتی ہے جن کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں یا اگر علیحدہ ہیں تو ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہیں یا پھر ان میں بڑے اور چھوٹے کے اعتبار سے بہت زیادہ فرق ہے اور ان میں بالکل ویسا ہی فرق ہے جیسا کہ آزادی اور غلامی میں، بردباری میں اور وحشی پن میں، قانون اور دہشت گردی میں حتیٰ کہ امن اور جنگ میں۔ دنیا کی سب سے زیادہ آمرانہ اور مسخ شدہ سرحدیں افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں ہیں۔ افریقہ کی سرحدوں کو قائم رکھنے کے لئے ہزاروں مقامی باشندوں کو طیش دلا کر لڑتے مرنے پر اکسایا جارہا ہے لیکن مشرق وسطیٰ کی غیر منصفانہ سرحدیں، چرچل سے ادھار لی ہوئی ہیں (چرچل چونکہ برطانیہ کا صدر تھا اس لیے اس سے مراد برطانیہ ہے) جو زیادہ تکلیف کا باعث ہیں اور جسے مقامی لوگ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کی ان حد سے بڑھی ہوئی سرحدوں کے علاوہ اور بھی بہت بڑے بڑے مسائل ہیں لہٰذا غیر فعال تہذیب کی رسوا کن ناہمواری کی وجہ سے پیدا شدہ حد سے بڑھی ہوئی مذہبی انتہا پسندی ان میں سے ایک ہے اور دوسرا کسی اور مذہب کو مجموعی طور پر ناکام کرنے کے لیے اس پر اپنے دستور کے مطابق حلال یا حرام کا فتویٰ لگانا اور اسے ناپسند قرار دینے کے لئے زور لگانا دین اسلام نہیں بلکہ یہ ایسی مقدس حد بندیاں ہیں جو بین الاقوامی حالات کو کنٹرول کرنے والی یعنی ڈپلومیٹس کی بنائی ہوئی ہیں جن کی وہ پوجا کرتے ہیں چونکہ مشرق وسطیٰ میں بہت سی ناانصافیاں عمل پذیر ہیں لہٰذا انہیں ختم کرنے کے لیے سرحدوں میں تبدیلی کا فارمولا پیش کیا گیا ہے تاکہ ہر ایک کو انصاف فراہم کیا جاسکے۔ گو کہ ہم ابھی تک عراق کردوں، بلوچوں اور عرب شیعہ وغیرہ کو انصاف نہیں دلا سکے تاہم ان کے لیے ہم اپنی مکمل کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ چونکہ ان تمام ناانصافیوں کے کاتے کے لیے نئی سرحدوں کے قیام کا نظریہ پیش کیا گیا ہے لہٰذا سرحدوں کی اس نئی تقسیم کے بغیر مشرق وسطیٰ میں امن قائم نہیں ہوسکتا اور جو لوگ سرحدیں تبدیل کرنے کے اس فارمولے کی مخالفت کریں گے انہیں آپس میں لڑنے مرنے میں مصروف کر دیا جائے گا اور اگر اس کے بعد بھی کام مکمل نہ ہوا تو سندھ کی سرحدوں میں تبدیلیاں کی جائیں گی۔ بین الاقوامی ریاست کے تسلیم کر لیے جانے کے بعد کوئی ہتھیار نہیں بنائے جائیں گے۔ جنگ مختصر یا ختم کر دی جائے گی۔ غلط سرحدوں کو درست کرنے کے لئے ایک کوشش ہوگی جو مشرق وسطیٰ کے مضبوط نظام کو اپنی سخت گرفت میں لینے کے لیے کی جائے گی اور جو کوئی اس کام میں ہمارا ساتھ نہیں دے گا اس کی مشکلات مزید بڑھ جائیں گے۔ ہم انسان کی بنائی ہوئی بدصورت سرحدوں کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں اور ہم اس وقت تک نفرت اور تشدد پیدا کرنا بند نہیں کریں گے جب تک وہ سب ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ جو لوگ کبھی نہ ہونے والی یا انہونی کے بارے

میں سوچنے سے انکار کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ سرحدیں کبھی تبدیل نہیں ہوسکتیں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ سرحدوں کی تبدیلی صدیوں سے جاری ہے۔ کانگو سے کسووو اور کیکاڈس تک یہ سرحدیں ابھی بھی تبدیل ہورہی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم معاملہ اسرائیل کا ہے کہ کیا اسرائیل کے لیے اپنے ہمسایوں کے ساتھ پرامن ماحول میں رہنے کی کوئی امید ہے؟ کیا وہ اپنی 1967ء والی سرحدوں میں واپس آسکے گا؟ اور اس علاقے میں وہ محفوظ ہوگا؟ اس معاملہ میں بہت غور وخوض ہو چکا۔ اب ہم ان لوگوں کی طرف توجہ دیں گے جنہیں جان بوجھ کر نظر انداز کردیا گیا ہے۔ جیسا کہ سب سے بڑی ناانصافی جو بدنام زمانہ ناانصاف علاقوں بلقان اور ہمالیہ کی پہاڑیوں کے درمیان آزاد کردستان نہ بنا کر کی گئی۔ جہاں 27 سے 36 ملین کرد مشرق وسطیٰ کے ساتھ ملحقہ علاقوں میں رہ رہے ہیں۔ یہ اعداد وشمار بہت مختصر ہیں کیونکہ کسی حکومت یا ریاست نے ان کا ایماندارانہ تخمینہ یا اندازہ لگانے کی اجازت نہیں دی۔ آج پہلے سے کہیں زیادہ آبادی والے عراق میں اپنی کم تر تعداد بتائے جانے کے باوجود بھی دنیا کا سب سے بڑا نسلی گروہ یا فرقہ جس کا اپنا کوئی ملک نہیں ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے بے چارے کرد ہر دور حکومت میں بہت مظلوم رہے ہیں۔ حالانکہ وہ وہاں صدیوں سے آباد ہیں۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے بغداد کی فتح کے بعد بھی اس ناانصافی کو انصاف میں بدلنے کا سنہری موقع گنوادیا۔ کسی خوفناک بیماری کی طرح آپس میں جڑے ہوئے عراق کے علاقے کو فوری طور پر تین حصوں میں تقسیم کردینا چاہیے۔ ہم اپنی بزدلی اور نااہلی کے باعث عراقی کردوں کو موجودہ حکومت کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں کرسکے جبکہ انہوں نے اپنی خوشی اور خواہش سے احمقوں کی طرح ہمارا ساتھ دیا۔ مگر ہمارا مطلب پھر بھی پورا نہ ہوسکا۔ کاش! وہاں پر استصواب رائے کرادیا جاتا جیسا کہ ترکی میں کردوں کے ساتھ ہوا۔ وہ کئی دہائیوں سے ترکوں کی وحشیانہ فوجی کارروائیوں کا مقابلہ کررہے تھے جو ان کی شناخت ختم کرنا چاہتے تھے اور اب پچھلے ایک عشرے سے انقرہ کے ساتھ معاہدہ ہونے کے بعد وہاں پر امن ہوچکا ہے۔ اب دوبارہ اگر وہاں یعنی ترکی کے مشرقی علاقے میں فساد پھیلا تو وہ ایک مقبوضہ علاقہ بن جائے گا۔ یعنی اسے کردستان بنادیا جائے گا۔ اور اگر ہوسکا تو یونان اور ایران کے کرد بھی اس آزاد کردستان میں شامل کردیے جائیں گے۔ اگر دنیا کی مانی ہوئی جمہوریتوں نے کردستان کی آزادی کو تسلیم نہ کیا تو یہ بنیادی انسانی حقوق کو نظر انداز کرنے کا گناہ ان سب بدصورت گناہوں سے بڑا ہوگا جن کو ہم بڑے جوش سے میڈیا میں اچھالتے پھرتے ہیں۔ ویسے بھی اگر دیار بکیر سے لے کر تبریز تک آزاد کردستان بن جائے تو وہ بلغاریہ اور جاپان کے درمیان ایک مغرب کی حمایتی یا حامی ریاست ہوگی اس تقسیم سے عراق میں تین سنی اکثریتی صوبے وجود میں آجائیں گے۔ ایک تراشیدہ ریاست کی صورت میں، جسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ یونان کے ساتھ مل جائیں یا مشرقی لبنان کے ساتھ۔ پرانے عراق کے جنوب میں شیعہ ایک عرب شیعہ ریاست کی بنیاد رکھیں گے جو پرشین گلف کا احاطہ کرے گی۔ اردن کا موجودہ علاقہ جنوب میں سعودی خرچ پر مزید وسیع کردیا جائے گا۔ کیونکہ سعودی عرب کی غیر قدرتی سرحدیں اسے نقصان دیں گی اگر انہیں الگ نہ کیا گیا جس طرح کہ پاکستان کی غیر قدرتی سرحدیں دیگر ہمسایہ ممالک کو نقصان پہنچارہی ہیں۔ مسلم دنیا میں غیر فعال یا بیکار حکومتوں کی ایک سب سے بڑی وجہ سعودی شاہی خاندانہ کا مکہ اور مدینہ پر جاگیردارانہ قبضہ ہے جہاں اسلام کے سب سے مقدس مزار شریف یعنی روضۂ اقدس پر ایک متعصب اور ظالم حکومت نے پولیس کے ذریعے کنٹرول کررکھا ہے۔ اس حکومت کے پاس وسیع پیمانے پر تیل کی دولت موجود ہے جس کے بل بوتے پر وہ وہاں نظریات یا عقیدے کو سخت گیر منظم اور متعصب طریقے سے اپنی سرحدوں سے باہر دور تک پھیلا رہے ہیں اور سعودی

حکومت کا دولت کے ذریعے بڑھتا ہوا یا اثر پیغمبرؐ کے بعد شروع ہونے والا مسلم دنیا کے لئے بدترین وقت ہے اور عربوں کے لئے دولت عثمانیہ کے بعد بدترین وقت۔ ذرا سوچیں کہ مسلم دنیا کے حالات کس قدر تسلی بخش ہوں گے اگر مسلمانوں کے بڑے فرقوں کو مکہ مکرمہ اور مدینہ شریف جیسے مقدس شہروں پہ باری باری حکومت کرنے کا موقع دیا جائے۔ عیسائیوں کی سب سے اعلیٰ پاپائی حکومت کی طرح مسلم سپرویٹی کن (Muslim Supervatican) قسم کی کوئی حکومت بنا دی جائے جہاں کسی عقیدے کے مستقبل کا حتمی فیصلہ کرنے کی بجائے اسے بات چیت کے ذریعے طے کیا جائے۔ ایک سچا انصاف، جسے شاید ہم پسند نہ کریں۔ جس کے ذریعے سعودی عرب کے تیل کے ذخائر پر شیعہ عرب کا بھی تصرف ہو جو وہاں آباد ہیں جبکہ ملحقہ جنوبی علاقہ یمن کو دے دیا جائے اور سعودی زمین میں سے بچا کھچا علاقہ ریاض شہر کی حدود کے اندر سعودی حکومت کو دے دیا جائے۔ اس طرح سعودی شاہی خاندان اسلام اور پوری دنیا کے خلاف کوئی کام یا شرارت کرنے کے قابل نہیں رہے گا اور اشتعال انگیز حد تک پھیلی ہوئی سرحدوں والا ایران، یا اپنا بڑا علاقہ آزر بائیجان، آزاد کردستان، عرب شیعہ اور آزاد بلوچستان کو دے گا لیکن موجودہ افغانستان میں سے ہرات کے اردگرد کے صوبے ایران کو ملیں گے جو کہ تاریخی اور لسانی اعتبار سے ایران کے لئے اہمیت رکھتے ہیں اس طرح درحقیقت ایران دوبارہ ایک نسلی یا یک گروہی علاقہ بن جائے گا مگر اس میں ایک سوال مشکل ہے کہ کیا ایران اپنی بندر عباس کی بندرگاہ عرب شیعہ اسٹیٹ کو دے دے گا یا خود اپنے پاس رکھے گا؟ اب افغانستان اپنے مغرب میں سے کچھ علاقہ اگر ایران کو دے گا تو اسے پاکستان کا شمال مغربی قبائلی علاقہ ملے گا جیسا کہ ہمارے سرحدی قبائل افغانستان کے ساتھ برادرانہ ہمدردیاں رکھتے ہیں۔ ایک اور غیر فطری ریاست ''پاکستان'' یا اپنا بلوچستان، آزاد بلوچستان کی صورت میں کھو دے گا یا اس سے محروم ہو جائے گا۔ باقی بچا ''قدرتی پاکستان'' تو اس کے پاس پورے کا پورا مشرقی سندھ ہوگا سوائے کراچی کے مغربی کنارے کے۔ متحدہ عرب امارت کی قسمت بھی ملی جلی ہے۔ کچھ علاقے عرب شیعہ ریاست کے ساتھ الحاق کریں گے اس لیے کہ وہ ایران کی بجائے پرشین گلف کے زیادہ قریب ہیں اور ان کے ساتھ رہ کر ترقی بھی کر سکتے ہیں۔ کچھ تہذیبوں کے معاملات انتہائی شدید نوعیت کے ہیں جیسا کہ دبئی وغیرہ۔ اسے ایک عیاشی کے اڈے کے طور پر اپنی موجودہ حدود میں رہنے کی اجازت ہوگی۔ اسی طرح کویت اور عمان بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کیس میں لسانی اور مذہبی مماثلت کے باعث ان رابطوں اور تعلقات کو دیکھتے ہوئے ایک خیالی نقشہ بنایا گیا ہے اور اس نقشے میں ان غلطیوں کو درست کرنے کی کوشش کی گئی ہے یا دوسرے الفاظ میں ان سرحدوں کو درست کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جو بیسویں صدی میں فرانسیسیوں اور انگریزوں نے بنائی تھیں۔ ان علاقوں کے لیے جن کے باشندے انیسویں صدی کی ذلالتوں اور شکستوں سے باہر نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ (مراد برصغیر پاک و ہند) لوگوں کی خواہشات کے مطابق درست سرحدوں کا قیام شاید ممکن نہ ہو لیکن اب وقت ہے کہ قتل و خون کو روکنے کی طرف توجہ دی جائے اور اس کے لیے نئی اور قدرتی سرحدوں کا قیام عمل میں لایا جائے جیسا کہ بابل کے شہر کو اجاڑ کر متعدد بار دوبارہ بسایا گیا۔ ہمارے مرد و خواتین متحد ہو کر دہشت گردی کے خلاف لڑیں۔ دنیا کو محفوظ بنانے، دنیا میں جمہوریت قائم کرنے، تیل تک رسائی حاصل کرنے، انقرہ اور کراچی کے درمیان طاقت کے زور پر انسانی تقسیم کے خلاف، خود کے پیدا کردہ مسائل اور مذہبی انتہا پسندی کو پروان چڑھانے اور سرحدوں پر دہشت گردی کا الزام لگانے کا کلچر اور طریقہ کار چونکہ عام رواج پا گیا ہے لہٰذا مرد و زن افسوس اور حسرت سے اپنی سرحدوں اور اپنے دشمنوں کی طرف بہت غصیلے اور پرجوش انداز میں

اس تبدیلی کی طرف دیکھتے ہیں جس کے ہم خواہاں ہیں چنانچہ اس کے لیے دہشت گردوں کو پوری امداد فراہم کرنے سے روکنے کے لیے مشرق وسطیٰ کی ازسرنو حد بندی کی ضرورت ہے۔ امریکہ، اس کے اتحادی اور ان کی افواج ایک نہ ختم ہونے والا بحران دیکھ رہے ہیں عراق سے امید کی ایک کرن ملتی ہے اور اگر اس پودے کو جڑ سے نہ اکھاڑا گیا تو ایک بہت بڑے علاقے میں خوفناک مسائل ہمارے سامنے کھڑے ہوں گے۔ مشرق وسطیٰ میں قائم خونی و ایمانی رشتوں میں بندی فطری سرحدیں اگر تبدیل نہ کی گئیں تو ایک شدید ایمانی قوت کا ریلا ہم سب کو بہا کر لے جائے گا۔"

یہ ہے رالف پیٹر کا وہ بے ہودا اور مکروہ آرٹیکل جو بلاشبہ پوری یہودی و نصرانی قوم و قیادت کے ناپاک عزائم کا عکاس ہے مگر دوسری طرف پیٹر کا یہ مضمون یہود و نصاریٰ کے اندر کے اس خوف کو بھی ظاہر کرتا ہے جو مسلمانوں کے اتحاد اور ایمان کی ایک ہی ٹھوکر سے پارہ پارہ ہو کر بکھر گئے اور صدیوں جوتے چٹخاتے رہے۔ لہٰذا وہ آج اسی مسلم اتحاد کے خوف سے کہ کہیں یہ مسلمان صدیوں پرانے وہی مسلمان بن کر نہ ابھر پڑیں جن کا اتحاد اور ایمانی قوت انہیں ایک بار پھر خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے چنانچہ وہ مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے، ان کے اندر لسانی و گروہی تفرقات پیدا کرنے، انہیں بدترین عیاشیوں کی راہ پر ڈالنے اور ان کے خلاف گھناؤنی سازشوں پر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ میدان عمل میں اتر چکے ہیں جس کے لیے شبانہ روز وہ اپنی دولت پانی کی طرح بہا رہے ہیں، سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ کیا ملت اسلامیہ ان دشمنان اسلام اور حاسدین ملک و ملت کے خواہشات کے مطابق ایسے بھیانک خوابوں کی تعبیر میں ان کی پیروکار بن چکی ہے؟ یا پھر ان کے مقابل ان کے خوابوں و ارادوں کو چکنا چور کرنے اور اپنی اسلامی، قومی، جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات کر سکے گی؟ اور کیا اس صیہونیت کے ان بھیانک و سہم ناک ارادوں کے آگے مضبوط بند باندھنے کے لیے عالم اسلام متحد ہو سکے گا؟ اور یہ وہ سوالات ہیں جن کے اب سوچنے کا نہیں، کچھ کر گزرنے کا وقت ہے۔

(ماہنامہ "کرنیں" 5 نومبر 2006ء)

قارئین یہ بھی یاد رکھیں کہ امریکی اور صیہونی عزائم کو ناکام بنانے کے لیے دو راہنما پیدا ہوئے تھے، وہ تھے ذوالفقار علی بھٹو اور شاہ فیصل۔ دونوں کو اسی لئے شہید کیا گیا کہ یہ راہنما امریکہ کی ان سازشوں کے خلاف تھے بلکہ ان کے راستے میں سد سکندری بنے ہوئے تھے جو اسلامی علاقوں کی تبدیلی کے لئے بنائی جا رہی ہیں۔ محترمہ بے نظیر صاحبہ کا قتل بھی ایک سازش کے تحت ہوا ہے تاکہ پاکستان میں علاقائی اور لسانی سیاست زور پکڑے اور امریکی اور صیہونی منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچے۔ سردست بھٹو خاندان ذوالفقار علی بھٹو اور محترمہ بے نظیر کے نقش قدم پر چل کر وفاق کی سالمیت کی علامت بن کر ابھرے ہیں۔ علاقائی اور لسانی سیاست کو دفن کر دیا ہے۔ پنجاب کا ایک بونا سیاست دان پرویز الٰہی (جو پرویز مشرف کو دس بار وردی میں صدر بنانے کا حامی ہے) امریکی منصوبہ کی تکمیل کے لیے علاقائی سیاست کو ہوا دے رہا ہے۔ ظہور الٰہی نے بھی یحییٰ خان کی قیادت میں یہی کھیل کھیلا تھا اور مشرقی پاکستان کو الگ کر کے امریکی منصوبہ کی تکمیل کی تھی۔

♥.....♥.....♥

بینظیر کا قتل: پاکستان کے سیاسی مستقبل پر گہرے منفی اثرات مرتب ہوں گے

پرویز بشیر/ریاض شاکر

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی ہلاکت نے پاکستان کے خاص و عام ہر طبقے کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اب اس ملک کا کیا بنے گا، اس ملک کا سیاسی مستقبل کیا ہوگا؟ سیاستدان، وکلاء، ڈاکٹر، انجینئر، فنکار، تاجروں، خواتین، مردوں اور بچوں نے بے نظیر بھٹو کی ہلاکت کے واقعہ پر خوف، غم، مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ جنگ نے ان تمام طبقوں سے ان کی آراء سنیں۔ حکمران طبقہ نے بے نظیر بھٹو کی ہلاکت کے واقعہ کو دہشت گردی کے خلاف جنگ کے ساتھ منسلک کیا ہے اور کہا ہے کہ اس واقعہ سے پاکستان کے سیاسی مستقبل پر بہت گہرے منفی اثرات مرتب ہوں گے اور اس واقعہ سے صورتحال جو خطرناک رخ اختیار کر گئی اسے سنبھالنا بہت مشکل ہوگا۔ کچھ حلقوں نے ملک کے عمومی حالات اور مستقبل کے بارے میں شدید خدشات کا اظہار کیا ہے۔ حکومت کے اندر اور باہر کے سیاستدانوں کا کہنا ہے کہ اس سانحہ سے ملک کی وفاقیت کو براہ راست نقصان پہنچے گا۔ بعض سیاستدانوں نے کہا کہ جب بے نظیر بھٹو اور نواز شریف نے ایک دوسرے کی حمایت شروع کی اور ایک دوسرے کے حق میں بیانات دیئے تب ہی غیر جمہوری قوتوں میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی تھی کیونکہ وہ قوتیں بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کا اتحاد نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ سیاستدانوں نے کہا کہ حکومت نے تین روزہ سوگ منانے کا اعلان کر کے مگر مچھ کے آنسو بہائے ہیں۔ قوم کو یہ نہیں بتایا کہ اس المناک واقعہ سے ملک میں جو آگ بھڑک اٹھی ہے اس کو کیسے ٹھنڈا کیا جائے گا۔ سیاستدانوں کا کہنا ہے کہ بے نظیر بھٹو کی ہلاکت سے ہونے والے نقصان سے نمٹنے کے لئے گہرے تدبر، حکمت اور سیاسی بردباری کی ضرورت ہے اور ملک کے مستقبل کی خاطر ہمیں سیاسی مصلحتوں سے بالاتر ہو کر لائحہ عمل مرتب کرنا ہوگا۔ بعض سیاستدانوں نے اس واقعہ کی ذمہ داری ڈالتے ہوئے صدر پرویز مشرف سے فی الفور اقتدار چھوڑنے کو کہا ہے کیونکہ یہ سب کچھ ان کی ضد کی وجہ سے ہوا ہے اور اب وقت آ گیا ہے کہ فوج اپنا کام کرے اور سیاستدان اپنا کام کریں۔ کچھ سیاستدانوں کی رائے تھی کہ ملک میں فوری طور پر قومی حکومت بنائی جائے اور اس کے بعد حالات بہتر ہونے پر شفاف اور منصفانہ انتخابات کرائے جائیں۔ بعض سیاستدانوں نے بے نظیر بھٹو کی ہلاکت کے واقعہ کو مسلم لیگ (ق) کے مستقبل کا خاتمہ قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ بے نظیر بھٹو کے وطن واپس آنے سے مسلم لیگ (ق) کو سیاسی نقصان ہوا اور ان کی ہلاکت سے مستقبل (ق) کا سیاسی مستقبل ہی ختم ہو گیا۔ بعض سیاستدانوں نے کہا کہ اگر بے نظیر بھٹو کے قتل کے اصل کردار منظر عام پر نہ آئے تو یہ واقعہ ملک کے لئے مزید خطرناک ہو سکتا ہے۔ وکلاء نے بے نظیر بھٹو کی ہلاکت کے واقعہ پر خدشہ ظاہر کیا کہ اس واقعہ سے ملک میں لاقانونیت بڑھ سکتی ہے اور لوگ قانون ہاتھ میں لے سکتے ہیں کیونکہ عوام شدید عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ جب ایسی صورتحال ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ملک کو کیسے کنٹرول کیا جائے۔ اس صورتحال میں ایمرجنسی کے علاوہ ماورائے قانون اقدامات بھی کیے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹروں، انجینئروں، طلبہ نے

بھی بے نظیر بھٹو کی ہلاکت کو ملک کے سیاسی اور غیر سیاسی مستقبل کے لئے خطرناک قرار دیا۔ عام شہریوں نے جن کا حکومت یا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ واقعہ حکومت کی نااہلی اور غفلت کی وجہ سے ہوا ہے۔ بے نظیر بھٹو نے وطن واپس آنے سے پہلے اور بعد میں متعدد بار خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ان کی جان کو خطرہ ہے مگر حکومت نے شاید اس کا احساس نہیں کیا اور حکومت کو اندازہ نہیں تھا کہ بے نظیر بھٹو کی جان کتنی قیمتی ہے۔ بعض شہریوں نے بے نظیر بھٹو کے قتل کی براہ راست ذمہ داری اعلیٰ حکومتی عہدیداروں پر عائد کی ہے۔ بعض شہریوں نے بے نظیر بھٹو کی ہلاکت پر 8 جنوری کو ہونے والے انتخابات کو بے معنی قرار دیا۔ بعض نے کہا کہ اس واقعہ کے بعد اب کونسی انتخابی مہم رہ گئی ہے اور اگر الیکشن ملتوی نہیں ہوتے تو خودکش حملہ تو کسی پر بھی ہوسکتا ہے۔ عوام اس واقعہ سے خوف زدہ ہو گئے ہیں اور پولنگ سٹیشنوں پر لوگ کیسے جائیں گے۔ تاجروں کا کہنا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے قتل سے ملکی معیشت پر بہت برے اثرات مرتب ہوں گے۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ بے نظیر بھٹو کے ختم ہونے سے پیپلز پارٹی بھی ختم ہوگئی کیونکہ بے نظیر بھٹو کا نام ہی پیپلز پارٹی تھا اور ماضی کی تاریخ گواہ ہے کہ بھٹو خاندان کو ہٹا کر پیپلز پارٹی بنانے کی ناکام کوششیں کیں۔ تاہم بعض حلقوں کا کہنا تھا کہ بھٹو کی موت کے بعد بھی پیپلز پارٹی قائم اور مضبوط رہی اور اب بھی مضبوط اور قائم رہے گی۔ نوجوانوں کا کہنا تھا کہ قوموں کی زندگی میں ایسے حادثات رونما ہوتے ہیں اور زندہ قومیں ایسے واقعات کا مقابلہ پامردی سے کرتی ہیں۔ ہمارا ملک قائم رہے گا اور اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی تاہم حکومت سرحدوں پر نظر ضرور رکھے کہ کوئی اس صورتحال کا فائدہ نہ اٹھا سکے۔ سکولوں میں پڑھنے والے بچوں کی اکثریت نے بے نظیر بھٹو کی ہلاکت کے واقعہ کو انتہائی دکھ کے ساتھ لیا اور کہا کہ ہمیں اپنے ملک کو ایسا بنانا چاہیے جہاں ہم سب کو تحفظ ہو۔ کوئی بختاور، بلاول یا آصفہ نہ بنے۔ بچوں کا کہنا ہے کہ بے نظیر بھٹو ہماری پسندیدہ لیڈر تھیں۔ گھریلو خواتین نے بے نظیر بھٹو کی ہلاکت پر غم کا اظہار کیا اور کہا کہ خواتین کو بے نظیر بھٹو کے سیاست اور اقتدار میں آنے سے حوصلہ ملا تھا مگر سیاست اور اقتدار میں آنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے تو خواتین کبھی آگے نہیں بڑھیں گی۔

(روزنامہ ''جنگ'' 28 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

مستقبل کا دھندلا سا خاکہ

مقتدا منصور

گزشتہ دو اظہاریوں میں ہم نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی لیاقت باغ راولپنڈی میں پراسرار حملے میں ہلاکت کے بعد پیدا ہونے والے کئی سوالات میں سے دو سوالات پر بحث کی تھی۔ پہلے اظہاریے میں اس سوال پر گفتگو کی تھی کہ ان کی شہادت کے ردعمل میں ہونے والے احتجاج کے دوران انتظامیہ نے تین دن تک عوام کو لوٹ مار کرنے والوں کے رحم وکرم پر کیوں چھوڑ دیا تھا؟ دوسرے اظہاریے میں ان اندرونی اور بیرونی عوامل کا جائزہ لینے کی کوشش کی تھی، جنہیں اس قتل سے فائدہ پہنچ سکتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھنے کی کوشش کی کہ امریکہ رفیق حریری کے قتل جیسی تحقیقات کے لئے دباؤ کیوں نہیں ڈال رہا؟ آج ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ محترمہ کے بغیر 18 فروری 2008ء کو متوقع انتخابات کے کیا نتائج برآمد ہوں گے اور مستقبل میں کیا سیاسی منظرنامہ متوقع ہے؟

پاکستان جو گزشتہ کئی برسوں سے ان گنت اندرونی و بیرونی چیلنجز کا مسلسل شکار چلا آ رہا تھا، محترمہ کی شہادت نے اسے تاریخ کے اس انتہائی نازک موڑ پر پہنچا دیا ہے، جہاں ذرا سی بھی غلطی یا کوتاہی بہت بڑی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف پاکستان دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی شروع کردہ عالمی جنگ میں فعال پارٹنر ہے اور اس کی مسلح افواج قبائلی علاقوں میں شدت پسندوں کے ساتھ مسلسل نبرد آزما ہیں۔ اس صورت حال نے پاکستان کو اب تک ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور اس کی اپنے ہی قبائلی علاقوں میں رٹ ختم ہو چکی ہے۔ حکومت کی کوششوں کے برخلاف شدت پسندی اور خودکش حملوں کے مظاہر میں تسلسل کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اور ان کا دائرہ کار قبائلی علاقوں سے نکل کر پورے پختون خواہ کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ اگر حکومت نے غیر ذمہ دارانہ اقدامات سے گریز نہیں کیا تو اس عفریت کے پورے ملک میں پھیل جانے کے خطرے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری طرف ملک پر عملاً فوجی اسٹیبلشمنٹ کی حکمرانی ہونے کی وجہ سے سیاسی عمل بڑی حد تک مفلوج ہے۔ جب کہ فرسودہ اور کرپٹ انتظامی ڈھانچے کی وجہ سے بڑھتی ہوئی مہنگائی اور امن وامان کی مخدوش صورت حال نے عام آدمی کو ذہنی الجھنوں اور سیاسی بیگانگی کا شکار کر دیا ہے۔ پھر آئندہ ماہ متوقع عام انتخابات کے حوالے سے بھی پوری قوم دو نقطہ ہائے نظر میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ایک طرف ملک کی بڑی سیاسی جماعتیں ہیں، جو آئندہ ماہ ہونے والے انتخابات میں حصہ لینے کی اس بنیاد پر حامی ہیں کہ وہ ملنے والی Space کو سیاسی عمل کی فعالیت کے لیے استعمال کر سکیں گی۔ جب کہ دوسری طرف وکلاء سمیت سول سوسائٹی کی تنظیمیں اور بعض اپوزیشن جماعتوں کا اتحاد APDM ہے، جو انتخابات کے اس وقت تک بائیکاٹ کا حامی ہے، جب تک کہ عدلیہ بحال نہیں ہو جاتی اور پرویز مشرف مستعفی نہیں ہو جاتے۔

ادھر عام انتخابات جو 8 جنوری کو متوقع تھے، محترمہ بے نظیر بھٹو کی ناگہانی موت کے باعث 18 فروری تک ملتوی کر دیے گئے ہیں۔ ملکی صورت حال اس وقت اس نہج پر جا پہنچی ہے کہ اگر انتخابات کو مزید ملتوی کیا جاتا ہے تو ملک ایک نئے اور سنگین سیاسی بحران میں گرفتار ہو سکتا ہے اور اگر انتخابات اپنے وقت مقررہ پر ہوتے ہیں تو نہ جانے مزید کتنے سانحے اس قوم کو بھگتنا پڑیں گے، جس کا موجودہ حالات کی روشنی میں بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پھر یہ سوال بھی لوگوں کے ذہن کو پریشان کیے ہوئے ہے کہ آیا ان کے نتیجے میں ملک میں سیاسی، سماجی اور معاشی استحکام کی توقع کی بھی جا سکتی ہے یا نہیں؟

اب اگر آئندہ انتخابات کے حوالے سے مجموعی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے اور انتخابات کا مرحلہ قریب آ رہا ہے، کسی بڑی تبدیلی کا امکان ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ طے ہے کہ محترمہ کی شہادت کے بعد پیپلز پارٹی کو بڑی تعداد میں ہمدردانہ ووٹ پڑیں گے، لیکن وہ اتنی نشستیں نہیں لے پائے گی یا اسے لینے نہیں دی جائیں گی کہ آزادانہ طور پر مرکز اور صوبوں میں حکومت سازی کر سکے۔ اغلب گمان یہی ہے کہ حکومت سازی کے لئے پیپلز پارٹی، قاف لیگ، متحدہ قومی موومنٹ اور جمعیت علمائے اسلام کو باہمی مفاہمت کی راہ اختیار کرنا ہوگی۔ حالات و واقعات کی روشنی میں آئندہ کے سیاسی انتظامی ڈھانچے پر نظر ڈالی جائے تو وزارت عظمیٰ پیپلز پارٹی ہی کو ملنے کا قوی امکان ہے، مگر پنجاب، سرحد اور بلوچستان میں وزارت اعلیٰ شاید اس کے حصے میں نہ آ سکیں۔ البتہ سندھ میں وزارت اعلیٰ تو اسے مل جائے مگر وہاں بھی ایم کیو ایم کے ساتھ مخلوط حکومت بنانے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ آصف زرداری اپنی پریس کانفرنس میں پہلے ہی یہ عندیہ دے چکے ہیں کہ انتخابات جیتنے کی صورت میں مخدوم امین فہیم پارٹی کی طرف سے وزارت عظمیٰ کے امیدوار ہوں گے، اس لیے ان کے آئندہ وزیر اعظم بننے کے قوی امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ بھی توقع کی جا رہی ہے کہ بے نظیر بھٹو جیسی قد آور سیاسی شخصیت کے مقابلے میں مخدوم صاحب کا صدر پرویز کے ساتھ چلنا قدرے آسان ہوگا۔ اس طرح سرکاری منصوبہ سازوں کی طے کردہ حکمت عملی کے مطابق انتخابات کے نتائج اور بعد کے تمام مراحل بہ خوبی سرانجام پا جائیں گے، جس کے نتیجے میں جنرل (ر) پرویز مشرف ایک بار پھر مکمل انتظامی اختیارات اور بھرپور امریکی آشیرواد کے ساتھ امور مملکت پر حاوی ہو جائیں گے اور اسٹیبلشمنٹ کو درپیش حالیہ مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ مگر یہاں چند سوالات پھر ابھرتے ہیں۔ اول یہ کہ سول سوسائٹی کے دو اہم شراکت داروں یعنی وکلا، اور میڈیا کی جانب سے شروع کردہ تحریک کیا منطقی انجام تک پہنچے بغیر ختم ہو جائے گی؟ دوم یہ کہ وہ تمام عناصر جو قبائلی علاقوں میں مزاحمت کر رہے ہیں، انتخابات کے بعد کیا اتنی آسانی سے ساتھ پسپائی اختیار کر لیں گے؟ سوم یہ کہ پاکستان اپنے اطراف میں موجود دھماکا خیز صورت حال میں اپنا تشخص برقرار رکھ سکے گا؟

پاکستان میں اس وقت دو طرح کے عوامل سرگرم ہیں۔ اول وہ عناصر جو پاکستان میں اپنے علاقائی اور بین الاقوامی مفادات کی خاطر جمہوری سیٹ اپ قائم نہیں ہونے دینا چاہتے اور ملک میں فوجی اسٹیبلشمنٹ کی بالادستی کو قائم رکھنے کے خواہش مند ہیں، جب کہ دوسرے وہ عناصر ہیں جو امریکہ کے خلاف سرگرم ہیں اور مذہبی طور پر شدت پسند ہونے کی وجہ سے جمہوریت کو اسلام کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان میں جمہوری حکومت کے قیام سے ان کے کاز کو نقصان پہنچے گا اور پاکستانی عوام میں ان کی پذیرائی میں کمی واقع ہوگی۔ پھر جیسا کہ اوپر بیان کیا

جاچکا ہے کہ سول سوسائٹی کے بعض شراکت دار جمہوریت اور جمہوری اداروں کی بحالی کو پرویز مشرف کے استعفے سے مشروط کرتے ہوئے انتخابات کے بائیکاٹ پر اصرار کر رہے ہیں۔ اس پوری کشمکش میں بے نظیر بھٹو وہ واحد رہنما تھیں، جن میں ملک کی تمام لسانی اکائیوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے اور مختلف رجحانات کی حامل قوتوں کو ساتھ لے کر چلنے کی اہلیت پائی جاتی تھی۔ وہ عالمی اور علاقائی صورت حال کے تناظر میں موجودہ سیٹ اپ کے ساتھ ڈائیلاگ کرتے ہوئے جمہوری اداروں کی بحالی کے لئے مرحلہ وار اقدام اٹھانے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ مگر انہیں راستے سے ہٹا دینے جانے کے بعد مختلف متحارب قوتوں کو کسی قابل قبول فارمولے پر متفق کرنا مشکل ہو چکا ہے، جس کے نتیجے میں تناؤ کی موجودہ لہر میں کمی کے بجائے اضافے کے خدشات بھی بڑھ گئے ہیں۔ لہٰذا یہ تصور کرنا کہ انتخابات 18 فروری کو منعقد ہو جائیں گے اور ان کے نتیجے میں کوئی ایسی حکومت بن سکے گی، جو موجودہ سیٹ اپ کے ساتھ چل سکے، محض ایک خوش فہمی ہے۔ اس وقت ایک ایسی قومی حکومت ہی ملک کو اس سنگین صورت حال سے نکال سکتی ہے جس میں تمام سیاسی جماعتوں کی نمائندگی ہو اور ساتھ ہی اسٹیبلشمنٹ بھی قومی مفاد میں پیچھے ہٹنے پر آمادہ ہو سکے۔

(روزنامہ ''ایکسپریس'' 14 جنوری 2008ء)

♥ ..... ♥ ..... ♥

بے نظیر کی شہادت اور امریکہ کا خطرناک منصوبہ

قومی اتحاد اس وقت کی اہم ترین ضرورت

ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ

میں کراچی کے حلقہ NA-250 سے پی پی پی اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کے مشترکہ امیدوار کی حیثیت سے انتخاب لڑ رہا ہوں اور اپنی انتخابی مہم میں بے حد مصروف ہونے کے باوجود بینظیر بھٹو کی المناک شہادت کے بعد امریکہ کی اٹاوہ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر مائیکل کوسووسکی کے "دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ" کے عنوان سے لکھے گئے ایک مضمون کو حد درجہ نرم کر کے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

ملک کی غیر یقینی سیاسی اور امن و امان کی ابتر صورتحال کی وجہ سے امریکہ اور یورپ کی پاکستان کے نیوکلیئر اثاثوں کے غیر محفوظ ہونے کے بارے میں بڑھتی ہوئی تشویش اور اس سلسلے میں ان کے پروپیگنڈہ کی وجہ سے بین الاقوامی سطح پر میڈیا میں زیر بحث مختلف تجاویز اور تحفظات نے میری توجہ بھی اس اہم موضوع کی طرف مبذول کر دی اور ملکی معاشی صورتحال پر لکھنے کی خواہش کے باوجود میرا یہ قومی فرض ہے کہ میں اپنے قارئین کی توجہ اس اہم موضوع کی طرف دلاؤں تا کہ اجتماعی کاوشوں سے ملک کو موجودہ نازک صورتحال سے بچانے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ 30 دسمبر کی ایک چھ صفحاتی گلوبل ریسرچ رپورٹ میں ان کا دیا گیا پاکستان کا نقشہ ملک دشمن طاقتوں کی سوچ کا مظہر ہے جس کی ہم شدید مذمت کرتے ہیں۔ پاکستان مسلم امہ کی واحد ایٹمی طاقت ہے اور یہ بات روز اول سے امریکی یہودی نواز لابی کو کھٹک رہی ہے اور ان کی پوری کوشش ہے کہ کسی طرح پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے محروم کر دیا جائے یہی وجہ ہے کہ وہ ایران کے ایٹمی پروگرام کے بھی سخت مخالف ہیں میں اپنے قارئین پر یہ بات اس لیے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ملک دشمن طاقتوں کے ناپاک عزائم کو سمجھ سکیں۔

مذکورہ امریکی پروفیسر کی رپورٹ کی رو سے بینظیر بھٹو کے قتل نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں جن کے نتیجے میں پاکستان سیاسی عدم استحکام اور اندرونی خلفشار کا شکار ہو سکتا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ملکی صورتحال کو مزید گھمبیر کرنے کے لیے امریکہ پاکستان میں دہشت گردوں کو خفیہ طور پر سپورٹ کر رہا ہے اور امریکی حکومت کا دانستہ طور پر وطن عزیز کو غیر مستحکم کرنے کا مقصد پاکستان میں وسیع تر امریکی فوجی موجودگی کو یقینی بنانا ہے۔ پاکستان میں کچھ جگہوں پر امریکی فوجی اڈے موجود ہیں اس کے علاوہ امریکہ مزید فوجی دستے پاکستان بھیجنا چاہتا ہے جن کا بظاہر مقصد دہشت گردوں کی سرکوبی ہے۔ پاکستان میں مزید فوجی دستوں کے بھیجنے کی امریکی خواہش کا تعلق مشرق وسطیٰ کی صورتحال سے بھی ہے کیونکہ امریکی منصوبہ ہے کہ مڈل ایسٹ کی جنگ کے دائرے کو مزید وسعت دی جائے۔

2005ء میں امریکی نیشنل انٹیلی جنس کونسل اور سی آئی اے نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک دہائی کے اندر اندر صوبائی نفرتوں اور لسانی عصبیتوں

کے عروج پر پہنچنے سے پاکستان میں خانہ جنگی کے آغاز ہوسکتا ہے۔ ملک کے مختلف شمالی علاقوں پر مقامی طالبان کے قبضے سے پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کا انتہا پسندوں کے ہاتھ لگنے کا خطرہ پیدا ہوسکتا ہے اور ان حالات کی وجہ سے پاکستان 2015ء ناکام ریاست بن سکتا ہے۔ رپورٹ کی رو سے جاری افراتفری کے ماحول میں ملک کی مرکزی حکومت کا کنٹرول پنجاب اور صنعتی حب کراچی تک محدود ہو جائے گا۔ پاکستان دہائیوں سے جاری اپنی سیاسی اور معاشی بدانتظامیوں، غیر ہم آہنگ پالیسیوں، قانون کی حکمرانی کے فقدان اور بدعنوانی جیسے امراض سے باآسانی جان نہیں چھڑا سکے گا جس سے پیدا شدہ معاشرتی اور نسلی انتشار خدانخواستہ پاکستان کو تقسیم کرنے کی سازش میں مددگار ہوسکتا ہے۔ واضح ہو کہ پاکستان کے لیے امریکی ایجنڈا وہی ہے جو اس نے مشرق وسطیٰ کے ایشیائی ممالک کے لیے اپنایا ہے۔ امریکی حکمت عملی کے تحت پاکستان میں خفیہ انٹیلی جنس آپریشن کی سپورٹ، مذہبی اور لسانی فرقوں میں اضافہ، علیحدگی پسند تحریکوں کی مالی مدد اور وفاقی اداروں کو کمزور کر کے قومی ریاست کو تقسیم کرنا ہے۔ یہی امریکی حکمت عملی عراق، ایران، شام اور افغانستان کے لیے ہے۔

جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کا محل وقوع نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس امریکی منصوبے میں پاکستان کے صوبے بلوچستان کو زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ بلوچستان پاکستان کے کل رقبے کے تقریباً 40% سے زائد ہے پاکستان میں تیل اور گیس کے زیادہ تر ذخائر بلوچستان میں ہیں۔ اس کے علاوہ اسٹریٹ آف ہرمز جہاں سے جہازوں اور پائپ لائنوں کے ذریعے روزانہ دنیا کے 30% تیل کی سپلائی ہو رہی ہے بھی بحیرہ عرب بلوچستان میں چین کے تعاون سے بنائی جانے والی گوادر پورٹ کے قریب ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پاکستان میں قدرتی گیس کے 25.1 ٹریلین کیوبک فٹ کے کل ذخائر میں 19 ٹریلین کیوبک فٹ قدرتی گیس کے ذخائر بلوچستان میں ہیں۔ تیل اور گیس کے مشہور بین الاقوامی کنٹریکٹر، اٹلی، آسٹریا، آسٹریلیا کے بلوچستان میں کام کر رہے ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے تحت پاکستان کی اسٹیٹ آئل اور گیس کمپنیوں بشمول پی پی ایل جس کا بلوچستان کے سوئی آئل فیلڈز میں سب سے بڑا حصہ ہے کی نجکاری ہونے والی ہے۔ آئل اینڈ گیس جرنل (OGJ) کے مطابق پاکستان کے پاس 300 ملین بیرل تیل کے مصدقہ ذخائر زیادہ تر بلوچستان میں ہیں۔ قدرتی وسائل اور ذرائع سے مالا مال صوبہ بلوچستان میں امریکی اور برطانوی حکومتیں شورش، بغاوت، قوم پرستی اور سرکشی کو ہوا دینے میں مصروف ہیں۔ قیام پاکستان سے ہی بلوچستان بے چینی اور شورش کا مرکز رہا ہے۔ موجودہ سیاسی اور جغرافیائی تناظر میں بیرونی طاقتیں بلوچستان میں علیحدگی پسند تحریکوں اور قوم پرستوں کی حمایت کر رہی ہیں۔ جون 2006ء میں پاکستان کی سینیٹ کمیٹی برائے دفاع نے برطانوی ایجنسیوں پر بلوچستان میں باغیوں کی مدد کرنے کا الزام عائد کیا تھا عالمی دہشت گردی کے خلاف موجودہ امریکی اقدامات کا مقصد خودمختار حکومتوں کو سیاسی طور پر غیر مستحکم کر کے اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنا ہے۔ 1990ء کی دہائی میں کوسووو لبریشن آرمی کو بھی امریکی ایجنسیوں نے علیحدگی پسندی کے سلسلے میں ٹریننگ دی تھی جسے ڈرگ ٹریڈ سے فنانس کرنے کے علاوہ امریکی سی آئی اے اور جرمنی کی بی این ڈی نے سپورٹ کیا تھا۔ امریکہ عظیم تر بلوچستان کا خواہاں ہے تاکہ اسے ایران کے علاوہ جنوبی افغانستان کے ساتھ شامل کر کے ایران اور پاکستان کو سیاسی اعتبار سے عدم استحکام کا شکار بنا دیا جائے۔ فوجی تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ بلوچستان کو ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت سے قائم کرنا ممکن نہ ہوگا اسی لیے اس کا الحاق ایرانی بلوچستان سے ہوسکتا ہے جبکہ صوبہ سرحد افغانستان میں ضم ہو جائے گا کیونکہ ان میں لسانی اور نسلی اشتراک پہلے ہی موجود ہے۔ امریکہ نے اپنی اس پالیسی کے تحت پاکستان کے موجودہ رقبے

میں 50% کمی لائی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان اپنے ساحلی خط بحیرہ عرب سے بھی محروم ہوسکتا ہے۔ یہ نقشہ نیوی ڈیفنس کالج کے ٹریننگ پروگرام میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہ نقشہ اور اسی طرح کے ملتے جلتے دوسرے نقشے امریکہ کی نیشنل وار اکیڈمی اور ملٹری پلاننگ میں استعمال ہوئے ہیں۔ 1991ء میں امریکہ اور نیٹو نے بوسنیا، کوسووا اور مقدونیا میں اسلامی گروپوں کو ختم کرنے اور علیحدگی پسند پیرا ملٹری فوجوں کی خفیہ سپورٹ کی جس سے وہاں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ امریکی انٹیلی جنس علیحدگی پسندوں کو سپورٹ کرنے کے اپنے وسیع تجربے کو پاکستان میں استعمال کرنا چاہتی ہے۔

ایک بھارتی اخبار کے مطابق بینظیر بھٹو کے قتل نے پاکستان کے لیے انقلاب کا وہی دروازہ کھول دیا ہے جس طرح 1975ء میں سابق افغان شہنشاہ ظاہر شاہ کے خلاف ان کے چچازاد بھائی جنرل محمد داؤد کی قیادت میں افغانستان کے لیے کھولا تھا جس کے نتیجے میں افغانستان میں خوفناک حادثات اور المناک واقعات رونما ہوئے اور بالآخر اس پر امریکی اور اتحادی افواج کا قبضہ ہوگیا۔ جس سے وہاں کی عوام کو تباہی و بربادی، نسل کشی، فقر و فاقہ اور بدامنی و بدنظمی کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اسی طرح پاکستان کے بارے میں کہا جانے لگا ہے کہ اس کے نیوکلیئر ہتھیاروں کے غیر محفوظ ہونے کی بنا پر اس پر کسی بھی وقت فوج کشی کی جاسکتی ہے۔ اخبار لکھتا ہے کہ بینظیر بھٹو کی موت کے بعد یا اس سے پہلے پاکستان میں جس طرح کے حالات پیدا ہوئے ہیں اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ جس آگ کے شعلوں سے افغانستان کو داغا گیا اسی آگ کے شعلوں سے اب پاکستان کو بھی تباہ کرنے کی کوشش ہورہی ہیں۔ اس وقت پاکستان کے جو حالات ہیں اگر یہ اسی رخ پر چلتے رہے تو یہاں اسی طرح کی خانہ جنگی اور قتل و غارت ہو سکتی ہے جیسی افغانستان میں ہوئی تھی اور بظاہر یہی محسوس ہورہا ہے کہ افغانستان کا تجربہ اب پاکستان میں دہرایا جارہا ہے میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ سب پیش گوئیاں غلط ثابت ہوں۔

ملکی امن و امان کی حالت ابتر ہوتی جارہی ہے اور ایک وقفے کے ساتھ خودکش بم دھماکوں کا سلسلہ جاری ہے جس میں سینکڑوں قیمتی انسانی جانیں ضائع ہوچکی ہیں۔ اس طرح کے واقعات سے شہریوں میں جان و مال کے حوالے سے عدم تحفظ کا احساس بڑھتا جارہا ہے۔ امن و امان کی موجودہ خراب صورتحال ملک کے لیے نیک فال نہیں ہے۔ پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے حوالے سے ذمہ دار امریکی حلقوں خصوصاً انتخابی امیدواروں کے بیانات اور پاکستان کی مغربی سرحدوں پر حملے کی دھمکیوں نے پوری قوم کو تشویش میں مبتلا کردیا ہے۔ اس حوالے سے امریکی، اسرائیلی اور بھارتی عزائم کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ دہشت گردی کی کارروائیوں کے ذریعے پاکستان کو ناکام ریاست ثابت کرنے کی کوششیں کی جارہی ہے۔ دشمن طاقتیں وطن عزیز پاکستان کو سیاسی انتشار کا شکار بنا کر اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنا چاہتی ہیں کیونکہ اندرونی محاذ آرائی بیرونی جارحیت کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ اس پس منظر میں اپنے ایٹمی اثاثوں کا تحفظ، وفاق کو مضبوط، ملکی سلامتی و بقاء کو یقینی اور پاکستان دشمنی قوتوں کے عزائم کو ناکام بنانے کے لیے قومی اتحاد وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ قومی اتحاد ایٹم بم سے بھی زیادہ طاقتور ہوتا ہے جس سے قوم ہر طرح کے چیلنجوں کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ آج ہمیں اتحاد کی انتہائی ضرورت ہے میری قوم سے درخواست ہے کہ اس نازک وقت پر صرف پاکستانی بن کر سوچیں کیونکہ اسی میں ہماری بقاء ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ قائداعظم کا بنایا ہوا یہ ملک تاقیامت قائم رہے گا۔

(روزنامہ جنگ، لاہور 22 جنوری 2008ء)

♥ ..... ♥ ..... ♥

(امریکہ کی ریشہ دوانیاں)
بدلی جاتی ہے، بدلتی نہیں تقدیر کبھی.....!

جاوید قریشی

اہلیان پاکستان کو ملک کے داخلی معاملات اور بیرونی خطرات سے اس سے پہلے کبھی اتنی پریشانی لاحق نہ تھی جتنی آج کل ہے۔ ملک میں سیاسی حالات تو جو ہوں سو ہوں (اور وہ بھی انتہا سے زیادہ پریشان کن)۔ لاء اینڈ آرڈر کی جو کیفیت حکومت کی پالیسیز اور نااہلی کی وجہ سے ہوگئی ہے سو بان روح ہوئی جاتی ہے۔ خودکش بمباروں اور دہشت گردوں سے ملک کا کوئی حصہ محفوظ نہیں۔ لاہور میں پولیس پر خودکش حملہ جس میں 25 جانیں تلف ہوئیں اور 70 کے قریب زخمی، اسی ضمن کی تازہ ترین کارروائی ہے۔ بیرونی دنیا میں پاکستان کا نام اور دہشت گردی لازم وملزوم قرار پائے ہیں۔ ہماری رسوائیوں کا آغاز یوں تو ضیاء الحق کے زمانہ میں ہوگیا تھا لیکن اسے کمال تک پہنچانے کا کام پرویز مشرف کے ہاتھوں ہوا۔ اس کے باوجود حکمرانی کو ہمارے مہربان اور شیر مادر سمجھ کر دائمی اس سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ خدا جانے اصلاح کیسے اور کب شروع ہوگی؟ زیر نظر تحریر شائد قارئین کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہو سکے۔

امریکی صدر کے سیکورٹی مشیروں نے خفیہ ادارے سی۔ آئی۔ اے اور امریکی فوج کو پاکستان میں خفیہ آپریشن کرنے کا اختیار دینے کے معاملہ پر غور شروع کر دیا ہے۔ پاکستان نے اس رپورٹ کو یکسر مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ اپنی سرزمین پر کسی کو کارروائی کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس سے پہلے بھی پاکستان کی طرف سے اس قسم کے دعوے یوں تو کئے جاتے رہے ہیں لیکن امریکہ نے جب بھی ضروری سمجھا تنبیہ کے باوجود شمالی علاقوں میں حسب ضرورت کارروائی کی۔ امریکی اخبار "نیویارک ٹائمز" کی ایک رپورٹ کے مطابق جمعہ کے روز وہائٹ ہاؤس میں ہونے والے ایک اجلاس کی صدارت صدر بش نے کی۔ جس میں نائب صدر ڈک چینی، وزیر خارجہ کونڈالیزا رائس، قومی سلامتی کونسل کے مشیر، وزارت دفاع کے اعلیٰ حکام اور نیشنل سیکورٹی کونسل کے عہدے داروں نے بھی شرکت کی۔ اخبار کے مطابق اس اجلاس میں پاکستانی سرزمین پر سی۔ آئی۔ اے اور امریکی فوج کی جانب سے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں دہشت گردوں کے خلاف جارحانہ مگر خفیہ کارروائی کرنے پر غور کیا گیا۔ اخبار کے مطابق امریکی سیکورٹی مشیروں کی میٹنگ اس پس منظر میں ہو رہی ہے کہ القاعدہ نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے بعد پاکستان میں کارروائیاں بڑھا دی ہیں۔ پاکستان کے سیکورٹی ادارے ان کے خلاف مؤثر کارروائی کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس میٹنگ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بے نظیر بھٹو کی شہادت سے پاکستان میں پیدا ہونے والی صورت حال کے بعد امریکی حکمت عملی تبدیل کرنے اور 18

فروری کو ہونے والے انتخابات پر بھی غور کیا گیا۔ اجلاس میں کئی مشیروں کا مؤقف تھا کہ اس وقت پاکستانی صدر مشرف انتہائی غیر مقبول ہو چکے ہیں اور کچھ شرکاء نے خدشہ ظاہر کیا کہ صدر مشرف کی حکومت کو القاعدہ سے اتنا شدید خطرہ لاحق ہے کہ شاید مشرف اور فوج کے نئے سربراہ امریکہ کو قبائلی علاقوں میں کارروائی کرنے کی اجازت دینے پر رضامند ہو جائیں۔ اس اجلاس میں پاکستان میں کارروائیاں کرنے پر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ امریکی پالیسی سازوں کا خیال ہے کہ نئے آرمی چیف جنرل اشفاق کیانی امریکی تحفظات پر زیادہ ہمدردانہ رویہ رکھیں گے۔ (اس زیادہ ہمدردانہ رویہ کی بظاہر کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی) امریکی مشریوں کا خیال ہے کہ اس وقت پاکستان کے قبائلی علاقوں تک اپنا اثر رسوخ بڑھانے کا بہترین موقع ہے۔ ایک گمنام امریکی مشیر نے ''نیویارک ٹائمز'' کو بتایا کہ شدت پسند قوتیں کئی سال تک افغانستان پر توجہ مرکوز رکھنے کے بعد اب اس سے بھی بڑے انعام پاکستان پر اپنی توجہ مرکوز کر چکی ہیں۔ اس وقت 50 امریکی فوجی پاکستان کی سرزمین پر موجود ہیں۔ ماضی میں مجموعی طور پر امریکہ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں آپریشن کرنے سے باز رہا ہے اور القاعدہ کے رہنماؤں پر اکا دکا حملوں کے علاوہ اس نے کوئی بڑی کارروائی نہیں کی۔ امریکی فوجی عہدے دار اور سفارت کار اب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قبائلی علاقہ میں امریکی آپریشنز سے نامقبول صدر مشرف کی غیر مقبولیت میں مزید اضافہ ہو جائے گا اور ان پر مزید دباؤ بڑھ جائے گا اور پاکستانی فوج میں بھی نفرت بڑھے گی نیز شدت پسند مقبول ہوں گے۔

ایک طرف تو امریکی خفیہ ایجنسی کے مشیروں کی رائے کہ صدر مشرف بہت غیر مقبول ہو چکے ہیں جس کا ذکر ''نیویارک ٹائمز'' کی متذکرہ بالا رپورٹ میں کیا گیا۔ دوری طرف بیجنگ میں قائم انسانی حقوق سے متعلق تھنک ٹینک انٹرنیشنل کرائسس گروپ (I.C.G.) کا یہ مطالبہ کہ پاکستان میں استحکام کے واسطے ضروری ہے کہ صدر مشرف اپنے عہدہ سے فوری طور پر سبکدوش ہو جائیں۔ جس کی بجائے جمہوری طریقوں سے منتخب ہونے والی ایک سول حکومت قائم کی جائے۔ ظاہر ہے کہ جنرل (ر) پرویز مشرف کی عدم مقبولیت کے چرچے اب ملک کے طول و عرض سے تجاوز کر کے ''دوست ممالک'' میں بھی عام ہو چکے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ریلیز ہونے والی اس رپورٹ میں زور دیا گیا ہے کہ بے نظیر کے قتل کی تفتیش کے واسطے بین الاقوامی امداد فراہم کی جائے جو صرف برطانیہ اور امریکہ دو ممالک تک محدود نہ ہو بلکہ اقوام متحدہ کی سیکورٹی کونسل کی زیر نگرانی ایک کمیشن اسی طرز پر قائم کیا جائے جیسا لبنان کے مقتول وزیراعظم رفیق حریری کے قتل کی چھان بین کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ رپورٹ کا یہ بھی کہنا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے تفتیش پر عوام کو کبھی بھی تسلی نہیں ہوگی کہ یہ دونوں ممالک صدر مشرف کے بہت قریب سمجھے جاتے ہیں اور ان کی غیر جانب داری بھی شک و شبہ سے بالاتر تصور نہیں ہوگی۔

(روزنامہ ''نوائے وقت'' 14 جنوری 2008ء)

♥ ..... ♥ ..... ♥

پاکستان کے جوہری اثاثوں پر بیرونی خطرات کے سائے

اشتیاق بیگ

بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی کے سربراہ محمد البرادی کے حالیہ بیان نے پورے ملک میں تشویش کی لہر دوڑا دی ہے ان کا یہ بیان پاکستان کے جوہری اثاثوں کو درپیش ممکنہ خطرات کا پیش خیمہ ہے۔ محمد البرادی نے کہا کہ ''ملک میں لاقانونیت اور بگڑتے ہوئے حالات کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ انتہا پسند ایک ایسے ملک میں اپنی جڑیں مضبوط کر سکتے ہیں جس کے پاس چالیس سے پچاس ایٹمی وار ہیڈز موجود ہیں جن کا انتہا پسندوں کے ہاتھ لگنے کا خطرہ ہے۔'' انھوں نے مزید کہا کہ ایران پر حملے کی صورت میں جنگ کا ایران سے زیادہ برا اثر پاکستان پر پڑ سکتا ہے جہاں بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد صورتحال انتہائی نازک ہوگئی ہے۔ یہ محض ایک بیان نہیں بلکہ خطرے کی ایک گھنٹی ہے۔ اس سے قبل اہم امریکی صدارتی امیدوار ہیلری کلنٹن جن کے صدر بننے کے قوی امکانات ہیں کے اس بیان نے پاکستانیوں کو حیرت میں ڈال دیا کہ اگر وہ برسر اقتدار آ گئیں تو وہ صدر مشرف پر زور دیں گی کہ وہ پاکستان کے جوہری اثاثوں کو امریکہ اور برطانیہ کی مشترکہ نگرانی میں دیں تاکہ وہ غیر محفوظ ہاتھوں میں نہ جائیں۔ بے نظیر کی شہادت کے بعد جو ملکی حالات خراب ہوئے اس کے بعد پاکستان کے جوہری اثاثوں کے خلاف بیانات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ امریکہ کے تقریباً تمام صدارتی امیدواروں نے بھی ایسے بیانات دیے ہیں جو موجودہ حالات میں ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ صدارتی امیدوار چرڈسن نے تو یہاں تک کہا کہ پاکستان ایک ناکام ریاست ہے جس کے پاس جوہری ہتھیار ہیں۔ پاکستانی حکومت نے القائدہ کے خلاف خاطر خواہ کارروائی نہیں کی حالانکہ ہم نے انھیں اس مقصد کے لیے 11 ارب ڈالرز کی خطیر رقم فراہم کر چکے ہیں۔ امریکی صدارتی امیدواروں کی طرح امریکی اور مغربی میڈیا بھی پاکستان کے جوہری اثاثوں کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے میں شب و روز مصروف ہیں۔

امریکی صدارتی امیدواروں کے بیانات، بین الاقوامی ایٹمی ایجنسی کے سربراہ کے ریمارکس، مغربی میڈیا کا بے پناہ پروپیگنڈہ یہ سب اس گھناؤنے منصوبے اور سازش کا حصہ ہے جس میں دنیا بھر کی اسلام اور پاکستان دشمن لابی متحد ہو کر ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں کہ پاکستان کو کسی بھی طرح اس کے ایٹمی اثاثوں سے محروم کر دیا جائے۔ مغربی طاقتیں جب کسی ملک کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کرتی ہیں تو وہ اسی طرح کے پروپیگنڈے کا سہارا لیتی ہیں اور عراق کے خلاف حملے کے وقت بھی اسی طرح کے پروپیگنڈے کا سہارا لیا گیا تھا۔ واضح ہو کہ ایران کے خلاف جنگ کا بہانہ ڈھونڈنے کے لیے اسی طرح کے پروپیگنڈے کا سلسلہ جاری ہے اور محمد البرادی کا حالیہ دورہ ایران بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس سے قبل میں اپنے گزشتہ دو کالموں میں ان خطرات کا اظہار کر چکا ہوں کہ بیرونی طاقتیں ہمارے ایٹمی اثاثوں کے درپے ہیں میرے مذکورہ دو کالموں کی اشاعت کے بعد کچھ دوستوں نے مجھے کہا تھا کہ تم خواہ مخواہ ایک خوف کا شکار ہو مگر میں نے اس وقت بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ میری ان

تحریروں کا پس منظر کوئی ڈر یا خوف بالکل نہیں اور نہ ہی میں ہرگز کسی کو خوفزدہ کرنے کے لیے ایسا کر رہا ہوں بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ ہمیں البرادی کی سطح کے آدمی کے بیان کو معمولی سمجھ کر اسے رد نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں ان بیانات کو موجودہ حالات میں نہایت سنجیدگی سے لینا ہوگا۔

پاکستان کے خلاف اس الزام تراشی کے پس پردہ حقائق کا بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا کہ بعض نادیدہ ہاتھ پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کو محاصرے میں لینے کی سازش کا نیا جال بن رہے ہیں اور پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے خلاف بین الاقوامی سازشیں زور پکڑ رہی ہیں اور البرادی بھی اس سازش کا اہم کردار ہیں۔ آج یہ ایٹمی اثاثے شدید خطرات سے دوچار ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت بھی اسی سازش کی ایک کڑی ہے کیونکہ وہ جمہوری جدوجہد میں مصروف تھیں۔ لیاقت باغ کے جلسے میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے ایٹمی امریکی دھمکیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا کہ غیر ملکی کہتے ہیں کہ پاکستان کے حالات نہایت خراب ہیں اور موجودہ حکمران انھیں کنٹرول نہیں کر سکتے اور ہم آ کر ان بگڑتے ہوئے حالات کو کنٹرول کریں گے محترمہ نے زور دے کر کہا تھا کہ غیر ملکی یہاں کیوں آئیں گے پاکستان کے عوام میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ اپنے ملک اور اس کے اثاثوں کی حفاظت کر سکتے ہیں میں اس ملک کی حفاظت کروں گی اور عوام کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ آپ اس ملک کی حفاظت کریں گے۔ واضح ہو کہ کراچی میں ہونے والے پہلے قاتلانہ حملے کے بعد ان کی سوچ میں مثبت تبدیلی آئی تھی اور انھیں پاکستان کے خلاف ان بیرونی سازشوں جن میں انھیں بھی استعمال کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی کا ادراک ہو گیا تھا۔

باخبر ذرائع کے مطابق محترمہ بے نظیر بھٹو نے تحریک طالبان کے سربراہ بیت اللہ محسود سے کم از کم دو مرتبہ رابطہ کیا جس میں بیت اللہ محسود نے اس بات کی تردید کی کہ وہ بے نظیر بھٹو کو قتل کرنا چاہتے ہیں جس سے بے نظیر اور ان کے مابین غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ انھوں نے پاکستان جوہری پلانٹ کے بانی ڈاکٹر عبدالقدیر سے بھی رابطہ کیا اور ان پر واضح کیا کہ ان کا یہ بیان کہ وہ امریکہ کو ڈاکٹر عبدالقدیر تک رسائی دیں گی ان پر ''دباؤ کا نتیجہ'' تھا۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر عبدالقدیر نے بے نظیر بھٹو سے کہا کہ وہ انھیں اپنی بیٹی سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے ہیں اور ان کے دل میں بے نظیر کے لیے کوئی رنجش نہیں اور انھیں اس مبینہ دباؤ کا بھی علم ہے جو ان پر ڈالا گیا۔ بیرونی طاقتوں نے محترمہ کے ان روابط کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ دشمنوں کو یہ بھی علم تھا کہ محترمہ کی شخصیت چاروں صوبوں کی عوام کو یکجا کر سکتی ہے اور اگر عوام متحد ہوئے تو اس صورت میں پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی بہانہ تراشہ نہیں جا سکے گا۔

بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ملکی حالات کے تیزی سے بگڑنے سے بیرونی دشمن قوتوں کو اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل کا موقع ملتا نظر آ رہا ہے۔ پاکستان اس وقت عالمی سازشوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور کچھ قوتیں ایسے حالات پیدا کرنا چاہتی ہیں کہ پاکستان کو ناکام ریاست قرار دے کر اسے اس کی جوہری صلاحیت سے محروم کر دیا جائے۔ حال ہی میں صدر بش کے سینئر مشیروں نے انھیں یہ تجویز دی کہ سی آئی اے اور امریکی ملٹری کا دائرہ کار پاکستان کے قبائلی علاقوں تک پھیلا دیا جائے۔ مندرجہ بالا تجویز ان امریکی انٹیلی جنس رپورٹوں کے بعد دی گئی جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ طالبان اور القائدہ پاکستانی حکومت کو غیر مستحکم کرنے کے لیے اپنی کارروائیوں میں شدت پیدا کر رہے ہیں۔ واضح ہو کہ 2005ء میں امریکی نیشنل انٹیلی جنس کونسل نے اپنی رپورٹ میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ ایک عشرے کے اندر اندر پاکستان میں انتہا پسندی، صوبائی نفرتیں اور لسانی عصبیت اپنی انتہا

کو چھولے گی جس کے نتیجے میں پاکستان ایک ناکام ریاست میں تبدیل ہو جائے گا۔

ایسا لگتا ہے کہ پاکستان کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے اور صورتحال بالکل ویسی ہی ہے جیسے عراق پر حملے سے قبل تھی۔ جس طرح عراق کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈہ کیا گیا تھا اسی طرح پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے انتہا پسندوں کے ہاتھوں میں جانے کا ہوا کھڑا کیا جا رہا ہے تاکہ ان اثاثوں پر قبضے کی راہ ہموار ہو سکے۔ ملک میں بگڑتی ہوئی امن و امان کی صورتحال، آئے دن بم دھماکے، محترمہ بے نظیر کی شہادت ایسے واقعات ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ صورت حال غیروں کے سازشی منصوبوں کو کامیاب بنانے والی اور ان کے مقاصد پورا کرنے والی ہے کیونکہ محترمہ کے قتل کے بعد حکومت کی انتظامی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے اور حالات ان کے قابو سے باہر ہیں۔

پاکستان کے جوہری ہتھیاروں کی حفاظت کا جدید ترین اور جامع نظام موجود ہے جو دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک کے نظام سے کم نہیں اس حقیقت کے باوجود الزامات اور منفی پروپیگنڈے کا سلسلہ جاری ہے۔ اس طرح کے پروپیگنڈے کا بنیادی مقصد پاکستان کو ایک غیر ذمہ دار ملک قرار دے کر دنیا کو یہ باور کروانا ہے کہ وہ اپنے ایٹمی ہتھیاروں کی حفاظت کی صلاحیت نہیں رکھتا اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو غیر ذمہ دار پاکستان نہیں بلکہ امریکہ ہے جس نے سب سے پہلے دوسری جنگ عظیم میں جاپان کے شہروں ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم برسا کر تباہی مچائی۔ اگر جاپان کے پاس ایٹم بم ہوتا تو امریکہ جاپان پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔ بھارت پاکستان پر تین مرتبہ حملہ کر چکا ہے لیکن پاکستان کے ایٹمی طاقت بن جانے کے بعد وہ اس پوزیشن میں نہیں رہا کہ پاکستان پر حملے کا سوچ بھی سکے اس لحاظ سے پاکستان کا ایٹم بم برائے امن ہے نہ کہ کسی جارحیت کے لیے۔

سوویت یونین میں غیر مستحکم حالات پیدا ہوئے لیکن ایٹمی اثاثوں پر قبضہ کرنے کی بات کسی نے نہیں کی۔ بھارت میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد وسیع خانہ جنگی ہوئی اس وقت بھی کسی نے ایٹمی اثاثوں کے خطرے میں ہونے کی بات نہیں کی۔ چونکہ پاکستان واحد مسلم ایٹمی طاقت ہے اس لیے پاکستان کے بارے میں اس طرح کا منفی پروپیگنڈے کا مقصد ایک حکمت عملی کے تحت پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کا محاصرہ کرنا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ پوری قوم تمام اختلافات بھلا کر متحد ہو کر ان سازشوں کا مقابلہ کرے جو پاکستان کی سلامتی اور اس کے ایٹمی اثاثوں کے خلاف کی جا رہی ہیں۔ اسی طرح تمام سیاسی جماعتوں اور لیڈرز پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کے متعلق مشترکہ موقف اختیار کریں اگر بیرونی طاقتیں پاکستان میں نیوکلیئر اثاثوں کے حوالے سے کسی بھی قسم کی مہم جوئی کرتی ہیں تو پوری قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر دنیا پر یہ ثابت کر دے کہ پاکستانی قوم ہر چیز سے زیادہ ملک کی سلامتی کو مقدم سمجھتی ہے۔ پاکستان اگر جوہری طاقت بن سکتا ہے تو اس کی حفاظت کرنے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

(روزنامہ جنگ، لاہور 16 جنوری 2008ء)

♥ ..... ♥ ..... ♥

اب بچاؤ کا کوئی راستہ موجود نہیں!

آفتاب اقبال

وطن عزیز پر جتنا برا وقت آن پڑا ہے پہلے کبھی نہ تھا۔ حتیٰ کہ سقوط ڈھاکہ، پلٹن میدان اور جنرل اروڑا والے منحوس دنوں میں بھی حالات اس قدر برے نہ تھے جتنے کہ آج اور آنے والے کل میں ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہماری معیشت، معاشرت، سیاست اور سالمیت جن کٹھن راستوں پر چل نکلی ہے، ان راستوں پر ہمیں ماسوائے ذلت، رسوائی، شکست اور تباہی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ابھی دھیان بی بی کی المناک شہادت پر ہی یوں اٹکا ہوا ہے کہ ادھر ادھر ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ رہی سہی کسر لاہور میں ہونے والے مبینہ خودکش حملے نے نکال دی ہے اور بدقسمتی سے ہم نے ہفت روزہ ''نیوز ویک'' کے تازہ شمارہ میں چھپنے والے وہ دو عدد مضامین بھی دھک دھک کرتے دل کے ساتھ پڑھ لئے ہیں جن کا فوکس پاکستان کی موجودہ صورتحال اور بیت اللہ محسود جیسے تازہ وبال پر مرکوز ہے۔

اس گھمبیر صورتحال کا مقابلہ کرنے کی ہم میں نہ تو سکت ہے اور نہ ہی ہمارے پاس وہ قیادت ہے جو یہ معجزاتی کام سرانجام دے سکے۔ چنانچہ جو شخص یا جماعت موجودہ حالات میں اس گئے گزرے اور پلیگ زدہ اقتدار کا حصہ بننے پر مصر ہے، یا در کھئے یا تو احمق ہے اور یا پھر چور۔ اسے یا تو حالات کی نزاکت کا ادراک ہی نہیں اور یا پھر وہ پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ اس (خدانخواستہ) ڈوبتی ناؤ کے باقی ماندہ تختے بھی بیچ کھانے کا پروگرام بنائے ہوئے ہے۔ ہمیں ہر اس شخص سے محتاط رہنا چاہیے جو اس المناک قومی صورتحال میں خدا سے رحم کی بھیک مانگنے کی بجائے اقتدار میں شراکت مانگتا پھرتا ہے۔ ہمیں واقعی ایسے ہر شخص سے محتاط رہنا چاہیے مگر ہمیں ان باتوں سے بھلا کیا غرض۔ ہم تو صرف ''ڈھگے'' ہیں۔ ہمیں تو صرف ''دوڑنگ'' کا چارہ چاہئے اور بس۔

ہماری مخبوط الحواسی کا عالم ملاحظہ کیجئے کہ ہر آنے والا نیا حکمران ہمارے منہ میں نیند کی ایک میٹھی گولی دے دیتا ہے اور ہم سب کچھ جانتے بوجھتے بھی خواب خرگوش میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ ''بھائی صاحب'' اس کشتی کو کسی نہ کسی طرح بھنور سے ضرور نکال لیں گے۔ وہ دو چار چپو چلاتا ہے اور ہمیں ''ٹریکل ڈاؤن'' نتائج کا انتظار کرنے کا مشورہ دے کر ہماری پیٹھ وغیرہ تھپتھپانے اور بار دیگر ہمیں سلانے لگتا ہے۔ چند برس خواب غفلت کے مزے لوٹنے کے بعد جب ہم حسب روایت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ایک اور سندر سپنا بیت چکا ہے۔ ظفر اقبال نے آج سے اکتیس برس ادھر ایسی ہی ایک بات کہی تھی جو آج کے دور پر بھی منطبق ہے اور آنے والے ادوار (اگر دو چار باقی بچے ہوں تو) میں بھی یقیناً نئی قبر کی مٹی کی طرح تر و تازہ رہے گی۔

اصل میں صرف سلانے کے لئے آیا تھا
جو ہمیں خواب دکھانے کے لئے آیا تھا
ماندہ تختے بھی ظفر بیچ کے بیٹھا ہے جو شخص
ٹوٹی کشتی کو بچانے کے لئے آیا تھا

ان دہلا دینے والے شعروں کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ یہ ہمارے ہر حکمران کی لوح مزار معلوم ہوتے ہیں۔ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونے پر دھیان فوری طور پر تو اپنے شوکت عزیز صاحب کی طرف جاتا ہے مگر کچھ عرصہ بعد آپ کا دھیان کسی اور طرف ضرور ہو جائے گا۔ اسی شاعر کی اسی کتاب کی ایک اور غزل کے چند شعر دیکھئے اور سر دھنئے کہ اس کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ جو بات وہ کہہ رہا ہے وہ اکتیس سال بعد بھی حالات کی انگشتری میں نگینے کی طرح جڑی دکھائی دے گی۔

یہ پانچ فیصد لگے ہوئے ہیں جو چیرنے اور پھاڑنے میں یہ درحقیقت پچانوے فیصدوں کے آٹے کی روٹیاں ہیں ہمیں تو ملتی نہیں ہے دو وقت کی روکھی سوکھی بھی قاعدے سے مگر جو سالن میں تر بتر ہیں، یہ ان کے کتے کی روٹیاں ہیں عجب نہیں ہے جو اٹھ کے گندم کے سارے گودام ہی جلا دیں کہ اپنی تقدیر میں تو پہلے ہی مانگے تانگے کی روٹیاں ہیں

سندھ جیسے دریاؤں، پنجاب اور مہران جیسے میدانوں اور مون سون جیسے موسموں کے ہوتے ہوئے بھی اگر یہ قوم بجلی، پانی اور آٹے کو ترس رہی تو پھر یقین کیجئے روز ازل سے آج تک اس سے بڑھ کر مخولیہ قوم کوئی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ حیرت ہے کہ کاتب تقدیر نے بدانتظامی اور بے توکلی کی ماری اس قوم کو ایتھوپیا جیسا بنجر بیابان علاقہ دینے کی بجائے ایک سرسبز اور جنت نظیر خطہ کیونکر عطا کر دیا۔ شاداب شہروں کو بنجر بیابانوں میں بدلنے کا ایک فطری طریقہ شاید یہ بھی ہے کہ اسے مخولیہ قوموں اور مسخرے حکمرانوں سے بھر دیا جاتا ہے۔ اگلے دس برس میں ارتقاء کا یہ عمل کم از کم اس علاقے میں تو پورا ہوتا نظر ہے۔ اپنا آپ پوری طرح سے کیچڑ اور غلاظت میں لت پت کرنے کے بعد اب اچانک ہمیں یہ خیال آنے لگا ہے کہ اگر امریکہ امداد نہیں دے سکتا تو اسے دوست بھی کوئی اور تلاش کرتے ہوں گے۔ ''بھیا''! اگر یہ بات کرنی تھی تو کم از کم اس وقت تھوڑی احتیاط ہی کر لیتے جب فرط جذبات سے مغلوب ہو کر امریکہ کی محبت میں آپ بچھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ آپ اگر اس وقت میانہ روی سے کام لیتے اور رویہ معتدل رکھتے تو امریکہ آپ کو یوں ''ایزی'' نہ لیتا جیسا کہ آج لے رہا ہے اور آئندہ مزید لیتا دکھائی دیتا ہے۔

پھر آپ کو دہشت گردی کی وارداتوں اور بلوچستان میں گڑبڑ کے پیچھے یکا یک بھارتی ہاتھ بھی نظر آنے لگا ہے تو ''بھیا''! ہم کیا پچھلے کئی ماہ سے جھک مار رہے تھے۔ ہم نہ کہتے تھے کہ بھارت آپ کی دوستی کو کمزوری سے تعبیر کر کے آپ کو مزید بے دست و پا کرتا چلا جائے گا۔ مگر آپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ آپ کہیں اونچا تو نہیں سنتے؟ دراصل اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں بلکہ کسی بھی ایک شخص کا قصور نہیں۔ یہ ایک اجتماعی جرم ہے جو ہم پچھلے کئی برسوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اب اس کی سزا بھی اجتماعی ہی ہوگی اور وہ جرم تھا قیادت کی سرکوبی کرنا۔ آپ نے ہر وہ ہتھکنڈا استعمال کیا کہ جس سے قیادت کا قحط پڑ سکے۔ کبھی آپ نے ایبڈو کا سہارا لیا تو کبھی پروڈا کا۔ کبھی آپ نے مجلس شوریٰ کا تجربہ کیا تو کبھی غیر

جماعتی انتخابات کا۔اب آپ کے پاس گملوں میں اگے چھوٹے چھوٹے پستہ قد ''قائدین کرام'' نکے نوکری کے حساب سے موجود ہیں۔آپ حکومتی پولٹری فارموں میں تیار ہونے والے ان برائلر سیاستدانوں سے توقع رکھتے ہیں کہ یہ آپ کے پھیلائے ہوئے خس و خاشاک کو سمیٹیں اور ملک کو شاہراہ ترقی پر گامزن کریں؟ کس قدر بھولے بادشاہ ہیں آپ بھی؟!

ہم ہمیشہ اس قماش کا کالم لکھنے کے بعد امید کی ایک جعلی سی کرن پیدا کرنے کے لئے آخر میں اتنا ضرور کہہ دیا کرتے ہیں کہ اب بھی وقت ہے سنبھل جائیں، اپنی اصلاح کر لیں ہو سکتا ہے بچت کی کوئی راہ نکل ہی آئے۔مگر اب ایسا نہیں ہے۔اب امید کی کوئی جعلی کرن بھی باقی نہیں بچی۔ اب آپ اڑ کر بھی دکھا دیں تو بھی حالات ٹھیک نہیں ہو سکتے۔اب قوم کو اپنی بے حسی کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہونا چاہیے۔

ہاں! ایک بار پھر یہ بات دہرانے کی ضرورت ہے کہ اس عہد زیاں میں بھی اگر کوئی اقتدار میں شراکت چاہتا ہے تو وہ احمق ہے اور یا پھر چور!!

(روزنامہ ''نوائے وقت'' 14 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

تاریخ کی آخری وارننگ

محمد عامر خاکوانی

کہا جاتا ہے کہ آتش فشاں پہاڑوں کے لاوا اگلنے سے پہلے وہاں کے ماحول میں کچھ تبدیلیاں آتی ہیں۔ قیامت خیز زلزلوں سے پہلے بھی فطرت کسی نہ کسی قسم کی وارننگ ضرور دیتی ہے۔ کہیں پہاڑی چشموں کا پانی معمول سے زیادہ گرم ہو جاتا ہے تو کسی جگہ زمین کی سطح تڑخنے سے گیسیں خارج ہونے لگتی ہیں۔ ایسی جگہوں سے پرندے بھی ہجرت کر جاتے ہیں کیونکہ وہ فطرت کے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔ ماہرین اسے فطرت کی آخری وارننگ کا نام دیتے ہیں۔ مورخین بتاتے ہیں کہ بالکل اسی طرز پر تاریخ بھی کسی بڑے قومی سانحے سے پہلے ایک آخری وارننگ ضرور دیتی ہے۔ دس ہزار سال کی معلوم تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ سلطنتوں کی تباہی اور قوموں کی بربادی سے پہلے کچھ ہلا دینے والے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ جن کا مقصد ان قوموں کو جھنجھوڑنا ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے معاملات پر نظر ثانی کر کے تباہی کے عمل کو روک سکیں۔ ایسا بھی ہوا کہ کوئی قوم یا ملک تباہی کے کناروں پر پہنچ گیا۔ یہ کہا جانے لگا کہ اب یہ مٹنے ہی والا ہے کہ اچانک اس کے تن نیم مردہ جان سی پڑ گئی اور وہ سنبھل کر دوبارہ قدموں پر کھڑے ہو گیا۔ دراصل وہاں کے عوام اور قیادت نے تاریخ کی وارننگ سے سبق سیکھ کر اپنی غلطیوں کی بروقت تلافی کر لی۔

تاہم تاریخ دانوں کی تحریروں میں تباہی کی داستانوں نے زیادہ جگہ پائی ہے۔ زوال آمادہ بیشتر قومیں اور ان کے حکمران یا تو آخری لمحے تک خواب خرگوش کے مزے لوٹتے رہے یا اپنے اقتدار کو طویل تر کرنے کے منصوبے تراشتے رہے۔ بدقسمتی سے پاکستان بھی ان ملکوں میں شامل ہو چکا جسے تاریخ کی آخری اور حتمی وارننگ مل چکی ہے۔ ہم اس لحاظ سے بدنصیب قوم ہیں کہ ایسی ایک وارننگ 71ء میں ملی، جو ہم نے نظر انداز کی اور بدلے میں اس کے نتائج بھی بھگتے۔ ایسی خوش نصیب قومیں بہت کم ہوتی ہیں جنہیں ایک حادثے کے بعد تقدیر سنبھلنے کا دوسرا موقع دے۔ ہمیں وہ موقع مل چکا ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کی المناک شہادت پاکستانی تاریخ کا شدید ترین دھچکا ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ کی آخری وارننگ بھی ہے۔ اس سانحے نے پاکستان کے سیاسی اور قومی لینڈ اسکیپ کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ اس المیے کی تین چار مختلف سطحیں ہیں جن کو ذہن میں رکھنا از حد ضروری ہے۔

ذاتی سطح پر بے نظیر بھٹو زیرک، دور اندیش اور سحر انگیز شخصیت کی مالک تھیں۔ انہیں ذوالفقار علی بھٹو جیسے سیاسی لیجنڈ سے تربیت کے ساتھ اعلیٰ ترین مغربی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ نوجوانی میں والد کی پھانسی کے بعد انہوں نے مارشل لاء کے خلاف جدوجہد کی اور قید و بند کی مشکلیں سہیں۔ وہ ایک سے زیادہ بار جلاوطن رہیں۔ پاکستانی سیاست میں شاید ہی کوئی سیاستدان ہوگا جسے اس قدر متنوع تجربات سے گزرنا

پڑا۔ خود ذوالفقار علی بھٹو بھی ایسے ڈرامائی واقعات سے نہیں گزرے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو مغربی ممالک میں ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔ ماضی اور حال کے کسی پاکستانی سیاستدان کا مغربی میڈیا اور انٹیلی جنشیا میں اس قدر اثر ونفوذ نہیں۔ وہ مغرب میں پاکستان کے سافٹ امیج اور سول سوسائٹی کی علامت تھیں۔ ہمارے ملک کو اپنا امیج بہتر کرنے کیلیے ایسی قدر آور شخصیت کی شدید ضرورت تھی۔ اس حوالے سے ان کا خلاء پُر ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔

بے نظیر بھٹو ایسی واحد قومی رہنما تھیں جنہیں دو سب سے بڑے صوبوں سندھ اور پنجاب کے عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی۔ سرحد اور بلوچستان میں بھی ان کا گہرا اثر تھا۔ وہ علیحدگی پسند اور متشدد گروہوں کے سامنے دیوار کی طرح کھڑی تھیں۔ سب سے اہم یہ کہ لاکھوں افراد ان سے استحصالی نظام کو بدلنے اور اپنی زندگیوں میں آسانی لانے کی امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے۔ بے نظیر ان محروم افراد کی واحد امید تھیں۔ 27 دسمبر کی شام یہ آخری امید بھی ٹوٹ گئی۔ ان سے جذباتی طور پر وابستہ یہ کارکن اور ووٹر اور کونسی راہ اختیار کرتے ہیں، اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ سماجی ماہرین یہ بتاتے ہیں کہ عوام کے سپنے ٹوٹنے اور امیدیں ختم ہونے کا لمحہ سب سے خطرناک ہوتا ہے۔

بے نظیر بھٹو اپنے مرحوم والد کی حقیقی جانشین بھی ثابت ہوئیں۔ ان کے بعد پیپلز پارٹی کی آنے والی قیادت کے لیے اس سلسلے کو جاری رکھنا ایک بہت بڑا چیلنج ثابت ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ کسی بھٹو کو پیپلز پارٹی کی قیادت سنبھالنی چاہیے۔ یہ درست کہ پیپلز پارٹی کے کارکن اور اس کے ووٹرز بھٹو خاندان سے والہانہ عقیدت اور وابستگی رکھتے ہیں۔ وہ صنم بھٹو یا نوعمر بلاول کو بھی قبول کر لیں گے، مگر پارٹی چلانے کے لئے بہت کچھ درکار ہوتا ہے۔ محترمہ بے نظیر نے صرف بھٹو مرحوم سے وابستگی کا سہارا ضرور لیا، مگر وہ بے پناہ صلاحیتوں کی مالک بھی تھیں۔

انہوں نے بڑی دانش مندی سے کارکنوں کو مجتمع کیے رکھا۔ یہ بے نظیر کی مضبوط گرفت تھی کہ پارٹی کے کئی سینئر رہنما علیحدہ ہو کر زیرو ہو گئے۔ وہ بلا کی مقررہ اور بدترین حالات میں بھی ہجوم اکٹھا کرنے کی قوت رکھتی تھیں۔ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ بھی وہ بڑی مہارت سے کھیلتی رہیں۔ یہ ان کی سیاسی کرشمہ سازی تھی کہ بھٹو خاندان کی شدید مخالف مقتدر قوتیں انہیں دو مرتبہ وزیراعظم بنانے کے لیے رضامند ہو گئی۔ مرتضیٰ بھٹو اپنی شخصی وجاہت اور دلیری کے باوجود بے نظیر جیسے اوصاف نہیں رکھتے تھے۔ اسی لیے محض بھٹو کا بیٹا ہونا ان کے کسی کام نہ آیا۔ صنم بھٹو، بلاول یا آصف زرداری کے لیے شروع میں تو ہمدردی کا عنصر مددگار ثابت ہوگا، مگر بعد میں انہیں اپنی صلاحیتوں ہی کا ثمر ملے گا۔

سانحہ ستائیس دسمبر کے سب سے اہم اثرات قومی سطح پر پڑے ہیں۔ ایک بات تو طے ہو گئی کہ اب پاکستان میں (سول ملٹری) اسٹیبلشمنٹ کو اپنا رویہ بدلنا پڑے گا۔ اگر ملک بچانا مقصود ہے تو انہیں قومی تاریخ میں پہلی بار اور ہمیشہ کے لیے پسپا ہونا پڑے گا..... ایسی پسپائی جو نظر بھی آئے۔ پچھلے سات آٹھ برسوں میں ہمارے قومی ادارے مکمل طور پر تباہ ہوئے ہیں۔ اس وقت کسی بھی ادارے کی کریڈیبلٹی موجود نہیں۔ 9 مارچ کے بعد عدلیہ کی ساکھ بحال ہوئی، 3 نومبر کو وہ بھی "قتل" کر دی گئی۔ پاکستان مہذب دنیا کا شاید واحد ملک ہوگا جس کے حساس قومی ادارے اور ایجنسیاں قوم کی نظر میں اپنا اعتبار کھو بیٹھی ہیں۔ ان کا سیاسی استعمال اس بیدردی سے کیا گیا کہ اب کسی رپورٹ یا پیش گوئی پر قوم اعتماد نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ وزارت داخلہ کے ترجمان کی تمام تر پریس بریفنگز ایک لمحہ غور کیے بغیر ہی مسترد کر دی گئیں۔ وہ لاکھ چیخ چیخ کر جو بھی کہیں، کوئی سننے کو تیار نہیں۔ سندھ اس وقت ایک کھولتے ہوئے سیاسی لاوے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اسے روکنے یا سنبھالنے والی کوئی شخصیت موجود نہیں۔

ملک کی چھوٹی بڑی تمام سیاسی جماعتیں تین نکاتی ایجنڈے "برطرف ججوں کی واپسی، آزاد الیکشن کمیشن اور مکمل غیر جانبدار نگران حکومت" پر متفق ہیں۔ 8 جنوری کے انتخابات ملتوی کرنے کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ ان میں اسے پی ڈی ایم کی سیاسی جماعتوں کو بھی شامل کیا جائے۔ بلوچ قوم پرستوں کو الیکشن سے باہر رکھنا بھی خطرناک ہوگا۔ پاکستان کو شفاف اور سب کے لیے قابل قبول انتخابات ہی بچا سکتے ہیں۔ ملکی قیادت، سیاسی رہنما اور عوام سب کو ان لمحات کی نزاکت کا ادارک کرنا چاہیے۔ تباہی جب آئے تو مخصوص چہروں یا افراد پر ہی وار نہیں ہوتی۔ قومی غلطیوں کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتا ہے۔

(روزنامہ "ایکسپریس" لاہور 31 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

بے نظیر کی شہادت اور ملکی سلامتی

تمام پاکستان کے دانشوروں اور قلمکاروں نے بے نظیر کی المناک موت کے تناظر میں اپنی چشم تصور سے ملکی سلامتی کو خطرے میں دیکھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان تمام دانشوروں کی یہ اجتماعی رائے ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ جب ہر طرف سے وفاق کے خطرے کی آواز آ رہی ہو۔ تو تمام قوم کو اکٹھا مل بیٹھ کر اس خطرناک بحران سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنا چاہیے۔ ملک کو خطرناک بحران سے نکالنے کے لیے حسب ذیل نکات مدد ہو سکتے ہیں۔

1- پرویز مشرف کی عہدہ صدارت سے علیحدگی

2- صاف شفاف الیکشن کے لیے متفقہ رائے سے قومی حکومت کی تشکیل

3- عدلیہ کی بحالی

4- بے نظیر کی المناک قتل کی آزاد عدلیہ یا اقوام متحدہ کے کمیشن سے غیر جانبدارانہ تفتیش

5- فاٹا، سوات اور بلوچستان میں سیز فائر اور مذاکرات سے الجھے ہوئے مسائل کا حل تلاش کرنا

6- صوبائی خود مختاری کا از سر نو تعین

7- ملکی معاملات میں بیرونی مداخلت کا انسداد

8- دفعہ 58/2/B کا خاتمہ اور 1973ء کے آئین کی اصلی صورت میں بحالی

9- عسکری آمریت کے خاتمے کے لیے آئین میں ترمیم

(میرے نزدیک عسکری آمریت کو ہمیشہ دفن کرنے کے لیے صرف ایک ترمیم کر لی جائے وہ یہ کہ اگر کسی جرنیل نے مارشل لاء لگایا تو ہر صوبے کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ وفاق سے الگ ہو جائے۔ یہ ترمیم آئین میں دس سال کے لیے ہونی چاہیے جب ملک میں جمہوریت جڑ پکڑے تو اس ترمیم کو ختم کر دیا جائے)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ملک پاکستان جس تنزل کی حد تک پہنچ چکا ہے اس کی ذمہ دار عسکری آمریت ہے۔ اب اس کو دفن کرنے کا کوئی راستہ سوچنا ہوگا۔

10- صوبہ پنجاب کی تقسیم، کم از کم جنوبی پنجاب ایک الگ صوبہ قرار دیا جائے۔

11- جاگیرداری اور سرمایہ داری کے بد اثرات کا خاتمہ

12- ذوالفقار علی بھٹو شہید، جناب اکبر بگٹی کو حکومتی سطح پر اعزاز دینا، ورنہ دونوں قتل ملکی سلامتی پر کسی وقت بھی کاری ضرب لگا سکتے ہیں۔

♥.....♥.....♥

باب پنجم

کچھ بلاول بھٹو زرداری اور انتخاب کے متعلق

بلاول بھٹو زرداری: مشاغل، تعلیم، اہداف

19 برس کی عمر میں نانا اور والدہ کا چھوڑا گیا سیاسی سرمایہ کیسے سنبھال پائیں گے؟

تنویر قیصر شاہد

27 دسمبر 2007ء کی شام ہماری تاریخ میں ہمیشہ اداس اور غمگین الفاظ سے یاد کی جائے گی۔ اس روز پاکستان کی عالمی شہرت یافتہ سیاستدان، جو دو بار اس ملک کی وزیراعظم بھی بنیں، محترمہ بے نظیر بھٹو قاتلوں اور دہشت گردوں کے ہاتھوں شہادت کے مرتبے پر فائز ہو گئیں۔ وہ 18 اکتوبر 2007ء کو دبئی سے پاکستان کے لئے روانہ ہوئیں تو ان کے دوستوں، رشتہ داروں اور بہی خواہوں نے انہیں پاکستان جانے سے منع کیا کہ ان کی جان کو خطرہ ہے لیکن بے نظیر بھٹو کردار کی حامل بے نظیر بھٹو ان مشوروں کو نہ مانتے ہوئے اپنے وطن آ گئیں۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے آگ کے دریا میں اتری تھیں۔ ان سے 18 اور 19 اکتوبر کی درمیان رات کراچی میں جو سلوک ہوا، ان کے 150 سے زائد جانثاروں کو جس طرح بے دردی سے مار ڈالا گیا، یہ داستان سب پر عیاں ہے۔ کراچی کے بعد ان پر پشاور کے جلسے میں بھی خودکش حملہ ہوا لیکن ان کی زندگی محفوظ رہی۔ لیکن 27 دسمبر 2007ء کی شام ان کی زندگی کی آخری شام ثابت ہوئی۔ ان کی شہادت سے پورے ملک میں سوگ اور غم نے تاریکی کی ایک گہری چادر تان لی۔

آج محترمہ بے نظیر بھٹو ہم میں نہیں ہیں لیکن وہ پیپلز پارٹی، آصف علی زرداری، بلاول بھٹو زرداری، بختاور اور آصفہ کی شکل میں ہمارے درمیان میں موجود ہیں۔ محترمہ کے تینوں بچے دوبارہ دبئی جا چکے ہیں۔ روانگی سے قبل انہوں نے غمزدہ اور دکھے ہوئے دلوں کے ساتھ اپنی والدہ کی قبر پر حاضری دی اور اشک بہاتے ہوئے ملک سے روانہ ہو گئے۔ اس روانگی سے قبل پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت کے متفقہ فیصلے کے تحت شہید بے نظیر بھٹو کے صاحبزادے بلاول بھٹو زرداری کو پارٹی کا چیئرمین نامزد کر لیا گیا۔ یوں بلاول صاحب کا عملی سیاست میں پہلا قدم رکھا جا چکا ہے، اگرچہ وہ ابھی آکسفورڈ یونیورسٹی میں انڈر گریجوایٹ ہیں اور ابھی انہیں تعلیم کے دیگر مراحل بھی طے کرنے ہیں۔ ان کی والدہ مرحومہ کی بھی شدید خواہش تھی کہ بلاول، بختاور اور آصفہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں جس طرح خود انہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی اور ہارورڈ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ یہ بات تو اب طے ہو چکی ہے کہ بلاول بھٹو زرداری ہی پیپلز پارٹی کے سربراہ ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ مستقبل میں پاکستان کے وزیراعظم بھی بن جائیں، اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ بلاول بھٹو زرداری کے بارے میں کھوج لگائی جائے، ان کے نظریات و افکار کو کھنگالا جائے اور ان کے اہداف کا تعین کیا

جائے۔ جو شخص مستقبل قریب میں پاکستان پر گہرے اثرات مرتب کرنے والا ہے، اس کے بارے میں باتیں جاننا از بس ضروری ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں اگر ہم محترمہ بے نظیر بھٹو مرحومہ کی رازداں سہیلی اور بہی خواہ محترمہ مہناز ملک کی یادیں سنیں تو بلاول کی ایک منفرد شکل ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ مہناز ملک نے بلاول بھٹو زرداری اور محترمہ بے نظیر بھٹو سے وابستہ یادوں کی پٹاری کھولتے ہوئے کہا "بلاول بھٹو زرداری مجھ سے تقریباً دس سال چھوٹا ہے۔ بے نظیر بھٹو کے یہ تینوں بچے مجھ سے بہت مانوس ہیں۔ مجھے وہ دن نہیں بھولتے جب میں بے نظیر بھٹو صاحبہ اور بلاول صاحب کے ساتھ لندن میں Vampire Slayer کی کارٹون والی کتابیں خریدا کرتی تھی۔ بے نظیر صاحب کے اپنے بچوں سے دوستانہ تعلقات تھے لیکن وہ بلاول بھٹو زرداری کے ساتھ خصوصی محبت و شفقت سے پیش آتی تھیں جیسے بلاول سے انہوں نے بلند توقعات وابستہ کر رکھی ہوں۔ میں محترمہ کو ہمیشہ "بی بی" کہہ کر پکارا کرتی تھی لیکن لندن کے پارکوں میں جب بلاول صاحب میرے ساتھ ہوتے تو میں دیکھتی کہ بے نظیر صاحبہ اپنے صاحبزادے کو گہری اور کڑی نظر سے دیکھتی ہیں۔ بی بی مجھ سے اکثر اوقات بلاول، آصفہ اور بختاور کے بارے میں گفتگو کے دوران کہا کرتی تھیں کہ لندن میں میری غیر موجودگی کے دوران مجھے تم سے بہت امیدیں وابستہ ہیں کہ تم بلاول کی رہنمائی کرتی رہو گی۔ بے نظیر بھٹو کو بخوبی معلوم تھا کہ بلاول جو باتیں مجھ سے کر لیتا ہے، اپنی ماں سے اتنی آزادی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ بلاول فطری طور پر ایک نہایت شرمیلا لڑکا ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنی بڑی سیاسی جماعت کا بوجھ اس کے کندھوں پر آ پڑا ہے تو اسے وہ کیسے نبھا سکے گا!"

محترمہ مہناز ملک انٹرویو میں کہتی ہیں: "میرا خیال ہے بلاول ابھی اتنا کمسن ہے کہ سیاست میں آنا اس کے لئے نامناسب ہوگا۔" حیرانی کی بات ہے۔ یہی بات بلاول بھٹو زرداری نے سائٹ "فیس بک" کے تازہ "شمارے" میں گزشتہ ہفتے 2 جنوری 2008ء کو کہی۔ انہوں نے لکھا: "میں ابھی خاصا ناتجربہ کار ہوں اور میں جانتا ہوں کہ میری زندگی بھی خطرے میں ہے۔" بلاول نے مزید لکھا: "میں پیدائشی لیڈر نہیں ہو۔ میں کوئی مفکر ہوں نہ سیاستدان۔ ہاں سیاستدان والدہ اور سیاستدان والد کا بیٹا ضرور ہوں۔" بلاول نے پیپلز پارٹی کا چیئرمین نامزد ہونے اور پاکستان سے دبئی پہنچنے پر پہلی بار یہ باتیں سائٹ میں لکھی ہیں۔

انہوں نے مزید لکھا: "میں تو ابھی صرف طالب علم ہوں اور جیسا کہ دنیا بھر میں طالب علم ہوتے ہیں، ویسا ہی میں بھی ہوں۔ غلطیاں کرنے والا، غلطیوں سے سیکھنے والا، جنک فوڈ پسند کرتا ہوں اور فنی پروگرام دیکھتا ہوں لیکن ان سب سے بڑھ کر یہ کہ میں کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ مستقبل قریب میں وہ زمانہ جلد آنے والا ہے جب میں اپنے ملک اور قوم کی رہبری کروں گا لیکن فی الحال میں سوالات پوچھ رہا ہوں، میں جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" بلاول بھٹو زرداری جونہی اپنی دونوں بہنوں کے ساتھ پاکستان سے دبئی پہنچے، دبئی میں مقیم ہزاروں پاکستانیوں نے ان سے محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے حوالے سے ان سے تعزیت کی۔ تعزیت کرنے والوں میں دبئی کے حکمران شیخ محمد راشد المکتوم بھی شامل تھے۔ اخبارات میں ایک فوٹو شائع ہوئی ہے جس میں ایک سنہری صوفے پر شیخ محمد تشریف فرما ہیں اور ان کے ساتھ اسی صوفے پر بلاول بھٹو زرداری بیٹھے ہیں اور شیخ محمد راشد المکتوم کے بائیں ہاتھ آصفہ اور بختاور بیٹھی ہیں۔ کسی بھی سربراہ مملکت کی بے نظیر بھٹو کے بچوں سے براہ راست تعزیت کرنے کی یہ پہلی مثال تھی۔

ادھر مقبوضہ کشمیر کے معروف سیاستدان میر واعظ عمر فاروق نے کہا ہے "بلاول بھٹو زرداری اور مجھ میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ یہ کہ میں بھی 16 سال کا تھا جب دہشت گردوں نے میرے والد کو شہید کر دیا تھا اور ایک ہی دن میں میری زندگی تبدیل ہو گئی تھی اور مجھے بادل نخواستہ اور والد کے پیروکاروں کے اصرار پر سیاست کی پرخار وادی میں اترنا پڑا تھا۔ اب بلاول بھٹو زرداری بھی ابھی محض 19 سال کے نوجوان ہیں جب ان کی معروف عالم سیاستدان والدہ کو دہشت گردوں نے شہید کر دیا ہے اور انہیں ان کی والدہ کے پیرکاروں کے اصرار پر پارٹی کا چیئرمین بننا پڑا ہے۔ راتوں رات ان کی زندگی اور سوچ تبدیلی کے دھارے پر آ گئی ہے۔"

بلاول بھٹو زرداری کو پیپلز پارٹی کا چیئرمین نامزد کرنے کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ وہ آکسفورڈ کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر سیاست کرنا شروع کر دیں۔ اس کام کے لئے ابھی ان کے والد گرامی بہت ہیں اور خاصے حرکت میں ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی بھی یہ شدید تمنا تھی کہ ان کا اکلوتا بیٹا اعلیٰ تعلیم کے زیور سے خود کو آراستہ پیراستہ کرے۔ مہناز ملک کا کہنا ہے "2007ء کے آغاز میں لندن میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے گھر میں میری ملاقات ہوئی تو بلاول بھٹو زرداری بھی وہیں موجود تھا۔ یکدم مجھے لگا کہ بلاول خاصا دراز اور کشیدہ قامت ہو گیا ہے۔ میں نے ماشاءاللہ کہا تو بے نظیر بھٹو زور سے مسکرائیں اور پھر انہوں نے بڑے فخر سے مجھے بتایا کہ بلاول آکسفورڈ ہی سے تعلیم کے سارے مدارج طے کرے گا۔ بے نظیر بھٹو شہید نے مجھے فخر سے یہ بھی کہا تھا کہ بلاول اپنے نانا اور والدہ کے نقش قدم پر چلتا ہوا آکسفورڈ کا فارغ التحصیل ہوگا۔ محترمہ نے یہ بھی کہا تھا کہ بلاول سیاست میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اس کے نصابی مضامین میں سے ایک مضمون سیاسیات کا بھی ہے۔" مہناز ملک مزید یہ بتاتی ہیں "بلاول بھٹو زرداری کے کردار کا یہ وصف نمایاں ہے کہ وہ اپنی دونوں بہنوں کا ہر وقت خیال رکھتا ہے۔ بلاول کارٹون کتابیں پڑھنے کا شوقین ہے اور فلمیں دیکھنے کا بھی۔ ہم نے کئی بار لندن کے سینماؤں میں کئی فلمیں دیکھیں۔ محترمہ بے نظیر مطالعہ کی از حد شوقین تھیں۔ وہ جب لندن آتیں تو کئی بار نوکری بھر کر نئی کتابیں خرید کر لاتیں۔ بلاول کے لئے کتابیں الگ ہوتیں۔ لیکن کتابیں چھوڑ کر بلاول جب اچانک فلم دیکھنے لگتا تو محترمہ اس کا برا نہ مانتیں کہ جانتی تھیں کہ وہ نوجوان ہے اور اس کا مزاج ان سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔" مہناز کہتی ہیں "مجھے لندن کا ایک واقعہ، ایک منظر یاد آ رہا ہے جو مجھے یقین دلاتا ہے کہ محترمہ اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی تھیں تو یہ بھول ہی جاتی تھیں کہ وہ پاکستان کی دو بار وزیراعظم رہ چکی ہیں اور برطانیہ سمیت دنیا کے ہر کونے میں لوگ ان کے چہرہ شناس ہیں۔ ایک روز ہم لندن میں بعد از دوپہر رسل سکوائر میں واقع ایک بک سٹور سے کتابیں خرید رہے تھے۔ آصفہ اور بختاور بھی ساتھ تھیں اور وہ بلاول کے ساتھ مل کر The Vampire Slayer, Buffy اور Angel کی کتابیں خریدتے ہوئے آہستہ آہستہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ اس میں خاصی دیر ہو گئی تھی لیکن محترمہ بے نظیر مسکراتے ہوئے نہایت صبر اور تحمل سے سٹور کے ایک کونے میں بیٹھ کر بچوں کا انتظار کر رہی تھیں۔"

یہ خاتون، مہناز ملک، شہید بے نظیر بھٹو کی بلاول سے گہری محبت کی عینی شاہد ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آصف زرداری کے جیل میں قید ہونے کی وجہ سے محترمہ کو تن تنہا تینوں بچوں کی پرورش کرنی پڑی، یہ ایک مشکل کام تھا لیکن وہ اس میں سرخرو ہوئیں۔ اسی وجہ سے تینوں بچے باپ کے برعکس والدہ کے زیادہ قریب تھے۔ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود محترمہ بچوں کے لئے وقت ضرور نکالتیں۔ مہناز ملک کہتی ہیں "محترمہ بے نظیر بھٹو

مرحومہ نظم وضبط کی بہت پابند تھیں اور یہی بات وہ اپنے بچوں میں دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ بچوں پر شاہین کی سی نظر رکھتیں۔ خصوصاً بچوں کی تمیز اور ادب و آداب (Manners) پر گہری نظر رکھتی تھیں کہ بچوں سے کوئی ایسی بات یا حرکت سرزد نہ ہو جائے جس سے کسی کو لب کشائی کا موقع ملے۔ محترمہ نے سیاست کے انداز واطوار اور زندگی گزارنے کے آداب اپنے والد سے سیکھے۔ اب ان کی یہ تمنا تھی کہ ان کے بچے یہ آداب ان سے سیکھیں۔ وہ پرورش ہی اس انداز میں کر رہی تھیں کہ تینوں بچے از خود سیکھتے چلے جا رہے تھے۔ بی بی خاص طور پر بلاول کی تربیت کر رہی تھیں لیکن 27 دسمبر کو ان کی شہادت نے بلاول سے ایک عظیم درسگاہ بھی چھین لی۔ حیرت کی بات ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی والد کی شہادت کے بعد کم عمری میں اچانک اور ناگہانی طور پر پارٹی کا پرچم تھام کر سیاست کی وادی میں اترنا پڑا تھا اور اب بلاول بھٹو زرداری کو بھی اپنی عظیم اور بے مثال والدہ کی شہادت کے بعد ناگہانی طور پر نہایت کمسنی کے عالم میں پارٹی کا پرچم تھام کر سامنے آنا پڑا ہے۔ لیکن دونوں ماں بیٹے میں ایک فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ بیٹے کو ماں کے مقابلے میں زیادہ کم عمری میں پارٹی کی چیئرمینی سنبھالنا پڑی ہے۔ بلاول آکسفورڈ یونیورسٹی کے کرائسٹ کالج کا نوجوان طالب علم ہے۔ اسے بہت بڑے صدمے کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ وہ اس صدمے کو اپنی طاقت وقوت بنا کر پاکستان کا بہترین لیڈر ثابت ہوگا، اگرچہ پاکستان کی نفرت انگیز اور خطرناک سیاسی دنیا میں سیاست کرنا آسان کام نہیں ہے۔"

بلاول بھٹو زرداری، جن کی عمر 19 سال ہے اور جو ابھی برطانیہ کی نامور درسگاہ اوکسفرڈ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں، کے پیپلز پارٹی کے چیئرمین بنائے جانے کے بعد وہ دنیا بھر میں مشہور معروف ہو گئے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے اکلوتے صاحبزادے ہونے کی وجہ سے وہ مشہور تو پہلے بھی تھے لیکن اس شہرت میں اب مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اس شہرت نے بلاول بھٹو زرداری کو کسی قدر غیر محفوظ بھی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کے مشہور پولیس ادارے، سکاٹ لینڈ یارڈ، کی طرف سے اعلان سامنے آیا ہے کہ اوکسفرڈ میں بلاول کی 24 گھنٹے حفاظت کی جائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ اس حوالے سے جناب بلاول بھٹو زرداری برطانیہ کی اس عالمی شہرت یافتہ درسگاہ کے اکلوتے طالب علم ہوں گے جو سکاٹ لینڈ یارڈ کی نگرانی اور "نرغے" میں تعلیم حاصل کر رہے ہوں گے۔ ان سے قبل جب ان کی والدہ مرحومہ اوکسفرڈ اور امریکہ میں ہارورڈ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھیں تو بے نظیر کے والد گرامی وزیر اعظم تھے لیکن اس کے باوجود بے نظیر بھٹو کو اس طرح کا سیکیورٹی کور حاصل نہیں تھا۔

لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ بے نظیر صاحبہ کے قتل کے بعد بلاول کا تحفظ یقینی بنانے کے لئے اس طرح کے اقدامات کا کیا جانا از بس ضروری ہے۔ جن طاقتوں نے بے نظیر بھٹو کا خاتمہ کیا ہے، وہ جناب بلاول کے بھی درپے ہو سکتے ہیں کہ ان کے بھی وہی نظریات وافکار ہیں جو ان کی عظیم اور عالمی شہرت یافتہ مدبر والدہ کے تھے۔ بلاول بھٹو بھی اپنی مرحومہ والدہ کی مانند شدت پسندی، مذہبی جنونیت اور ملائیت کے خلاف ہیں اور وہ بھی ان قوتوں اور تنظیموں کے مخالف ہیں جو ڈنڈے اور بندوق کے زور پر معاشرے پر اپنے نظریات مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً بلاول بھٹو زرداری نے اپنی کمپیوٹر سائیٹ Face Book میں اپنے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اسلامی شدت پسندی کے مخالف ہیں۔ اس سائیٹ پر اپنے بارے میں قارئین کو معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے "نظریاتی اعتبار سے میں لبرل ہوں اور جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں اسلامی شدت پسندی کا سخت مخالف ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بارے میں میں قطعی سنجیدہ ہوں۔ یہ اسلامی شدت پسند ہیں جو لوگوں کو زبردستی نماز پڑھانا چاہتے ہیں، جو

اس بات پر مصر ہیں کہ مردوں کو ایک خاص حد تک لمبی داڑھی ضرور بڑھانی چاہیے۔ میں بھی اللہ اکبر کے نعرے لگاتا ہوں لیکن اس وقت جب فٹ بال کے میدان میں میری پسندیدہ ٹیم کے کھلاڑی جیت رہے ہوں۔'' اپنے نجی مشاغل کے بارے میں بلاول بھٹو زرداری ''فیس بک'' میں کہتے ہیں ''مجھے کرکٹ اور سکواش بہت اچھے لگتے ہیں۔ نشانہ بازی اور تیراکی بھی مجھے پسند ہیں۔ ٹی وی کے شوز میں مجھے The Simpsons پسند ہے۔ فلم سازوں میں مجھے مائیکل مور اور کوئنٹن ٹارینٹو پسند ہیں۔''

بلاول بھٹو زرداری کے پی پی پی کے چیئرمین نامزد ہوتے ہی دنیا بھر میں سروے کرنیوالے ادارے ان کے بارے میں رپٹنگ کروا رہے ہیں۔ خبر رساں ایجنسی ''آن لائن'' کا کہنا ہے کہ بلاول صاحب کی سپورٹ اور مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مذکورہ بالا سائیٹ ''فیس بک'' میں بلاول بھٹو زرداری کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے یوں لکھا:

Oh my God he is cute; let's not assassinate Bilawal Bhutto because he is hot, ok?

جناب بلاول بھٹو زرداری ابھی جوانی کی حدوں میں داخل ہو رہے ہیں، وہ دلکش خدوخال کے حامل نوجوان ہیں، ایسے میں ''فیس بک'' میں آنے والے مذکورہ بالا پیغامات کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سیاست اور اقتدار کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔ اقتدار کی خاطر بیٹوں نے باپ کا اور باپ نے بیٹوں کا، بھائیوں نے بھائیوں کے سر قلم کیے ہیں۔ یہ انسانی تاریخ کا محکم اور مصدقہ باب ہے۔ یہ اقتدار اور سیاست ہی کا شاخسانہ ہے کہ 19 سالہ بلاول بھٹو زرداری کو پارٹی کے ''دباؤ اور خواہش'' پر اپنا نام ''بلاول بھٹو زرداری'' رکھنا پڑا ہے۔ آصف علی زرداری کے خاندان کا حوالہ دیکھا جائے تو بلاول کو ''بلاول زرداری'' ہی کے نام سے بلایا جانا چاہئے تھا لیکن اب وہ ہمارے سامنے ''بلاول بھٹو زرداری'' کے نام سے آ چکے ہیں اور پارٹی پالیسی بھی یہی ہے کہ ان کے نو عمر چیئرمین کو بلاول بھٹو زرداری کے نام سے بلایا، لکھا اور پکارا جائے۔ چیئرمین نامزد ہونے کے بعد بلاول بھٹو زرداری نے ملکی اور غیر ملکی میڈیا کے سامنے جو الفاظ کہے، وہ فراموش نہیں کیے جائیں گے کہ اب یہ ہماری تاریخ کا حصہ ہیں۔ انہوں نے کہا تھا ''پاکستان پیپلز پارٹی کی تاریخ طویل اور عزم و جدوجہد سے عبارت ہے۔ یہ سفر نئے ارادوں اور نئی توانائی کے ساتھ جاری رہے گا۔ جمہوریت کے استحکام کے لئے یہ جدوجہد جاری رہے گی۔ میری شہید والدہ ہمیشہ کہا کرتی تھیں کہ جمہوریت اور ووٹ کی طاقت ہی سب سے بڑا انتقام ہے۔''

اپنی عظیم ماں کی طرف سے نام پانے والے بلاول بھٹو زرداری کے بارے میں ہمیشہ سے یہ کہا جاتا تھا کہ وہی بے نظیر کے جانشین ہوں گے لیکن کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ بھٹو کا ورثہ انہیں اتنی کم عمری میں سنبھالنا پڑے گا۔ تاریخ، سیاسیات اور عمرانیات کے طالبعلم بلاول صاحب مستقبل میں پاکستان کے وزیراعظم بھی بن سکتے ہیں۔ جناب بلاول بھٹو زرداری ستمبر 1988ء میں پیدا ہوئے۔ چند ماہ بعد ہی ان کی والدہ وزیراعظم پاکستان بن گئی تھیں۔ ان کے دادا حاکم علی زرداری نے ان کا نام بلاول رکھا جس کا مطلب ہے ''ایسا نوجوان جو منفرد بھی ہو اور بے مثال بھی'' بلاول نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ملک سے باہر گزارا ہے۔ 1999ء میں جب محترمہ بے نظیر بھٹو نے وزیراعظم نواز شریف کی حکومت کی طرف سے بنائے گئے مقدمات کے دباؤ میں خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر لی تو بلاول کو اپنی زندگی کے زیادہ تر لمحات دبئی اور لندن کے درمیان گزارنے پڑے۔ دسمبر

2004ء میں بلاول بھٹو زرداری سے بی بی سی نے لندن میں انٹرویو کیا تھا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ پاکستان سیاست میں حصہ لیں گے تو انہوں نے کہا تھا ''اس وقت میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی تو میں طالب علم ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں اپنے ملک کے عوام کی مدد کرنا چاہتا ہوں لیکن تعلیم کی تکمیل کے بعد۔''

جنوبی ایشیا کے ممالک جہاں اداروں کے برعکس شخصیات کے گرد سیاست و اقتدار گھومتے ہیں اور جہاں مقتدر سیاسی خاندانوں کا سیاسی ورثہ ان کی آل اولاد Cult like devotion کی طرح منتقل کیا جاتا ہے اور جہاں جاگیرداروں کی گرفت میں غریب اور عسرت زدہ عوام سسکتے اور بلکتے زندگی گزارتے ہیں، وہاں بلاول بھٹو زرداری ہی کو پیپلز پارٹی کا چیئرمین بنایا جانا از بس ضروری تھا۔ پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ سیاسیات کے سابق سربراہ اور معروف تجزیہ نگار پروفیسر حسن عسکری رضوی سے جب بلاول بھٹو زرداری کے چیئرمین بننے کے حوالے سے سوال پوچھا گیا تو انہوں نے کہا ''پیپلز پارٹی نے بلاول کو پارٹی کا چیئرمین بنا کر سب سے پہلے تو خاندانی وراثت کو محفوظ بنایا ہے۔ پارٹی کو متحد رکھنے کے لئے پیپلز پارٹی کے قائدین نے بڑی ہوشیاری سے بے نظیر کے صاحبزادے بلاول کو نامزد کر دیا تاکہ بیٹے کی شکل میں والدہ کا چہرہ یاد رہے۔ بلاول کا چیئرمین بننا دراصل سمبل ازم کا شاخسانہ ہے۔ بے نظیر بھٹو اور بھٹو صاحب سے وابستگی کا مظہر..... لیکن اصل مسائل اس وقت کھڑے ہوں گے جب 2010ء کے بعد بلاول بھٹو زرداری آکسفورڈ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان آئیں گے اور پارٹی کی عنان حکومت براہ راست اپنے ہاتھ میں لیں گے۔'' بلاول زرداری کا بلاول بھٹو زرداری بننے سے پارٹی کو کوئی فائدہ بھی ہوگا، اس سوال کا جواب دیتے ہوئے دانشور، سیاستدان اور کالم نگار جناب شفقت محمود کا کہنا ہے ''تیسری دنیا کی سیاست میں بلڈ لائن (Blood Line) کو بہت ہی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ لائن پارٹی کے اندر اقتدار اور اختیار کی منتقلی میں آسانیاں اور اعتماد پیدا کرتا ہے۔ اسی لئے بلاول کو بلاول بھٹو زرداری کا نام دیا گیا ہے۔ ترقی یافتہ دنیا کے جمہوری ممالک کے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی لیکن اگر تیسری دنیا کے عوام کی نفسیات اور یہاں کے سماجی حالات کو پیش نگاہ رکھا جائے تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ محض 19 سالہ بلاول بھٹو زرداری کو پارٹی کا چیئرمین کیوں بنایا گیا؟''

دیکھنے والی بات یہ ہوگی کہ مستقبل قریب میں بلاول بھٹو زرداری اپنی پارٹی اور عوام کی توقعات اور آدرشوں پر کیسے اور کتنے پورے اترتے ہیں۔ ابھی تو پیپلز پارٹی کو اتحاد و اتفاق اور انتخابات کے سمندروں سے گزرنا ہے۔ (روزنامہ ''زندگی'' 6 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

کچھ بلاول بھٹو زرداری کے متعلق

''جمہوریت بہترین انتقام ہے'' (بلاول بھٹو زرداری)

ارشد ورک

پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے بلاول بھٹو زرداری کو ایسے وقت میں پارٹی کا نیا قائد مقرر کیا گیا ہے جبکہ ابھی وہ تعلیمی مراحل سے گزر رہے ہیں مگر اس ٹین ایج میں بھی وہ قومی معاملات پر جس اعتماد سے گفتگو کرتے ہیں وہ اس امر کا غماز ہے کہ وہ مستقبل میں خود کو پارٹی قیادت کا اہل ثابت کریں گے۔ آج کل بلاول بھٹو زرداری قومی اور عالمی میڈیا کا ہاٹ ایشو ہے۔ دنیا کے اخبارات اور جرائد بلاول بھٹو زرداری کی شخصیت، ان کے مشاغل اور تفریحات بارے بھی بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔

برطانوی اخبار ٹیلی گراف بلاول بھٹو کے حوالے سے لکھتا ہے کہ بلاول بھٹو ایک نارمل زندگی سے دور رہے ہیں اور بلاول کی طرف سے لکھا ہے کہ ''بچپن میں شفقت پدری سے محروم رہے۔ جب والد کی ضرورت تھی تو انھیں دور جیل بھیج دیا گیا'' بھارتی اخبار انڈیا ٹوڈے کا کہنا ہے کہ بلاول ایک عام طالبعلم کی زندگی گزار رہے ہیں لیکن اب ان کی جان کو کئی خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ بی بی سی کا ماننا ہے کہ وہ ایک ذہین لڑکا ہے اسی طرح ہر اخبار اور خبر رساں ادارے اپنے اپنے ذرائع کے حوالے سے بلاول بھٹو زرداری کے بارے کچھ نہ کچھ معلومات مہیا کر رہے ہیں کیونکہ بینظیر بھٹو کے بعد پیپلز پارٹی نے اس نوجوان کو اپنا لیڈر منتخب کیا ہے جو ابھی اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ فلمیں دیکھنے، سیر و تفریح اور پڑھنے لکھنے کا شوق رکھتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے بعد پارٹی قیادت بے نظیر بھٹو نے سنبھالی اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک عظیم رہنما بنیں لیکن افسوس کہ 27 دسمبر 2007ء کو ملک دشمن عناصر نے انھیں شہید کر دیا۔ کہا جا رہا ہے کہ یہ وہی ہاتھ ہیں جنھوں نے اس سے پہلے کراچی میں بینظیر بھٹو پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد پارٹی قیادت ان کے اکلوتے بیٹے بلاول بھٹو زرداری کے سپرد کر دی گئی ہے۔ بلاول بھٹو زرداری 21 ستمبر 1988ء کو اپنی والدہ بینظیر بھٹو کے پہلی مرتبہ وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہونے سے تین ماہ پہلے پیدا ہوئے۔ 1999ء میں اپنی والدہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی خود ساختہ جلاوطنی کے وقت اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کے ہمراہ باہر چلے گئے۔ بلاول بھٹو زرداری نے اس دوران اپنا زیادہ تر وقت دبئی اور لندن میں اپنے خاندان والوں کے ساتھ گزارا۔ اس وقت ان کے والد آصف علی جیل میں تھے۔ بلاول بھٹو زرداری کا بچپن اپنی والدہ کے ساتھ گزرا جبکہ اس دوران وہ اپنے والد کی شفقت سے محروم رہے۔ بلاول بھٹو زرداری نے ابتدائی تعلیم دبئی میں واقع راشد سکول برائے طلباء سے حاصل کی جہاں پر بلاول بھٹو سٹوڈنٹ کونسل کے نائب صدر رہے۔ بلاول بھٹو تائکوانڈو میں بلیک بیلٹ بھی ہیں اور آج کل آکسفورڈ یونیورسٹی کے مشہور کالج ''کرائسٹ چرچ'' میں تاریخ کے سال اول کے طالبعلم کی حیثیت سے زیر تعلیم ہیں۔ اسی کالج سے بلاول بھٹو کے نانا ذوالفقار

بھٹو نے اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور ان کی والدہ محترمہ بینظیر بھٹو بھی آکسفورڈ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھیں۔ بلاول بھٹو زرداری اپنی والدہ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کے وقت موسم سرما کی تعطیلات کے باعث دبئی میں واقع اپنے گھر میں موجود تھے۔ بلاول بھٹو زرداری کرانے کے علاوہ تیراکی، گھڑ سواری، سکوائش اور ٹارگٹ شوٹنگ کے شوقین ہیں۔ 3 سال پہلے ایک غیر ملکی اخبار سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ انھیں کرکٹ کھیلنی نہیں آتی اس لیے کہ انھیں اپنے خاندان کے ہمراہ زیادہ وقت ملک سے باہر رہنا پڑا۔ خاموش طبع بلاول بھٹو کتابیں پڑھنے کے شائق بھی ہیں۔ غیر ملکی اخبارات کے مطابق محترمہ بینظیر بھٹو کی پرانی دوست (Victoria schofield) بلاول بھٹو کو ان کے بچپن سے جانتی ہیں ان کا کہنا ہے کہ جب بلاول بھٹو کو آکسفورڈ میں داخلہ ملا اس وقت بے نظیر بھٹو بہت خوش تھیں۔ وکٹوریہ کا کہنا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بلاول بھٹو کو اپنی والدہ سے بہت انس تھا اور وہ ان سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔

بلاول بھٹو زرداری کو دیگر ہم عمر اور ٹین ایجرز کے ساتھ فلمیں دیکھنے اور دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کا بھی بے حد شوق ہے مسز شوفیلڈ کے مطابق بلاول کو میرے بچوں کے ساتھ شطرنج کھیلنا بہت پسند ہے کیونکہ وہ اس کھیل میں ہمیشہ جیت جاتا ہے۔ مسز شوفیلڈ نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ پارٹی قیادت سنبھالنے کے بعد بلاول بھٹو زرداری جلد ہی اپنے ملک پاکستان کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لیں گے اگرچہ انھیں اس حوالے سے کچھ وقت کا سامنا ہو سکتا ہے کیونکہ صرف 11 سال کی عمر میں وہ پاکستان سے باہر چلے گئے تھے۔

مسز شوفیلڈ کا مزید کہنا تھا کہ بلاول بھٹو زرداری کا بچپن اپنے والد آصف علی زرداری کی شفقت سے محروم رہا اس لیے اب انھیں اس اہم رشتے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہوگی۔ 2004ء میں بلاول بھٹو زرداری نے ماضی اور مستقبل کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ میرے نانا بہت بہادر اور عظیم انسان تھے میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کرتا ہوں کیونکہ میرے سامنے تین قد آور شخصیات کی زندگی ہے اور جب میں بڑا ہوں گا مجھے ان سے رہنمائی حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ بلاول بھٹو زرداری اردو، عربی اور انگلش زبانیں بول لیتے ہیں لیکن گھر میں انگلش بولے جانے کی وجہ سے انگلش ان کی مادری زبان ہے۔ بلاول بھٹو کا کہنا ہے کہ پاکستان کی سیاست میں مکمل طور پر داخل ہونے سے پہلے وہ اپنی پوری توجہ اپنی تعلیم پر دیں گے۔ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بلاول بھٹو زرداری کا کہنا تھا کہ میری ماں ہمیشہ کہتی تھیں کہ جمہوریت بہترین انتقام ہے۔

2004ء میں ایک انٹرویو کے دوران بلاول بھٹو زرداری نے کہا تھا کہ میں پاکستان کے عوام کی مدد کرنا چاہتا ہوں میں نہیں جانتا کہ یہ کب ممکن ہوگا میں جب اپنی تعلیم سے فارغ ہو جاؤں گا تو اس بارے میں فیصلہ کروں گا لیکن وقت نے کچھ پہلے ہی انھیں اس کارزار میں دھکیل دیا ہے۔ محترمہ بینظیر بھٹو کی شہادت کے بعد لوگوں کے پیغامات کا جواب دیتے ہوئے اپنی Facebook میں بلاول بھٹو زرداری لکھتے ہیں کہ آج ہر چیز سوگوار اور ماتمی ہے میں اس پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ میری والدہ محترمہ کی یادیں اور ان کے پیغامات لاتعداد لوگوں کے اندر جرات اور حوصلہ پیدا کرتے رہیں گے۔ اس موقع پر ان افراد کو نہیں بھولنا چاہیے جو میری والدہ کے ساتھ شہید ہوئے جو کہ ان کی حفاظت پر مامور تھے۔ بلاول بھٹو زرداری لکھتے ہیں کہ لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ میں ایسی زندگی اور مستقبل میں کیوں داخل ہونا چاہتا ہوں جہاں میری اور میرے اردگرد موجود لوگوں کی

زندگی خطرے سے خالی نہیں لوگ پوچھتے ہیں کہ غیر جمہوری طریقے سے آنے کے بعد میں جمہوریت کی بات کیسے کر سکتا ہوں میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ ایسے سوالات ضرور پوچھے جانے چاہئیں کیونکہ یہ جمہوریت اور آزاد معاشرے کی بنیادیں ہیں سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ان سوالوں کا راستہ نہ روکا جائے۔ بلاول بھٹو زرداری لکھتے ہیں کہ میں پیدائشی لیڈر نہیں ہوں اور میں سیاستدان یا بہت ذہین انسان بھی نہیں ہوں میں فی الوقت صرف ایک طالب علم ہوں میں وہی کرتا ہوں جو میری عمر کے طالب علم کرتے ہیں جن میں بہت سی غلطیاں شامل ہوتی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں سب سے اہم چیز وقت کے ساتھ ساتھ سیکھنا ہے وہ وقت آئے گا جب میں بھی لیڈر بنوں گا مگر فی الحال دیگر بہت سے لوگوں کی طرح میرے ذہن میں بھی بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں میں فی الحال وہ نہیں ہوں جو ان سوالات کے جوابات دے سکے۔

(سنڈے میگزین خبریں، لاہور 13 جنوری 2008ء)

♥ ..... ♥ ..... ♥

بلاول بھٹو زرداری کی ضرورت کیوں پڑی؟

سجاد انور

سقوط ڈھاکہ کے بعد پاکستان کو متحد کرنے، مستحکم بنانے اور اسے علاقے میں پھر سے ایک طاقت کے طور پر ابھارنے کے لئے ذوالفقار علی بھٹو نے تاریخی کردار ادا کیا۔ ان کی اس کارکردگی کو دشمن بھی سراہتے ہیں لیکن ان خدمات کے صلے کے طور پر وہ جہاں عوام میں ایک ہیرو کی طرح مقبول ہوئے وہاں انہیں اپنے ہی ملک کی ایک فوجی حکومت کے عہد میں پھانسی کے پھندے پر جھولنا پڑا۔

تب سر شاہنواز بھٹو کی گڑھی خدا بخش میں آخری قبر تھی۔ پھر ذوالفقار علی بھٹو کا جسد خاکی بھی رات کی تاریکی میں اس وقت کی آمریت نے خود ہی دفن کیا۔ چند سالوں کے بعد وہاں پر شاہنواز بھٹو کی لاش لائی گئی۔ اس کے بعد میر مرتضیٰ بھٹو شہید کا جنازہ بھی وہیں پہنچا اور پھر بے نظیر بھٹو بھی 28 دسمبر کو وہیں سپرد خاک کر دی گئیں۔

بھٹو خاندان کو ملک کو متحد اور مستحکم رکھنے کی پاداش میں اتنی بڑی سزا کیوں دی گئی جبکہ پاکستان کو توڑنے کی باتیں کرنے والا 'جئے سندھ تحریک' کا بانی جی ایم سید 91 برس کی زندگی گزار کر طبعی موت مرا۔

یہ سوال پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ہمیشہ ہی انتہائی اہم رہے گا۔

لیکن اسے بھٹو خاندان کی روایت کہئے یا عوامی جدوجہد کے ساتھ اس کی وابستگی کہ آج 19 سالہ بلاول اپنی ماں کا جانشین بننے کے لئے آگے بڑھا ہے۔ ملک بھر کے سیاسی تجزیہ نگار اور ناقدین یہ سوال اٹھا رہے ہیں کہ کیا ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی قیادت کے لئے سینئرز میں سے کوئی سیاست دان نہیں ملا؟ یہ سوال کسی حد تک فطری بھی ہے اور ضروری ہے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے ہم چند سال پیچھے بھارت کی سیاست کی طرف مڑ کر دیکھتے ہیں۔

اندرا گاندھی کے قتل کے بعد جب اس کے بیٹے راجیو گاندھی کو بھی قتل کر دیا گیا تو گاندھی خاندان نے خود کو سیاست سے لاتعلق کر لیا اور نرسیماراؤ کو کانگریس کا صدر چن لیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد کانگریس کا زوال شروع ہو گیا۔ نرسیماراؤ کے بعد سیتا رام کیسری کو کانگریس کا صدر چنا گیا جو بری طرح الیکشن ہار گئے۔ اور یوں تمام کانگریسی قیادت سونیا گاندھی کو مجبور کرنے لگی کہ وہ جماعت کی کمان سنبھال لیں۔ ادھر سونیا گاندھی نے کانگریس کی صدارت سنبھالی اور ادھر اگلا انتخاب کانگریس نے جیت لیا۔

یہ اس بھارت کی مثال ہے جہاں حقیقی معنوں میں جمہوریت ہے لیکن ہمارے جیسے ملک میں جہاں ہمیشہ سیاسی جماعتوں کو کمزور کیا جاتا ہے۔ ریاست اپنے اثر و رسوخ سے بڑی پارٹیوں میں گروپ بناتی ہے اور ہارس ٹریڈنگ کرتی ہے۔ وہاں سیاسی جماعتوں کو متحد اور مضبوط بنانے کے

لئے ایسی قیادت کی ضرورت ہوتی ہے جس پر لوگ یقین کرنے کے لئے تیار ہوں۔

بھٹو خاندان کا ماضی ہی اس کے مستقبل کا ضامن ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگلے پانچ سال تک بلاول بھٹو کوئی اہم سیاسی کردار ادا نہیں کر سکیں گے اور تب تک شریک چیئرمین آصف علی زرداری ہی پارٹی کی قیادت کریں گے۔ البتہ ان پانچ برسوں میں بلاول بھٹو آکسفورڈ سمیت دیگر مغربی اور امریکی یونیورسٹیوں سے اور تھنک ٹینکس سے جو کچھ سیکھ کر واپس آئیں گے ان کے کیلیبر کا کوئی دوسرا سیاست دان ملک میں موجود نہیں ہوگا تاہم اس دوران آصف علی زرداری کو اسی طرح کی تنقید کا سامنا کرنا پڑے گا جیسی تنقید بھارت میں سونیا گاندھی کو برداشت کرنا پڑی۔ کسی نے سونیا کو اٹلی کی شہری کہا اور کسی نے انہیں سی آئی اے کی ایجنٹ قرار دیا۔ کسی نے کہا یہ عیسائی ہیں اور کسی نے کہا منحوس عورت ہے جس کی وجہ سے اس کا شوہر قتل ہوا۔ اب یہاں آصف علی زرداری کو کہا جا رہا ہے وہ 'بھٹو' نہیں ہیں اس لئے پارٹی نہیں چلا سکیں گے۔ کوئی کہتا ہے وہ بلوچ ہیں سندھی نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے جب بی بی نے انہیں سیاست سے الگ کر رکھا تھا تو اب انہیں سیاست نہیں کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن آصف علی زرداری نے بھی ویسا ہی کیا ہے جیسا سونیا گاندھی نے کیا تھا۔ سونیا خود وزیراعظم کی امیدوار نہیں بنیں اور منموہن سنگھ کو اس کرسی پر بٹھا دیا۔ آصف علی زرداری نے بھی وزارت عظمیٰ کے لئے مخدوم امین فہیم کا نام پیش کر دیا ہے۔ بھٹو اور نہرو خاندان کی کہانی کتنی ملتی جلتی ہے۔

جیسے بھارت میں راہول گاندھی کا انتظار کیا جا رہا ہے کہ وہ کانگریس کی کمان سنبھالیں۔ اسی طرح پاکستان میں پیپلز پارٹی کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے اگلے پانچ سال تک بلاول بھٹو کا انتظار کیا جائے گا۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کس پائے کے راہنما ثابت ہوتے ہیں کیا وہ اپنے نانا ذوالفقار علی بھٹو اور والدہ بے نظیر بھٹو کی یادیں تازہ کر سکیں گے؟ اس سوال کا جواب تو وقت ہی دے گا۔ آئیں ایک نظر بلاول بھٹو کے بچپن، لڑکپن اور ٹین ایج پر ڈالتے ہیں۔

بلاول بھٹو زرداری 21 ستمبر 1988ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد محترمہ بے نظیر بھٹو پاکستان اور عالم اسلام کی پہلی خاتون وزیراعظم منتخب ہوئیں۔ بلاول نام کا مفہوم "لاثانی" ہے۔ انہیں نے راشد سکول فار بوائز دبئی سے او لیول کیا۔ وہ سکول کی سٹوڈنٹ کونسل کے نائب صدر تھے۔ تائیکوانڈو میں بلیک بیلٹ رکھنے والے بلاول بھٹو زرداری اس وقت آکسفورڈ یونیورسٹی کے کرائسٹ چرچ کالج میں تاریخ کے طالب علم ہیں۔ ان کے نانا اور سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو بھی اسی کالج میں زیر تعلیم رہے ہیں جبکہ والدہ شہید بے نظیر بھٹو نے بھی آکسفورڈ یونیورسٹی سے ہی گریجوایشن کی ڈگری حاصل کی تھی۔ جس وقت سانحہ لیاقت باغ کا المیہ رونما ہوا وہ موسم سرما کی چھٹیاں گزارنے کے لئے دبئی آئے ہوئے تھے۔

بے نظیر بھٹو کے سوئم کے موقع پر نوڈیرو میں 30 دسمبر 2007ء کو پیپلز پارٹی کی ایگزیکٹو کونسل کا اجلاس ہوا۔ اجلاس میں بے نظیر بھٹو کی وصیت پڑھ کر سنائی گئی جس میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے بعد آصف علی زرداری کو پارٹی چیئرمین نامزد کیا تھا لیکن زرداری نے اپنے بیٹے بلاول کو پارٹی چیئرمین مقرر کیا جبکہ خود شریک چیئرمین کا عہدہ سنبھالا۔ اجلاس کے بعد آصف علی زرداری نے پریس کانفرنس میں اپنے بچوں کے نام میں بھٹو کے لاحقے کا اضافہ کر دیا۔

اپنی پہلی کانفرنس میں بلاول بھٹو نے کہا ''وہ پارٹی کے شکر گزار ہیں جس نے ان پر اعتماد کرتے ہوئے انہیں پارٹی کے چیئرمین کا عہدہ سونپا۔ میری والدہ کہا کرتی تھیں کہ جمہوریت ہی بہترین انتقام ہے۔ پیپلز پارٹی نے جمہوریت کے لئے جدوجہد کی اور ہماری یہ جدوجہد آئندہ بھی جاری رہے گی۔'' انہوں نے مزید کہا کہ ''وہ اپنی والدہ کے نظریات کے مطابق پارٹی کے امور سرانجام دیں گے۔ میرے تعلیم مکمل کرنے تک والد آصف علی زرداری پارٹی کے روزمرہ امور سنبھالیں گے۔''

بلاول اتنی کم عمری میں واضح سیاسی نظریات رکھتے ہیں اور اپنی ماں اور نانا کی طرح ملک کے تمام مسائل کی جڑ آمریت کو قرار دیتے ہیں۔ تین برس قبل ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا ''وہ اور ان کا خاندان بوگس مقدمات کا شکار ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے بیش تر مسائل کا حل انصاف کی بروقت فراہمی اور جمہوریت میں ہے۔'' اپنے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں بلاول کا کہنا تھا ''ہم دیکھیں گے، میں نہیں جانتا میں پاکستان کے عوام کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔ میں سیاست میں آ سکتا ہوں اور ہو سکتا ہے میں اپنے لئے کوئی ایسا کیریئر منتخب کروں جس کے ذریعے سیاست میں آئے بغیر پاکستان کے عوام کی مدد کی جا سکے۔''

پیپلز پارٹی کے چیئرمین بلاول بھٹو نے مزید کہا تھا ''میرے خیال میں اگر پاکستان میں بار بار آمریت مسلط نہ ہوتی تو ملک کبھی اس قدر سنگین مسائل کا شکار نہ ہوا۔ ان مشکلات کو جمہوریت کے ذریعے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ بانی پاکستان جمہوریت پر یقین رکھتے تھے۔ وہ آمریت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ پاکستان ان چیزوں کے لئے نہیں بنا ہے لہٰذا ملک کا اقتدار ایک شخص کے پاس نہیں ہونا چاہیے۔'' جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا انہیں ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کے بارے میں بتایا گیا ہے تو بلاول کا کہنا تھا ''ہمیں ان کے بارے میں ہر بات بتائی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایک انتہائی باہمت شخص تھے اور اس لحاظ سے میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں کیونکہ میرے سامنے تین رول ماڈل ہیں جو اوائل عمری میں میرے کیریئر کے انتخاب کے حوالے سے مجھ پر بہر طور اثر انداز ہوئے ہیں۔''

آکسفورڈ میں بلاول کو ''بلاول لاولب'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ لاولب ان کے پہلے نام کا الٹ ہے۔ اگرچہ وہ اپنی پہچان پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کرائسٹ چرچ میں سب جانتے ہیں کہ وہ بے نظیر بھٹو کے صاحبزادے ہیں اور وہ انٹرنیٹ پر ''فیس بک پروفائل'' میں اپنی والدہ بے نظیر بھٹو کے ریفرنسز بھی شامل کرتے رہے ہیں۔

بلاول بھٹو زرداری اور 19 سالہ فلیپا نیل ایک ہی ہاسٹل میں رہائش پذیر ہیں۔ فلیپا نیل کہتی ہیں کہ آکسفورڈ میں بلاول کو سکیورٹی فراہم نہیں کی گئی تھی۔ اس کے مطابق اپنی والدہ کی شہادت کے روز انہیں نے فیس بک پر ایک بیان بھیجا ''تم ایک انسان کو قید کر سکتے ہیں لیکن خیال کو نہیں، تم ایک انسان کو جلاوطن کر سکتے ہو خیال کو نہیں، تم ایک انسان کو قتل کر سکتے ہو لیکن خیال کو نہیں۔۔۔۔ بے نظیر بھٹو'' سانحہ لیاقت باغ کے روز بلاول کی فیس بک کے پہلے صفحہ پر تحریر تھا ''ایک با اخلاق عورت جس نے تاریخ رقم کر دی۔'' فلیپا نیل نہیں جانتی کہ یہ فقرہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے روز ہی فیس بک پر تحریر کیا گیا تھا یا اس سے قبل۔ اس بارے میں اس کا کہنا تھا ''میں نے بلاول کے ساتھ کبھی سیاست پر گفتگو نہیں کی لیکن اس کا فیس بک پروفائل دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ پاکستان کی سیاسی صورتحال سے مکمل طور پر باخبر ہے۔ کچھ مہینے پہلے بلاول کے فیس بک پروفائل پر صدر

مشرف کا کارٹون آویزاں تھا۔ وہ ایک ملنسار اور مہذب لڑکا ہے۔''

آکسفورڈ یونین ڈیبیٹنگ سوسائٹی کی سابق صدر لیوک ٹرل نے کہا'' بے نظیر بھٹو سوسائٹی کی سابق صدر تھیں جبکہ ان کا بیٹا اس مشہور گروپ کی سرگرمیوں میں خصوصی دلچسپی لیتا ہے۔'' 20 سالہ ٹرل کا کہنا تھا'' بلاول نے آکسفورڈ میں اپنے ابتدائی کچھ ماہ کے دوران سوسائٹی کے کئی تقریری مقابلوں میں حصہ لیا۔'' اس کے مطابق'' بلاول ایک ملنسار نوجوان ہے۔'' بلاول بھٹو زرداری کی طرف سے حال ہی میں فیس بک پروفائل پر ایک پیغام بھیجا گیا ہے۔ جس میں انہوں نے کہا:

''میرے دوستو!

میں پچھلے ہفتے آپ کی طرف سے بھیجے گئے پیغامات اور مدد کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں پشیمان ہوں کہ وقت کی کمی کی وجہ سے میں فرداً فرداً سب کو جواب نہیں بھیج سکا لیکن میں نے سب کے پیغام بغور پڑھے ہیں اور آپ کی طرف سے رنج کے جذبات پر میں جذباتی ہو گیا ہوں۔ میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ آپ سب میرے حقیقی بھائیوں اور بہنوں کی طرح ہو۔ یہ دنیا بھر میں سوگ کا وقت ہے اور میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ میری ماں کی یاد اور نظریات نے لاتعداد لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ ان لوگوں کو نہیں بھولنا چاہیے جنہوں نے خطرات کے باوجود میری ماں کی حفاظت اور مدد کے لئے اپنی جان کی پرواہ نہیں کی۔ آج رات جنت کی گلیوں میں فرشتوں کو ہجوم ہوگا۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ میں نے ایسا راستہ کیوں اختیار کیا جس سے میری اور میرے اردگرد موجود لوگوں کی زندگی مستقل خطرات سے دوچار ہوگئی ہے؟ لوگوں نے مجھ سے پوچھا ہے کہ کیوں صرف 19 برس کی عمر میں ایک شخص اپنے آپ میں یہ صلاحیت محسوس کرتا ہے کہ وہ ملک کو سیاسی بحرانوں سے نکال کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر سکتا ہے۔

مجھ سے یہ بھی سوال کیا گیا ہے کہ میں کیوں جمہوریت کی بات کرتا ہوں جبکہ میں خود غیر جمہوری طریقے سے پارٹی کا سربراہ بنا ہوں؟ میرا خیال ہے کہ یہ خاصا سخت ردعمل ہے۔ بہرحال یہ درست سوالات ہیں۔ یہ سوالات جمہوریت کی بنیادوں اور آزاد معاشرے کی تشکیل سے متعلق ہیں۔ سب سے اہم چیز تو یہ ہے کہ سوالات پوچھنے کا سلسلہ نہیں رکنا چاہیے۔

میں پیدائشی لیڈر نہیں ہوں۔ نہ ہی میں ایک سیاست دان اور عظیم مفکر ہوں۔ میں صرف ایک طالب علم ہوں۔ میں دوسرے طالب علموں کی طرح غلطیاں کرنا چاہتا ہوں۔ میں جنک فوڈ کھانا اور سینما دیکھنا چاہتا ہوں لیکن سب سے اہم تو یہ ہے کہ میں سیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا رہنمائی کرنے کا وقت قریب آچکا ہے لیکن ابھی میں خود سوال پوچھ رہا ہوں۔ جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔

بلاول بھٹو زرداری''

بلاول بھٹو نے اپنے فیس بک پروفائل میں مزید لکھا ہے کہ ان کا پسندیدہ گل فٹبال میچ کے دوران ''اللہ اکبر'' کا نعرہ لگانا ہے۔ ان کے مشاغل میں کرکٹ، پیراکی، سکواش، شوٹنگ جبکہ پسندیدہ ترین پروگرام 'دی سمپسنز' ہے۔ بلاول بھٹو فلم میکر مائیکل مور اور کوینٹین ٹرانٹنو کی شخصیات سے متاثر ہیں۔ ان کے آن لائن دوستوں کی تعداد 315 ہے۔ بلاول بھٹو کی فیس بک ان کے مداحوں کے خیر مقدمی جملوں سے بھری ہوئی ہے۔

بلاول بھٹو کی پیپلز پارٹی کے چیئرمین کے طور پر نامزدگی کے بعد برطانیہ میں انہیں دوران تعلیم 24 گھنٹے سکیورٹی فراہم کی جائے گی۔ سکاٹ لینڈ یارڈ کا ڈپلومیٹک پروٹیکشن گروپ بلاول بھٹو کی حفاظت کے لئے خطرات کا اندازہ لگائے گا اور اس حوالے سے پیپلز پارٹی کے رہنماؤں سے مشاورت کے بعد ان کی سکیورٹی کے انتظامات ترتیب دیئے جائیں گے۔ یونیورسٹی میں بلاول بھٹو کی رہائش گاہ میں خفیہ آلات کی تنصیب کے علاوہ ان کی حفاظت کے لئے سکاٹ لینڈ یارڈ کے اہلکار بھی ان کے ساتھ رہیں گے۔

یہ ہے پاکستان کے مستقبل کا لیڈر بلاول بھٹو زرداری..... جو ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر بھٹو کا سیاسی وارث ہے اور جس کے سامنے ایک ایسا ملک ہے جو بے شمار مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ جہاں غربت ہے، جہالت ہے، آمریت ہے اور اب دہشت گردی کا عنصر تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ وہ ان چیلنجوں سے نمٹنے کے لئے کیسی تیاری کر کے واپس لوٹتے ہیں۔

اور یہ بھی کوئی نہیں جانتا کہ اگلے پانچ سال میں ملک کی سیاست کا نقشہ کیا ہو؟

اور کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ دہشت گردی اور علیحدگی پسندوں کے خلاف سرحد اور بلوچستان میں جو فوجی آپریشن جاری ہیں ان کے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ خدا کرے بلاول کی واپسی تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور پرامن رہے اور ملک بہتری کی طرف گامزن رہے۔

(روزنامہ ''وقت'' 6 جنوری 2008ء)

♥ ..... ♥ ..... ♥

جانشین

حسن نثار

بھٹو صاحب عجلت پسند تھے اس لئے زیادہ عرصہ انتظار نہیں کر سکے۔ اب وہ بہت آسودہ ہوں گے کیونکہ ان کی لاڈلی پنکی اپنے شہید بابا کے خوشبودار خون کی لکیر پر چلتے ہوئے ان کے پہلو میں آرام فرما ہے۔ باپ بیٹی مدتوں بعد سرگوشیاں کریں گے اور ضیاء الحق سے لے کر بیت اللہ محسود تک اب کوئی انہیں جدا نہیں کر سکے گا۔

زیر زمیں بھی روشنی ہو
مٹی میں چراغ رکھ دیئے ہیں

بھٹو صاحب نے ملتے ہی بیٹی کے روشن ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے اس کی ماں کا حال پوچھا ہوگا، ممکن ہے شکوہ بھی کیا ہو کہ اس کو ساتھ کیوں نہیں لے کر آئیں۔ ممکن ہے انہوں نے محترمہ اور مرتضیٰ کے بچوں میں فاصلوں پر بھی دکھ کا اظہار کیا۔ باپ بیٹی دیر تک اس عجیب حقیقت پر بھی ہنستے ہوں گے کہ بھٹو شہید تو متنازعہ شہید تھے جبکہ بے نظیر بھٹو شہید غیر متنازعہ شہید قرار پائی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گڑھی خدا بخش میں ان کا آبائی قبرستان اب تک پرانے ''المرتضیٰ'' یا ''70 کلفٹن'' کے صحن میں تبدیل ہو گیا ہو جہاں بھٹو صاحب اپنی بے نظیر، اپنے شاہنواز اور مرتضیٰ کے ساتھ مل کر ان زمانوں کی یاد تازہ کر رہے ہوں جب یہ سب جواں سال شہداء اکٹھے ہوتے تھے اور پاکستان پر قربان ہونے والے اس خاندان پر قاتلوں کے خاندان کی نظر بد نہیں پڑی تھی۔

شہید باپ اور شہید بیٹی کے ملن پر ماتم کیسا کہ اب ماتم ان کا مقدر ہے..... اس ذہنیت کا مقدر ہے جو بے نظیر کو ''سیکورٹی رسک'' اور خود کو حب الوطنی کے چمپئن سمجھتے کہتے رہے۔ اب ''سیکورٹی رسک'' تو ختم سمجھو لیکن ''ہائی رسک گیم'' شروع ہو چکی ہے، جسے کوئی شک ہو وہ جنرل طارق مجید کے اس تبصرے پر غور کرے کہ بے نظیر کا قتل پاکستان کے استحکام پر حملہ ہے۔

پاکستان کے کرتوں دھرتوں کے لئے ہی لکھا گیا ہے کہ..... ''لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام۔'' مخصوص ذہنیت اس انتہائی نازک مرحلہ پر پارٹی میں توڑ پھوڑ اور جوڑ توڑ سے گریز کرے۔ جتنے ''پیٹریاٹ'' یا ''شیر پاؤ گروپ'' بننے تھے کافی سمجھو اور دعا مانگو کہ پارٹی بکھرنے سے بچی رہے کہ اگر وفاق کی یہ اکلوتی سیاسی علامت بکھر گئی تو اس کے ساتھ ہی بہت کچھ بکھر جائے گا اور زندگی میں بہت کچھ ایسا ہے جسے طاقت کے بل بوتے پر یکجا اور اکٹھا نہیں رکھا جا سکتا۔

اللہ پاک پیپلز پارٹی کی زخم خوردہ قیادت کو درست اور بروقت فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ قیادت کا خلا اور خلیج بہت ہی خوفناک

ہے۔ محترمہ سے آدھے قد و قامت کی شخصیت بھی دور دور تک دکھائی نہیں دیتی اور یہی وہ مقام ہے جہاں افراد اور اداروں کا صحیح مقام و معنی سمجھ آتے ہیں کہ جہاں معاملات اداروں کی بجائے شخصیات کے گرد گھوم رہے ہوں وہاں اندھیرے چھا جاتے ہیں اور کسی کو کچھ سمجھ نہیں آتی کہ ہوگا کیا؟

پیپلز پارٹی عملاً، جوہراً، خالصتاً بھٹو خاندان کا سیاسی نام ہے اور لوگ کسی ''غیر بھٹو'' کو قائد کے طور پر قبول نہیں کریں گے اور اگر کریں گے بھی تو یہ نہ مؤثر ہوگا نہ دیرپا۔ بلاول، بختاور اور آصفہ ''زرداری'' ہیں اور بہت کم بھی..... دوسری طرف فاطمہ بھٹو اور ذوالفقار علی بھٹو جونیئر ہیں جو جنگ تخت نشینی سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ آصف زرداری کی ذاتی سیاسی قربانی کی داستان بھی طویل ہے اور وہ اپنی شہید شریک حیات کا عظیم سیاسی ورثہ خود سنبھال کر کسی مناسب وقت پر اپنے کسی بچے کو منتقل کرنا چاہیں گے تو انجام؟ نتیجہ؟

یہاں مجھے سکندر اعظم کی یاد آتی ہے جو بستر مرگ پر تھا جب کسی نے پوچھا..... ''سکندر! دنیا کی یہ عظیم ترین سلطنت تم کس کے لئے چھوڑ کر جا رہے ہو؟'' سکندر نے کچھ دیر سوچا، مسکرایا اور پھر زیر لب کہا

''طاقت ور ترین کے لئے''

جانشینی جیسے گھمبیر مسئلہ کا ایک دیرینہ، آزمودہ اور تاریخی حل تو یہ ہے کہ اسے دعویداروں کی طاقت اور ذہانت پر چھوڑ دیا جائے کہ جو بہتر ہوگا وہ خود ہی سنبھال لے گا لیکن اس پراسیس میں شکست و ریخت بہت ہوتی ہے جبکہ پارٹی تو اپنی جگہ..... موجودہ مضمحل پاکستان بھی شاید پارٹی میں پراگندگی کا متحمل نہ ہو سکے اس لئے ملک اور پارٹی کے بڑوں کو بڑا پن دکھاتے ہوئے دانش و حکمت سے مختلف مراحل گزارنے ہوں گے..... حکومت کے لئے بہتر ہوگا کہ نگرانوں کو چلتا کر کے ''قومی حکومت'' کا ڈول ڈالے اور یہ واقعی ''قومی حکومت'' ہو، کوئی نیا ڈرامہ نہیں اور پیپلز پارٹی کی قیادت کو کیا کرنا چاہیے؟ وہ خود بہتر جانتے ہوں گے لیکن اتنا جان لیں کہ فیصلہ وہی دیرپا رہے گا جو ''جینوئن'' ہوگا۔

آخر پر ایک پچھتاوہ کہ محترمہ کے لئے لاہور میں ایک یادگار ڈنر میجر (ر) کنگی نے دیا جو میرے بھائیوں جیسے ہیں..... میں نے معذرت کر لی..... پھر عید کے اگلے روز برادرم رحمٰن ملک نے فون کر کے محترمہ کی طرف سے نیک خواہشات کا پیغام پہنچایا تو میں نے بھی جواباً اور رسماً شکریہ ادا کر دیا..... کاش میں اس ڈنر پر گیا اور محترمہ سے مل لیا ہوتا..... کاش میں نے رحمٰن ملک کے ذریعہ پہنچنے والی نیک خواہشات کے جواب میں خود محترمہ کو فون کر کے ان کا شکریہ ادا کیا ہوتا لیکن وہی منیر نیازی والی بات کہ..... ''ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں''

لیکن محترمہ نے جلدی کر دی۔

اب حکومت دیر نہ کرے۔

پیپلز پارٹی کی قیادت بھی دیر نہ کرے۔

ملک پہلے بہت ''لیٹ'' ہے۔

(روزنامہ ''جنگ'' 30 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

محترمہ بے نظیر صاحبہ کی شہادت پر شعراء کے آنسو

یہ چراغ کس نے بجھا دیا

سرِشام کس نے ستم کیا کہ ہر ایک دل کو رُلا دیا
مری ارضِ پاک پہ یک بہ یک کوئی آسمان گرا دیا
کوئی فرد کب تھی وہ عہد تھی، اور اک عہد قتل ہوا یہاں
کوئی دستِ ظلم شقی کا تھا کہ عجیب حشر اٹھا دیا
ابھی رات ہی کا اندھیر ہے، ابھی صبح ہونے میں دیر ہے
مری ارضِ جاں تری خیر ہو، یہ چراغ کس نے بجھا دیا
وہ جو علم و فن کا جمال تھی، جو نسائیت کا کمال تھی
کوئی شاہ کار وجود تھی، جسے آج ہم نے گنوا دیا
یہ اجل کو کیسی تھیں عجلتیں کہ خزاں کے آنے سے قبل ہی
وہ جو خود پیام بہار تھی، اسے جامِ مرگ پلا دیا
یہ جو راستوں میں ہجوم ہے، یہ عقیدتوں کی جو دھوم ہے
یہ اس کی ذات کا سحر ہے، تہ خاک جس کو سلا دیا
کوئی روشنی کی لکیر تھی کہ اسی پہ اس نے سفر کیا
کسی روح سے کسی روح نے کہیں جا کے خود کو ملا دیا
یہ عقیدتوں کی جو راہ ہے، تو اسی میں عزم و ثبات ہے
یہی موت اس کا نصیب تھی، اسے رب نے اجر وفا دیا
نہ رہے صفوں میں یہ ابتری، تو اسی کا اس نے بھرم رکھا
کبھی سرد شعلۂ غم کیا، کبھی نفرتوں کو بجھا دیا

(شاہدہ حسن)

ابہام

ہر ایک منظر ہے دھندلا دھندلا
کہ جیسے پانی پہ عکس لرزاں
تمام رنگ ایک دوسرے میں گھلے ہوئے ہیں
تمام نقش اپنے وسوسوں سے دھلے ہوئے ہیں
تمام خلق خدا ہے
چہروں پہ دھند کی اک نقاب ڈالے
تمام سچائیاں ہیں
اپنے گلے میں صدیوں کے خواب ڈالے
یہ کیا
کہ پیٹھ کی سمت پاؤں سب کے پھرے ہوئے ہیں
یہ نیم تاریک رہ گزر
اور یہ نیم روشن تمام گھر
وحشت ہنر میں گھرے ہوئے ہیں

یہ آفتاب،
ایک جگمگاتا حجاب سا ہے
یہ ماہتاب،
ایک زخم خوردہ رباب سا ہے
یہ پھول
جیسے ہوں "قتل نامے" کی سرخ مہریں
یہ شاہراہوں کے قمقمے ہیں
کہ آبلے ہیں؟
جو پھوٹ کر آج اپنی حالت پہ رو پڑے ہیں
میں سوچتا ہوں
تو کوئی چھپ کر مجھی میں میرے فسون باطن کو بھانپتا ہے
میں لکھ رہا ہوں
مگر مرا ہاتھ کانپتا ہے!!

(شبنم رومانی)

شہید عشق

عشق کی راہ میں ہونا کیا تھا
عشق جب جہد طلب سے ہو
صداقت سے، سیاست کی کٹھن راہ سے ہو
رات کو صبح بنانے کے خیالات سے ہو
عشق احساس جنوں خیز میں ڈھلتا ہوا گر
لمحہ لمحہ یہ جنوں رنگ بدلتا ہوا گر
گر طلب یہ ہو کہ ہر دشت گلستاں ہو جائے
رنج بے مائیگی ہر دل سے گریزاں ہو جائے
گر غرض عشق کی یہ ہو کہ ہر اک راہ وطن
گل بہ داماں نہ صحیح امن بہ داماں ہو جائے
عشق جب خلق خدا سے ہو
تو اس زخم کا مرہم نہیں کچھ
راہ مقتل کے سوا اور شہادت کے سوا
سچ نے اور عشق نے ہر عہد میں عزت پائی
راہ ہستی میں شہادت پائی
اب کے سچ اتنا مقدس تو نہیں تھا لیکن
اس کے دامن میں سنے دور کا معیار بھی تھا
سچ کو مقتل میں بلانے کے لیے

اہل کوفہ ہی نہ تھے
کوئے کا سردار بھی تھا
پھر رہ عشق میں ہونا کیا تھا
دست قاتل کے سوا
سچ کی شہادت کے سوا
اور کیا ہونا تھا اک تازہ قیامت کے سوا
کو بہ کو نوحہ کناں پھرتے ہیں غم خوار ترے
بے نظیر آج ہر اک کوچے میں
سر بہ کف پھرتے ہیں بیمار ترے
اس شہادت نے تری ذات کو
عظمت دی ہے
ترے نذرانۂ جاں نے ترے بیماروں کو
دست قاتل کو جھٹک دینے کی ہمت دی ہے
اہل طاقت نے تجھے قتل کیا ہے لیکن
وقت نے تیری حمایت کی ہے
اور تا روز قیامت تیرے
زندہ رہنے کی شہادت دی ہے

(سرور جاوید)

ترے لہو کو سلام میرا

مرے جیالو! مرے رفیقو! کبھی جو تاریخ کے ورق پر
حکایت انقلاب لکھنا
تو پھر شہیدان راہ حق کے
لہو کی سرخی سے ہر صدی کا حساب لکھنا
لہو سے لکھنا کہ عہد نو کی عظیم قائد تھی
اس وطن کی عظیم بیٹی، عظیم رہبر
جو تیرگی میں نوید صبح تھی
خزاں رتوں میں سفیر گل تھی
نشان تھی امن و آشتی کا
اسے یہ منصب عطا ہوا تھا
کہ تیرگی کے خلاف عزم جہاد کرنا
لہو سے روشن کیا تھا اس نے دیار ہستی کی رہ گزر کو
لکھیں گے اوراق جان و دل پر
پیام اس کا کلام اس کا
رہے گا تاریخ حریت میں
پیام لوگوں کے نام اس کا، قیام اس کا
عظیم قائد، عظیم رہبر، ترے لہو کو سلام سب کا، سلام میرا
ڈھلی ہے فصل عزا میں اب کے بہار کی رت
تمام قریے تمام کوچے ہیں خاک برسر
ہر اک خیاباں، ہر ایک بستی سیاہ پوش و فغاں بہ لب ہے
ہزار در صد ہزار بادل تری جدائی سے مضمحل ہیں
ہزار در صد ہزار آنکھوں نے آنسوؤں سے
پڑھی ہے تیری نماز رخصت
عظیم ہے تو کہ تو نے آخر
رہ شہادت سے زندگی شاہکار کر کے
چکا دیے قرض اس ذمیں کے
متاع جاں کو نثار کر کے
ترے لہو کو سلام میرا

(پروین حیدر)

بے نظیر بھٹو شہید کے لیے

ایک خلقت کہ آ رہی ہے ادھر
تو، فلک ہے تو جا رہا ہے کدھر
میں، دیا ہوں سو جل رہا ہوں وہاں
تو، ہواؤں میں چل رہا ہے جدھر
اک سفر تھا کہ ہو چکا ہے تمام
یہ تھکن ہے جو سو رہی ہے ادھر

غم، عجب ہے کہ مل رہے ہیں گلے!
کیا ستم ہے کہ دل جلے ہیں جدھر
کیا طلب تھی کہ رخ ہوا میں کھلا
کیا ادب ہے کہ سر پھرے ہیں جدھر
میں، قلم ہوں سو لکھ رہا ہوں سلیم
شاعری تھی چلی گئی ہے ادھر

(احسن سلیم)

زندہ ہے

لکھ رہی تھی وہ اپنی کرنوں سے
شب کے آنچل پہ روشنی سے لفظ
گھور اندھیرے میں چاندنی سے لفظ
جگنوؤں سے اجالے مانگ کے وہ
زندگی کے اندھیرے رستوں میں
آگہی کے شکستہ طاقوں میں
ہر قدم پر دیے جلاتی رہی
اک نیا راستہ بناتی رہی

گو کہ پیروں میں بیڑیاں بھی تھیں
آرزو کا بدن دریدہ تھا
پھر بھی ہمت چٹان تھی اس کی
اور سچائی شان تھی اس کی
اک نئی صبح کی سفیر تھی وہ
اک جواں عزم کی اسیر تھی وہ
لوگ کہتے ہیں، مرنے والے لوگ
پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے

جانے کیوں مجھ کو ایسا لگتا ہے
جیسے دنیا سے وہ گئی ہی نہیں
ہر دمکتی کرن میں زندہ ہے
روشنی کے بدن میں زندہ ہے
حق کی ہر انجمن میں زندہ ہے
وہ تو ہر اک ذہن میں زندہ ہے

(حمیرا راحت)

نذرِ بے نظیر

یہ کس کے واسطے آہ و فغاں ہے شہر بہ شہر
گلی گلی صف ماتم ہے، کو بہ کو کوئی قہر
جدھر بھی دیکھو نظر آرہی ہے آگ ہی آگ
یہ کس نے لوٹ لیا ہے مرے وطن کا سہاگ
خبر یہ کون سے منحوس پل نے پھیلا دی
کہ ہم سے روٹھ گئی ہے وطن کی شہزادی
یہ میرے لوگ، یہ میرے وطن کے پیارے لوگ
فلک نے ان کو عطا کر دیا ہے کون سا روگ
وہ زخم ہے جو دلوں میں سما نہیں سکتا
یہ بوجھ وہ ہے جو کوئی اٹھا نہیں سکتا
بسی رہے گی نگاہوں میں آخری تصویر
لہو سے خاک پہ لکھی ہے تو نے جو تحریر
کریں فرشتے تری رہنمائی جنت تک
تمہارا نام چمکتا رہے قیامت تک

(احمد امتیاز)

(روزنامہ "سنڈے ایکسپریس" 6 جنوری 2008ء)

♥.....♥.....♥

مرثیہ

(بے نظیر بھٹو کے سفاکانہ قتل پر)

احفاظ الرحمٰن

درندے جاگتے ہیں
شہر سوتا ہے
درندے جاگتے ہیں
خون کا دریا بہاتے ہیں
زمین مصلحت کی نیند میں ڈوبا
ضمیر وقت سوتا ہے
ہر اک جانب، زمیں سے آسماں تک
ظلم کے سفاک کارندے اچھلتے کودتے ہیں، خوف کی فصلیں اُگاتے ہیں
جنوں کی آگ پھیلاتے
فضا کو وحشیانہ قہقہوں کی زد پہ رکھتے ہیں
درندے جاگتے ہیں
اور سکوں کے، عافیت کے آرزومندوں کو اپنے خنجروں سے قتل کرتے ہیں
شہر، غافل شہر سوتا ہے
حاکمانِ وقت سوتے ہیں
نہتی بنتِ حوا کا دھڑکتا دل
کچل دیتے ہیں اپنے بدنما پنجوں کی قوت سے

درندے جاگتے ہیں
شہر، غافل شہر سوتا ہے
یہ عافیت کا جویا شہر، غافل شہر کب تک نیند کی لذت اٹھائے گا
یہ کب بیدار ہوگا
جب در و دیوار سارے
آنسوؤں میں ڈوب جائیں گے؟

یہ عافیت کا جویا شہر کب بیدار ہوگا
یہ کب ظالم کے ہاتھوں سے لہو آلود خنجر چھین کر،
سکون و امن کی بنیاد ڈالے گا
یہ جاگے گا کہ اس کا مرثیہ تاریخ لکھے گی
یہ غافل شہر تھا
بس موت ہی اس کا مقدر تھی؟

(روزنامہ ایکسپریس، لاہور 28 دسمبر 2007ء)

♥.....♥.....♥

ایسے بہنوں کو تو رخصت نہیں کرتے بھائی

محمود شام

ایسے بہنوں کو تو رخصت نہیں کرتے بھائی
ایسے بیٹی کو تو میکے سے نہیں بھیجتے ہیں
ایسے تاریخ تو قومیں نہیں لکھتیں اپنی
ایسے تہذیب کا چہرہ نہیں جھلسا جاتا
اس طرح قیمتی میراث لٹاتے ہیں کہاں
یوں تدبر کو کہاں زہر دیا جاتا ہے
ایسے جرأت پہ کہاں وار کیے جاتے ہیں
ایسے اقدار پہ تلوار کہاں اٹھتی ہے

ایسے افکار پہ نیزے نہیں پھینکے جاتے
ایسے تقدیر پہ شمشیر کہاں چلتی ہے
یوں عقیدوں سے ہلاکت نہیں بانٹی جاتی
ایسے امید کو کب قتل کیا جاتا ہے
اپنے آئندہ سے یوں خوف کہاں ہوتا ہے
چھوڑیں بچوں کے لیے آگ لہو کا ورثہ
ایسے ماں باپ تو دنیا میں نہیں ہوتے ہیں
ایسے بہنوں کو تو رخصت نہیں کرتے بھائی

(روزنامہ آواز، لاہور 30 دسمبر 2007ء)

♥ ..... ♥ ..... ♥

بھٹو شہیدوں کی طرف سے نئے سال کا پیغام

پروفیسر شریف اشرف

(ڈیرہ غازی خان)

جاں نذر تمہاری اہل صفا
اے اہل صفا، یاران وفا
تم کو ہو مبارک سال نیا
جاں نذر تمہاری اہل صفا

لو تازہ لہو کی گرمی سے
جذبوں کو نکھارو اہل وطن
احساس کی جیبوں میں بھر لو
اس خالص زر کی چھن چھن چھن

اس تازہ لہو کی سرخی سے
دہقان کا دھن، مزدور کا فن
ہم اہل سخا میں کرتے ہیں
یاروں پر نچھاور تن من دھن

تم کو ہو مبارک سال نیا
اے اہل صفا، یاران وفا
جاں نذر تمہاری اہل صفا

یہ تازہ لہو ہے گونجے گا
نو سال جواں شریانوں میں
یہ خون نئی دھج لائے گا
سب کھیتوں اور کھلیانوں میں
یہ جھونپڑیوں میں چمکے گا
یہ لو دے گا ایوانوں میں
یہ مست الستی صہبا ہے
ناچے گی سبھی پیمانوں میں

جاں نذر تمہاری اہل صفا
اے اہل صفا، یاران وفا
تم کو ہو مبارک سال نیا

♥ ..... ♥ ..... ♥

مکالمہ

پروفیسر شریف اشرف
(ڈیرہ غازی خان)

بابا:

آ گلے لگ جا میری بچی، میری درد آشنا
تو نے جاں دے کر وفا کا نام زندہ کر دیا

بیٹی:

لاج رکھی میں نے جاں دے کر تیرے فرمان کی
دیکھ بابا میں نے وعدہ کیا پورا

بابا:

جان بابا سخت نازک زینۂ ایام ہے
زندگی خلق خدا سے دوستی کا نام ہے

بیٹی:

چاہنے والے تیرے بابا نہ ہوں غمگیں کہیں
آخری سانسیں بھی میں نے عام انسانوں میں لیں
سرخرو تو ہوں مگر بابا ذرا تشویش ہے
ماں کی فرقت میں فسردہ ہوں گے میرے نونہال

بابا:

پونچھ لے اشکوں کو میری جاں افسردہ نہ ہو
میرے کنبے کا محافظ ہے خدائے ذوالجلال
حوصلے میں ہے بلاول فاطمہ و آصفہ
ان کے سر سایہ فگن ہے بے نواؤں کی دعا

♥.....♥.....♥

متفرقات

فاطمہ بھٹو کی خدمت میں

ہر پاکستانی یہ جانتا ہے بھٹوز کی شہادت کے بعد اس سوگوار خاندان پر کیا گزر رہی ہے۔ اس سوگواری میں صرف بھٹو خاندان ہی نہیں شامل نہیں بلکہ پاکستان کا ہر بچہ، جوان، بوڑھا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت سوگواری کی حالت میں گزر رہا ہے۔ مشہور کالم نویس اسد اللہ خان غالب نے اپنے ایک کالم میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اس کے گھر میں کوئی بھٹو نہیں تھا جب بے نظیر شہید ہوئیں تو اس کی زوجہ محترمہ اور والدہ صاحبہ زار و قطار رو رہی تھیں۔ اور اقرار کیا کہ واقعہ بھٹو ہر گھر میں رہتا ہے۔ سوائے چار قاتلوں کے ہر گھر میں آہ و بکا کی آوازیں اٹھیں۔ ممکن ہے ان چار قاتلوں کی مستورات بھی اپنے بستروں میں منہ چھپا کر سسکیاں بھر رہی ہوں۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔

میں بھٹو خاندان کی خدمت میں عرض کروں گا۔ نقصان صرف بھٹو خاندان کا نہیں تھا بلکہ قومی نقصان تھا۔ جس کو صدیوں تک پورا نہیں کیا جا سکتا۔

میں بھٹو خاندان کی ذہین فطین بیٹی فاطمہ بھٹو کی خدمت میں عرض کروں گا۔ وہ دشمنوں کے عزائم کو بھانپیں۔ گہرائی تک پہنچیں۔ ان کا ایک مقصد تو پاکستان کے وفاق کو کمزور کرنا ہے دوم پیپلز پارٹی میں سنگ تفرقہ پھینک کر ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی وراثت کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ فاطمہ بھٹو! اپنے دادا کی تاریخ پڑھیں اور ضرور پڑھی بھی ہوگی کہ وہ صرف اپنی وراثت ''پیپلز پارٹی'' کو بچانے کے لیے پاکستان کی زمین کو نہیں چھوڑ رہے تھے۔ ان کے جان دینے کی جہاں اور بے شمار وجوہ ہیں ان میں سے ایک وجہ پیپلز پارٹی کا وجود تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ بے نظیر شہید نے اس امانت کی کمال حفاظت کی اور اپنے عہد کو خوب نبھایا۔ ہر مخالف کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا جب محترمہ اس دنیا سے گئیں تو ایک مضبوط پارٹی چھوڑ کر گئیں۔ اے فاطمہ بھٹو! اب پیپلز پارٹی کی حفاظت کی ذمہ داری صرف بلاول بھٹو پر ہی نہیں بلکہ تمام خاندان پر عائد ہوتی ہے۔ میری ہی نہیں بلکہ تمام پاکستان کے لوگوں کی یہی دلی خواہش ہے کہ محض خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے پیپلز پارٹی (جو آپ کے دادا کی میراث ہے) انتشار کا باعث نہ بن جائے۔ سب سے بڑی ذمہ داری آپ کے کندھوں پر آن پڑی ہے۔ اگر آپ نے اس ذمہ داری کو نبھایا تو بھٹو خاندان کے عروج کا سورج نصف النہار پر چمکتا رہے گا۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ اگر بلاول قوم کی دائیں آنکھ ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو جونیئر قوم کی بائیں آنکھ اور تمہارا وجود پاکستانی قوم کے ماتھے کا جھومر ہے۔ ہم تینوں میں تفریق نہیں کرتے۔ پاکستانی قوم یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ ایک وہ دن بھی آئے جب تینوں (فاطمہ بھٹو، بلاول بھٹو اور ذوالفقار علی بھٹو جونیئر) ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لاہور شہر میں ایک جلسہ سے خطاب کریں۔ اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں سچ سچ کہتا ہوں۔ چشم

فلک نے اس سے بڑھ کر جلسہ نہیں دیکھا ہوگا۔ 18 اکتوبر کا کراچی کا استقبالیہ جم غفیر اس کے سامنے ماند ہو جائے گا۔ اس دن ہر پاکستانی کی زبان پر نعرہ ہوگا "آج بھی بھٹو زندہ ہے کل بھی بھٹو زندہ تھا۔"

اے فاطمہ بھٹو آپ پر ذمہ داری ہے کہ کس طرح تمام خاندان کو اتحاد کی لڑی میں منسلک کرتی ہو۔

♥.....♥.....♥

پیپلز پارٹی کے سرکردہ راہنماؤں کی خدمت میں

پیپلز پارٹی کو ایک سلک میں منسلک رکھنے والی مقناطیسی قوت (بے نظیر صاحبہ) کو سیاسی افق سے صرف دو وجوہ کی بناء پر الگ کیا گیا ہے۔
1۔ وفاق کو کمزور کرنا۔ 2۔ پیپلز پارٹی کو ختم کرنا۔ ایگزیکٹو کونسل نے بے نظیر کی تجہیز و تدفین کے بعد سر دست بے نظیر صاحبہ کی وصیت کے مطابق انتشار پر قابو پالیا ہے۔ ایک کافی عرصہ بلاول بھٹو زرداری عملی سیاست سے دور رہے گا اور ان کی جگہ ان کے والد آصف علی زرداری نے پیپلز پارٹی کے چلانے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی ہے۔ گو وہ قید و بند کی بھٹی سے نکل کر کندن بن چکے ہیں۔ پاکستانی سیاست کے اسرار و رموز سے بھی واقف ہیں لیکن یہ بات تسلیم کر لینی چاہیے کہ وہ بے نظیر صاحبہ کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔

پیپلز پارٹی کے دشمن تعاقب میں ہیں۔ اب صرف آصف علی زرداری کی ہی ذمہ داری نہیں بلکہ تمام سرکردہ راہنماؤں کی ذمہ داری ہے کہ وہ پارٹی میں انتشار نہ ہونے دیں اور دشمنوں کے منصوبے کو ناکام بنا دیں۔

دوسری بات یہ بھی یاد رکھیں کہ ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر غیر معمولی ذہانت اور ایک مقناطیسی قوت کے مالک تھے جو پاکستان کے تمام ووٹروں، کارکنوں اور راہنماؤں کو یکجا رکھے ہوئے تھے۔ ان کی موجودگی میں کوئی تنظیمی حلقوں کی ضرورت نہیں تھی۔ جب وہ عوام میں نکلتے تھے لوگ دیوانہ وار ان کی طرف لپکتے تھے۔ ان کی ذات ہی ایک تنظیم تھی۔ اب پارٹی کو تنظیم میں پرونے کی اشد ضرورت ہے۔ اس لیے سرکردہ راہنما الیکشن کے بعد پارٹی کی تنظیم کی طرف توجہ کریں۔ جہاں تک اس وقت میں انتخابات کے نتائج کے بارے میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ پرویز مشرف کے لیے انتخابات میں دھاندلی لازمی ہے۔ اگر انتخابات صاف شفاف ہوں تو ق لیگ بمشکل تمام پاکستان میں سے 20 یا 25 نشستوں سے زیادہ نشستیں حاصل نہیں کر سکتی۔ اس کا صفایا ہو چکا ہے۔ پاکستان اور تمام دنیا کے مبصرین کی یہی رائے ہے اگر صاف شفاف انتخابات ہوں۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) 2 تہائی اکثریت لے جاتی ہیں تو پرویز مشرف ایک نہ ٹوٹنے والے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اس رہائی کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے گا کہ پیپلز پارٹی کو اتنی اکثریت دی جائے گی کہ دوسری پارٹیوں کے ساتھ ایک معلق حکومت تشکیل دے سکے اور دنیا کو یہ باور کرایا جائے گا کہ الیکشن صاف شفاف ہوئے ہیں۔ حالانکہ یہ الیکشن ایک مجوزہ منصوبہ کے تحت کرائے گئے ہیں۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے پیپلز پارٹی کیا منصوبہ بناتی ہے اور کون سا راستہ اختیار کرتی ہے 58/2/B کی تلوار پرویز مشرف کے ہاتھ میں ہے۔ دوم ترامیم کے ذریعے آئین کا حلیہ بگاڑا جا چکا ہے۔

ایسے موقعہ پر پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کی سیاسی ذہانت کا امتحان ہوگا وہ کون سا راستہ اختیار کرتی ہے۔

میرے خیال میں صدر پرویز مشرف صاحب مسلم لیگ (ق) کو انتخابات میں اکثریتی پارٹی بنا کر کوئی خطرہ مول نہیں لیں گے اور اتنی تصریح دھاندلی ہضم نہیں کر سکیں گے۔

دھاندلی تو طے شدہ بات ہے بلکہ دھاندلی کا آغاز تو اس وقت شروع ہو گیا تھا جب 3 نومبر کو ایمرجنسی لگا کر 60 ججز کو رخصت کر دیا گیا تھا۔ بعد ازاں اپنی پسند کا انتخابی ڈھانچہ تشکیل دیا اور اپنی پسند کی عبوری گورنمنٹ بنائی تھی۔ ناظموں کی فوج ق لیگ کے نمائندوں کی سرکاری سطح پر کمپین جاری رکھے ہوئے ہے اور صدر صاحب کہتے ہیں میں کیا کر سکتا ہوں۔

♥.....♥.....♥

﴿ختم شد﴾